شہرِ بے مثال

بانو قدسیہ

مکتبہ اُردو پوسٹ بکس ۹۵۴ لاہور

ناشر:۔ چودھری محمد اکبر
اہتمام:۔ محمد ذیشان
تعداد : ۱۰۰۰
بار اوّل :۔ جولائی ۱۹۷۹ء
قیمت :۔ ۲۴/ روپے

مکتبہ اردو ـــــ لاہور

سیّد تلقین شاہ کے نام!

پہلا دور
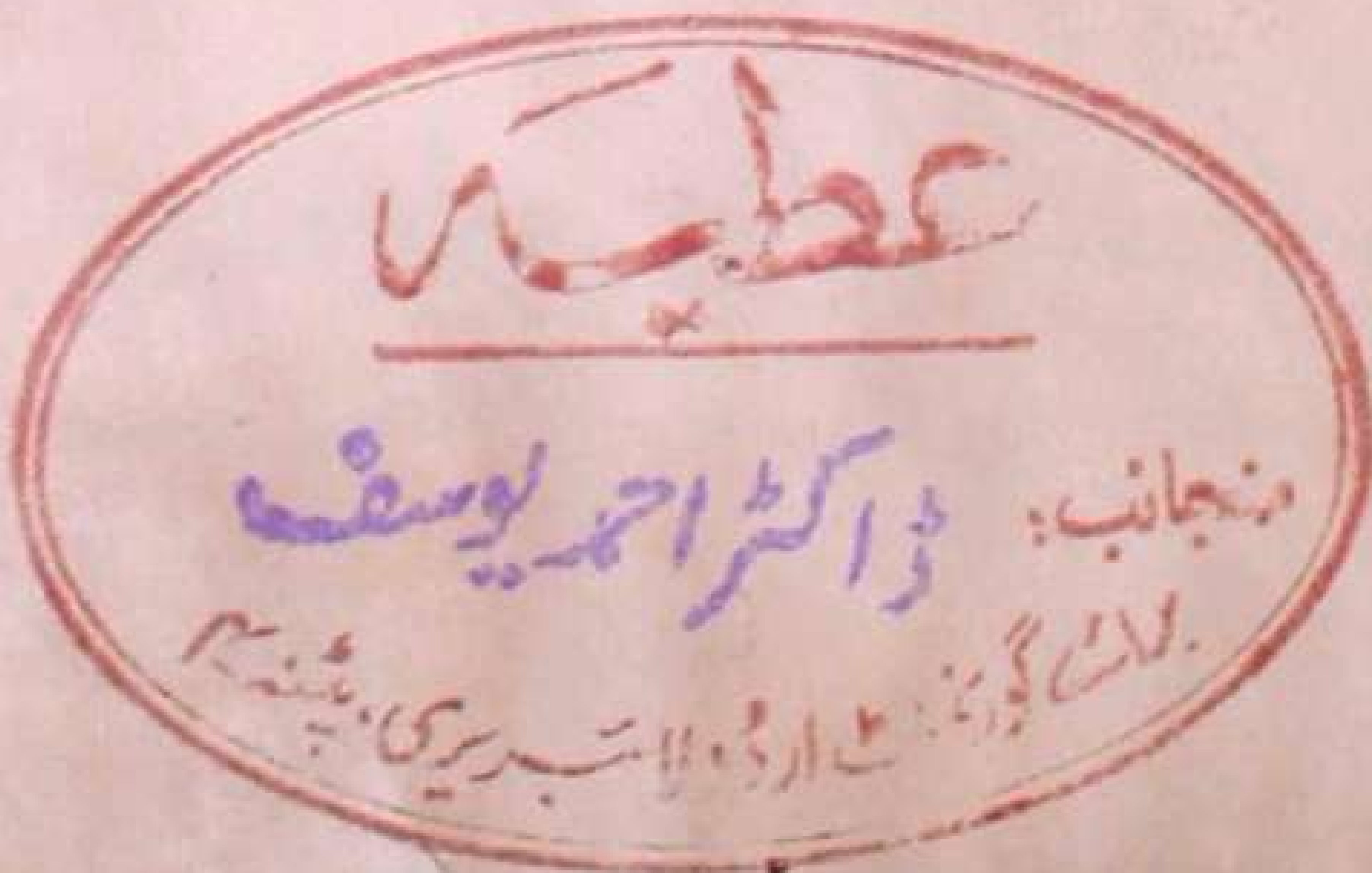
گاڑی پورے تین گھنٹے لیٹ تھی۔

بہاولپور سے لاہور تک وقت اِس قدر لمبا ہو جائے گا۔ اس کا رشیدہ کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جیٹ طیاروں کے عہد میں یہ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ لیکن اس سفر میں رشو جان کو کچھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے افریقہ کے جنگلوں سے پکڑ کر کوئی اسے لاس اینجلز کے ہالی وڈ میں گھسیٹ لایا ہے۔

جس وقت گاڑی پلیٹ فارم پر رکی اور رشیدہ نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا، لاہور کی پہلی جھلک شیر کی گرج بن کر خیر مقدم کو آئی۔ ادھر بہاولپور میں چھوٹے سے سٹیشن پر نہ کوئی لاؤڈ سپیکر تھے نہ ہی ان میں سے نسوانی آوازیں پھوٹ پھوٹ کر ٹرینوں کی آمد و رفت کا پتہ دیتی تھیں۔

رشو جان نے جلدی سے اپنا پرس سنبھالا اور جی میں سوچا کہ کیوں نہ ابھی ٹکٹ خرید کر واپس چلی

جاؤں ۔ امی بھی خوش ہو جائیں گی اور اس بحر ذخار میں اپنی بے پتوار کشتی چھوڑنے سے بھی بچ جاؤں گی
وہ شاید اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا لیتی ۔ لیکن اسی وقت ساتھ والی سیٹ سے آواز آئی ۔
"کیوں بی اس طرح کھڑی رہو گی تو پنڈی جا کر سامان اترے گا ۔ ۔"
یہ خاتون کراچی سے آ رہی تھیں اور رشیدہ بہاولپور سے ان کی ہم سفر بنی تھی ۔ لیکن ابھی
خیبر میل لودھراں تک نہ پہنچی تھی کہ وہ سامنے والی سیٹ سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھیں ۔ ان کے
بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے نٹ بولٹ علیحدہ علیحدہ کر کے سائیکل مستری کے کھوکھے میں پڑی ہو ۔
ہر چیز ڈھیلی تھی ۔ ہر چیز غیر متعلقہ ۔
"اچھا پہلی بار لاہور جا رہی ہو تم ؟" پورے صوفے کی جگہ لیتے ہوئے انہوں نے پوچھا ۔
"جی ۔"
"کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا ؟"
"رشیدہ ۔ ۔ ۔ رشیدہ میر ۔"
"ذرا تکیہ پکڑانا اپنا ۔ میری تو کمر ٹوٹ گئی بیٹھے بیٹھے ۔ شکریہ ۔ لاہور میں کس کے پاس رہو گی ۔
والدین ہوں گے وہاں ۔"
"جی نہیں ۔" رشیدہ پیروں کو ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے بولی ۔
"پھر ؟ ۔ ۔ پھر کس کے پاس رہو گی وہاں ؟"
"میری خالہ ہیں جی وہاں ۔ ۔"
"اچھا ۔ ۔ کیا کام کرتے ہیں تمہارے خالو ؟"

"اینٹی کرپشن میں ہیں جی۔"

اب اس خاتون کے کان چونکیلے جانور کی طرح متوجہ ہوئے۔

"میرا بیٹا واپڈا میں انجنیئر ہے۔ میں ہی کے پاس جا رہی ہوں۔ اچھا طرح بیٹھو۔ سمٹی کیوں جا رہی ہو؟"

یہ جملہ بولتے ہی انہوں نے اپنی ٹانگیں اور پسار دیں۔

اسلم گاڑی ملتان تک نہ پہنچی تھی کہ واپڈا کے انجنیئر کی والدہ نے رشیدہ سے اس کے تمام کوائف معلوم کر لیے۔ باوجودیکہ کئی بار رشو نے اپنے آپ کو رسالے میں چھپانے کی کوشش کی لیکن کسی بڑے باتونی خلیفے کی طرح وہ ہر بار اسے باتوں میں لگا لیتیں۔ رشیدہ کے متعلق ان کی تمام معلومات مکمل ہو چکی تھیں۔ اب اگر وہ چاہتیں تو بغیر رشو سے پوچھے اس کے پاسپورٹ کی عرضی بمع سی آئی ڈی رپورٹ کے داخ سکتی تھیں۔

"سائیکلوجی کا ایم اے کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"فی الحال تو کوئی ارادہ نہیں جی۔ ابھی تو دو سال ایم اے کرتے ہی لگیں گے۔"

"کہیں منگنی ونگنی ہوئی ہے تمہاری؟"

پتہ نہیں حلق کے اندر رشو کے ریگمال لگا ہوا تھا کہ آواز گھستی رگڑ کھاتی نکلی۔

"جی نہیں"

والدۂ انجنیئر نے ابرو اٹھائے۔ تیزی سے دوڑتے درختوں کے ساتھ ساتھ بھاگتے بجلی کے کھمبوں پر رشو نے نظر ڈالی۔ اور سوچنے لگی۔ بالکل اسی طرح تیزی سے زندگی کے اٹھارہ سال گذر گئے۔ اکنومکس اور سائیکلوجی کے ساتھ بی اے بھی ہو گیا۔ لیکن پچھلے دو سال جب

وہ گھر بیٹھ کر اپنے ہونے والے دولہا کا انتظار کرنے لگی تو وقت اس طرح گذرنے لگا جیسے ریت میں دھنسے ہوئے پہیے۔ امی روز اسے تسلی دینے کے لئے اونچی آواز میں اپنے آپ سے کہا کرتی تھیں۔

"رشو جان کا رشتہ ہمیں یہاں بیٹھے بٹھائے آ ملے گا۔ شادی تو نصیب سے ہوتی ہے جہاں لکھی ہوتی ہے وہیں ہوتی ہے۔ دولہا سات سمندر پار سے آئے چاہے ساتھ والے گاؤں سے ... آپ ہی آپ آجاتا ہے ... پچھمی ہواؤں کی طرح ..."

پورے دو سال اس آپ ہی آپ آنے والے دولہا کے انتظار میں رشو جان نے کاٹ دیئے۔ کسی سے جوان بیٹی کے رشتے کے لئے کچھ کہتے امی کا حلق بند ہوتا تھا۔ ادھر رشیدہ گھر کی صفائیاں کر کر کے تھک چکی تھی۔ ہر صبح بستر بچھاتے۔ گلدانوں میں پھول سجاتے، دریاں جھاڑتے، تخت پوش کے گاؤ تکیے ٹھکانے سے لگاتے ہوئے اس کے دل میں آنے والے دولہا کے قدموں کی چاپ اٹھتی۔ دل ایک نجانے اضطراب سے کانپتا، ہر نئی آواز، ہر نئی دستک پر امید کی لو ابھرتی، اور دل میں ایک نجانی سی خوشی بھل بھل کر کے بھر جاتی۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں شام آجاتی۔ امی مغرب کی نماز کے لئے چٹائی بچھا بیٹھتیں اور ساتھ والے گھر سے یکدم چڑیوں کے جھنڈ شب بخیر، شب بخیر کہتے رخصت ہوتے تو وہ کوٹھے پر چڑھ جاتی۔ شہ نشین پر بیٹھ کر وہ دور تک گلی میں دیکھتی رہتی۔ دن بھر کی خوشیوں کا اسقاط ہو جاتا۔ اسکی ہمت کے ٹانکے ٹوٹ جاتے۔ جب نیا چاند آسمان پر نظر آتا تو رشو دعا کے ہاتھ اٹھاتی۔ اس کی پلکوں پر آنسو آجاتے۔ اور وہ آپ ہی آپ آنے والے دولہا سے کہتی۔

"کب تک راہ دکھلاؤ گے؟ ... کب آؤ گے؟ اگر میں تمہیں تلاش کرنے نکلوں تو کیا پتہ پوچھ کر

تمہارا مکان تلاش کروں؟"

جب ہر صبح گھر صاف کرنے اور ہر شام دولہا میاں کی راہ تکتے تکتے رشو جان تھک گئی تو اچانک ایک دن اس نے ایم اے سائیکولوجی میں داخلہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اماں اس بات کے بہت خلاف تھیں۔

"میں تمہیں لاہور نہیں بھیج سکتی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

رشو جان نے کاجی ہابا کر چلا کر پوچھا۔ "یہ بتایئے آپ سے کیا ہوگا؟ ... کیا آپ مجھے وہ کائی سمجھتی ہیں جو متعفن تالاب کی سطح پر آپی آپ سڑ جاتی ہے؟ میں یوں کاہل مجھول ہو کر نہیں بیٹھ سکتی۔ میں بھنبھیری ہوں لیکن جاندار ہوں۔ پر رکھتی ہوں۔ مجھ سے یہ کولھو کے بیل کی سی زندگی بسر نہ ہوگی۔"

پہلے تو رشو جان نے دبی دبی زبان میں اپنی تمنا ظاہر کی، پھر ایک دن پاکستان ٹائمز میں داخلے کا اشتہار پڑھ کر ایک درخواست چوری سے داغ دی۔ جب تک ادھر سے جواب آیا۔ رشو جان نے مہارانی لکشمی کی طرح اٹواٹی کھٹواٹی لے کر بہت کچھ ماں کو رام کر لیا تھا۔ لیکن یونیورسٹی سے جب جواب آیا تو رشیدہ کی حالت غیر ہو گئی۔ انٹرویو کے لئے بھی اسے نہ بلایا گیا تھا۔ صرف اتنی سی امید دلائی گئی تھی کہ اگر طلبہ میں سے کوئی گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد نہ پہنچا تو اسے اطلاع دے دی جائے گی۔ رو رو کر رشو نے آنکھیں لال بھبوکا کر لیں۔ رشو تو شاید ابھی بہت دیر تک سماوار کی طرح اندر ہی اندر کھولتی رہتی۔ لیکن اچانک ایک دن سرکاری خاکی لفافہ آ گیا۔ ایک طالبہ سائیکولوجی کے ایم اے میں داخلہ لینے کے بعد حاضری دینے نہ پہنچی تھی۔ سیٹ خالی تھی۔ رشو نے اماں کو بتائے بغیر سارا سامان باندھا۔ اندر ہی اندر ٹرین گام کے اوقات بھی معلوم کر لئے۔ مشکل یہ تھی کہ لاہور پہنچ کر رہے گی کہاں؟

امّی نے اجازت دینے میں کچھ حیل و حجّت ضرور کی۔ لیکن بالآخر وہ یہ سوچ کر جان گئیں کہ شاید ابھی آنے والے دولہا کا وقت معیّن نہیں ہوا، کیوں جوان لڑکی بیکار بیٹھی رہے ؟۔ رشیدہ کو بھیجنے میں جو عذرِ ضعیف تھا وہ یہی تھا کہ رشو وہاں جاکر رہے گی کہاں ؟

"امّی میں کسی ہوسٹل میں رہ لونگی ؟"

"توبہ، توبہ ۔ ۔ ۔ ہوسٹل کی لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں "

ہوسٹل کا نمبر کٹ گیا تو اب ان رشتہ داروں کی فہرست بننے لگی جو لاہور میں رہتے تھے۔ چچا وارث سے لیکر خالہ فیروزہ تک سب کے گھروں کی تفسیر کی گئی۔ بدقسمتی سے رشو کے چھوٹے سے کنبے کا رشتہ باقی برادری سے کبھی کا کٹ چکا تھا۔ شادی بیاہ میں کارڈ وغیرہ ضرور آجاتے تھے لیکن نہ ادھر سے جانے کی استطاعت تھی نہ ادھر سے کبھی اصرار ہی ہوا تھا۔ جب سے رشو نے ہوش سنبھالا تھا، لاہور والے رشتہ دار نہایت دور، بے حد پُر اسرار اور بہت ہی مختارِ کل تھے۔ ان کی جو بھی خبر بہاولپور پہنچتی سنہری حروف میں لکھوا کر فریم کر کے دلوں میں ٹکائی جاتی۔ لاہور والے ہر طرح سے ارفع و اعلیٰ تھے۔ رشیدہ کا ننھا سا کنبہ کسی طرح بھی ان کی ریس نہ کر سکتا تھا۔ اگر کوئی لاہور سے کبھی آٹپکتا، تو اس کے لیے مرغی پلاؤ، قورمہ، کوفتے انگلی انگلی گھی میں تیرتے پکائے جاتے۔ امّی کے جہیز کی پلش کی رضائیاں نکلتیں۔ کڑھی ہوئی چادریں بچھائی جاتیں۔ گھر میں سے اگربتیوں کی خوشبو آتی۔ اور پہلی ہی شام مہمان کو نواب صاحب کا محل دکھانے کا پروگرام بنتا۔ سب سے زیادہ تردد امّی نے خالہ فیروزہ کے دورانِ قیام میں کیا تھا۔ اسی مہمان نوازی کے بھرتے انہوں نے رشو کے قیام کے لئے ان ہی کا انتخاب کیا۔

"کیا بات ہے باہر کیا دیکھ رہی ہو۔" انجینئر کی والدہ نے اسے غیر حاضر پا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں جی۔ ایسے ہی۔"

انجینئر کی والدہ نے دانتوں میں خلال پھیرتے ہوئے کہا۔

"میری بڑی بچی کی شادی سولہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔ منسٹر کا لڑکا ہے میرا داماد۔ شادی چھوٹی عمر میں ہونی چاہیے۔"

"جی!"

"کوئی سٹیشن پر لینے آئے گا نہیں؟"

"جی خالہ کو تار دیا ہوا ہے۔۔"

"اچھا اچھا۔"

سامان اتروا کر جب رشیدہ باہر پلیٹ فارم پر پہنچی تو اسے پختہ یقین ہو گیا کہ خالہ کے گھر سے جو بھی اسے لینے آیا ہو گا تین گھنٹے کی صبر آزما مدت گزار کر جا چکا ہو گا۔

"کدھر لگے ہو۔" قلی نے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

"ٹیکسی منگواؤں بی بی جی۔"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔"

باہر لمبے برآمدے میں پہنچ کر وہ پہلے سے زیادہ متذبذب ہو گئی۔

ایک رکشا والا رفتار کم کر کے اس کے پاس سے گذر گیا۔ لیکن وہ ابھی تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ ملتان روڈ کس طرف ہے اور وہ اکیلی وہاں کیسے پہنچ پائے گی۔

گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہو جانے کے باعث اندھیرا بہت گہرا ہو چکا تھا۔ اور ایک اجنبی شہر کے اجنبی اندھیرے سے وہ بہت خوفزدہ ہو رہی تھی۔

قلی کو پیسے دیکر رخصت کر چکنے کے بعد وہ اور مخمصے میں پھنس گئی۔ اب اگر خالہ کے گھر سے کوئی آیا بھی ہے تو اسے تلاش کرنے کہاں جاؤں؟ سامان کس کے حوالے چھوڑ کر جاؤں؟ قریب ہی وہ نوجوان کھڑے بظاہر جمائیاں لے رہے تھے لیکن ان کی نظریں بار بار ادھر کا طواف کرتی تھیں۔ مارے خوف کے رشیدہ کے ہاتھوں میں ہلکا ہلکا پسینہ آنے لگا۔

انجینیر کی والدہ نے جب پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ بندریا کی طرح اچھلی "ارے ڈر گئیں۔ ۔ ۔ میرا بیٹا بھی نہیں آیا مجھے لینے۔ ۔ تمہاری خالہ بھی نہیں پہنچیں۔ ۔ ۔"

"جی ہاں۔ ۔"

"ساری بدبختی اس لیٹ گاڑی کی وجہ سے ہے۔ چلو ٹیکسی لے لیں۔ مجھے سمن آباد جانا ہے۔"

جی؟"

"تم رستے میں ملتان روڈ اتر جانا۔ ایک ہی تو راستہ ہے۔ میں ملتان روڈ کی طرف سے چلی جاؤں گی سمن آباد۔"

"جی ہاں! ایک ہی راستہ ہے۔ میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔"

رشیدہ کے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ انجینیر صاحب کی والدہ کے ساتھ ٹیکسی میں

سوار ہو گئی۔ ایک اجنبی عورت کے ساتھ بند ٹیکسی میں رات کے وقت سفر کرنا بذات خود رشو کے لئے ایک عجیب سی بات تھی۔ پھر وہ خاتون شکل و صورت ۔ سے انجنیئر کی والدہ نہیں بلکہ بڑھی نائیکہ لگتی تھی۔ رشیدہ کھسکتی کھسکتی بالکل دروازے کے قریب جا لگی۔ نائیکہ صورت عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"بیٹی یوں لگتا ہے جیسے تم پہلی بار لاہور آئی ہو۔"

دکھ اور خوف اس کے حلق میں برسات کے مینڈک کی طرح گلپھڑے پھلاتے بیٹھے تھے۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں سر ہلایا اور اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ لیکن ہاتھ پر اجنبی عورت کی گرفت نرالا دی تھی۔

"میں بھی بڑی چھوٹی عمر میں یہاں آئی تھی۔ پانچویں تک تعلیم تھی میری ۔ سمجھ کر تو ساری تعلیم اسی شہر نے دی۔ یہ میکلوڈ روڈ ہے۔ دیکھ لو۔ سارے سینما یہیں ہیں تقریباً۔"

رشیدہ نے آنکھیں باہر کو پھیر لیں۔ ٹیکسی فراٹے بھرتی رواں تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ یوں طرح سامنے والا شیشہ فٹ کر رکھا تھا کہ اگر رشو نظر اٹھا کر سامنے دیکھتی تو ڈرائیور کی نظریں اس کے آر پار ہو جاتیں۔

سینما گھروں کے سامنے ابھی رش کم تھا۔ لیکن بتیوں کی جگمگاہٹ اور بڑے بڑے سائن بورڈوں کی روشنی آنکھیں چندھیا رہی تھی۔ صبیحہ، نیلو، بہار، شیریں کی بڑی بڑی شبیہیں خوبصورت جادوگرنیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

فلمی سائن بورڈ پر بنائی ہوئی تصویریں ایک سی تھیں۔ ایکٹرسوں کے بھرے بھرے سرخ

ہونٹ، گالوں تک آیا ہوا ایک آدھ آنسو، قوالی کے انداز میں اٹھے ہوئے ہاتھ، ٹھہر و رک جاؤ پکارتا ہوا ہیرو، جھروکے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں، مغلئی محراب میں چوڑی دار پائجامہ، اور پشواز پہنے گود میں دودھ پیتا بچہ لئے، کسی کے گناہ کو چھپائے قربانی کی دیوی، بوڑھی ایکٹرسوں کی شبیہیں جو اب ماں بننے پر مجبور تھیں۔ نوجوان ہیروئین کے تھل تھل جسم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مشکیں لاد کر آگ بجھانے جا رہے ہیں۔ ولین جس کی آنکھ پر چمڑے کی اندھیاری تھی۔ جو ہالی وڈ کی ویسٹرن فلموں کی طرح چمڑے کی جیکٹ، جینز، اور دکھو کے لگی بیلٹ پہنے تھے۔۔۔

یہ سارے سائن بورڈ رنگ و نور کا گلال بکھیرے اسے بلا رہے تھے۔ سارے لاہور کا گلیمر اس کے استقبال کے لئے بڑھا آ رہا تھا۔

"کونسا نمبر بنایا تھا تم نے؟" فولادی شکنجے نے اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔

درشو نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چٹ انہیں تھما دی۔

روکو! بھئی، ٹیکسی روکو۔۔۔"

اور ٹیکسی جیسے چیخ مار کر رک گئی۔

ٹیکسی کے دو روپے چالیس پیسے ادا کر کے جب وہ پھاٹک تک پہنچی تو اس کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔

. . . .

آج اتوار تھا۔۔

درانتی کو خالہ سے سلام دعا کی بو بھی ہوئی تھی۔ گھر والے کھانا کھا پی کر بستروں میں

جا چکے تھے۔ رشیدہ سے نثار نے تین چار جملوں میں بہاولپور والوں کی خیریت پوچھی اور پھر انور ہی کے ساتھ اسے بھیج دیا۔

رشیدہ کو جو کمرہ تفویض کیا گیا تھا وہ باکس روم سے ملحق تھا۔ سامنے گیلری تھی۔ اور جب بھی دروازہ کھلا ہوتا تو سامنے غسل کا دریچہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ پچھلی کھڑکی کے کھلنے پر آنگن، باورچی خانہ، مرغیوں کا ڈربہ، نوکروں کے کمرے، اور اناج کی کوٹھڑی نظر آتی تھی۔

اتوار ہونے کے باوجود رشو کی آنکھ بہت صبح کھل گئی تھی۔ اس نے جب کمرے کا دروازہ کھولا تو سارے گھر پر نیند کا غلبہ تھا حتیٰ کہ باورچی خانے میں بھی کسی قسم کا کھٹ کا ڈر کا نہ تھا۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد اس نے اپنے کمرے کا پھر جائزہ لیا۔ دیوار گیروں پر گرد سے اٹے ہوئے بھاری برتن، ساگوان کی لکڑی سے بنی ہوئی الماری، ایک کرسی، اور ایک چارپائی جس پر وہ رات سوئی تھی۔ رشیدہ کو اپنی بے مائگی اور بے سرو سامانی پر ترس آگیا۔ اپنے سامان میں سے اس نے آہستہ سے کاپی نکالی اور امی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

پیاری امی جان :

السلام علیکم۔

میں بخیر و عافیت ہوں اور خالہ فیروزہ کے گھر پہنچ گئی ہوں۔ رات کو چونکہ ٹرین تین گھنٹے لیٹ تھی۔ اس لئے خالہ فیروزہ پلیٹ فارم پر دو گھنٹے راہ دیکھ کر گھر لوٹ گئیں۔ زبیدہ بیگم اس نے ماں کی تشفی کے لئے رقم کیا تھا، لیکن میری ایک ہم سفر خاتون مجھے گھر پہنچا گئیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ رات چونکہ دیر ہو گئی تھی اس لئے خالہ سے تفصیلی باتیں نہیں ہو سکیں۔

میرا کمرہ علیحدہ ہے۔ مجھے پڑھائی کرنے میں آسانی رہے گی۔ خالہ نے اسے بہت آراستہ کر رکھا ہے۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔

ہمیشہ آپ کی تابعدار

"رشّو"

نوٹ :- زری، خالد، اور راشدہ کو پیار! طاہرہ باجی نے میری قمیض بھجوائی تھی کہ نہیں؟

یہ خط رقم کرنے کے بعد جب اس نے آنگن میں نظر کی تو ستمبر کی دھوپ صبح کو جگانے آنگن میں آ گئی تھی۔ رمضان کیتلی میں پانی بھر کر باورچی خانے کی طرف جا رہا تھا۔ انوری البتہ نئی صبح عجیب سے کام میں مشغول تھی۔ وہ مرغیوں کے ڈربے کے پاس بیٹھی چھاج سے گیہوں پھٹک رہی تھی۔ . . اتنی صبح گیہوں پھٹکنے کی وجہ رشو کو سمجھ نہ آئی۔ لیکن وہ کھڑکی میں کھڑے انوری کو دیکھنے لگی۔

انوری نوکرانی تھی، لیکن کچی عمر کا پٹاخہ! سرکس کے جوکر جیسی ہنسی! جسم آڑو کے شگوفوں کی طرح بھرا بھرا، اور لچکیلا۔ ہر بار جب وہ رولن کو ایک طرف پھٹک کر اتارتی تو اس کے گندم گوں بازو صندل کے سیرو لگتے، انوری کی نگاہیں بار بار آنگن میں رہ رہ کر نکلتیں، جیسے یہ بھانپ رہی ہوں کہ گھر میں کون کون جاگا ہے۔

رمضان نے کیتلی کو نیل کے چولہے پر چڑھا کر، پھر کھری چارپائی پر آ لیٹا تھا۔ اور بازو کو آنکھوں پر رکھے پڑا تھا۔

انوری نے جب خوب تسلی کر لی کہ ابھی کوٹھی والے محو خواب ہیں اور شاگرد پیشہ

میں سے کوئی بھی موجود نہیں تو اس نے یکبارگی گردن اٹھا، پنجوں کے بل اچک کر کوٹھی کی جانب لمبی سی نگاہ ڈالی۔ پھر وہ دبے پاؤں گھڑوں تک پہنچی، چینی پر تھوڑا سا پانی چھلکایا اور اس مدھ کے پیالے کو لئے راجہ اندر کی طرح رمضان کی چارپائی کے پاس پہنچی۔

جانے یہ نیند تھی کہ وہ بھی آنکھیں موندے جھری سے انوری کو تک رہا تھا۔ پر چتون سے ظاہر ہوتا تھا جیسے گہری نیند سو رہا ہے۔

اس چھڑ چھاتیے نے انوری کی آمد پر تولہ بھر جنبش نہ کی، ادھر پر تولتی بلبل نے چینی کا پانی اس پر یوں اچھالا، جیسے مہذب محفل میں نکاح کے چھوہارے، پانی کا پڑنا تھا کہ رمضان گلرستے کی طرح اٹھ بیٹھا۔ ادھر انوری کھلکھل قہقہہ مارتی زنانہ بھرتی، چوٹی کا سپنولیا لہراتی، ایسی بھاگی کہ بیچارہ رمضان الوؤں کی طرح منہ تکتا رہ گیا۔

جب تنویر باجی آپا جی کے لئے بیڈ ٹی لینے آئیں تو بڑی نمازی بلکل مارے انوری گندم پھٹک رہی تھی اور رمضان تر ابز اخفش بنا پاس کھڑا تھا۔

تنویر باجی کو دیکھتے ہی انوری چلائی۔

"باجی جی! دیکھ لو جی . . کب سے کہہ رہی ہوں اسے چائے بنانے کو، صاحب کے لئے بیڈ ٹی کو دیر ہو جائے گی، اسے پرواہی نہیں . . کھڑا جماہیاں لے رہا ہے۔ بیگم صاحبہ سے کہئے اسے سیکنڈ شو نہ دیکھنے دیا کریں۔"

"پانی تو کبھی کا دھرا ہے چولہے پر . ." رمضان جاتے ہوئے بولا۔

"چولہے پر دھرنے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ چائے بن جائے گی۔ ہاں!" انوری تنک کر

بولی: "مجھے تو بیگم صاحب نے کہا تھا کہ صبح نو بجے سے پہلے آدھی بوری گندم کی صاف کر لینا۔
میں تو منہ اندھیرے سے لگی ہوں۔ دیکھ لو۔"

تنویر باجی بیڈ شیٹ کے متعلق ہدایات دے کر واپس چلی گئیں۔ اور انور، رمضان کی طرف
دیکھ کر سرکس کے جوکر کی طرح ہنسنے لگی۔

درخشاں کچھ بھولنے میں تو پیچھے نہ تھی کہ شہزادہ گلفام کی طرح چودہ برس کی نیکی بدی کا علم
نہ ہو سکتا۔ بی اے تک تعلیم تھی، سائیکولوجی جیسا مضمون پڑھا تھا۔ باتیں تو سبھی معلوم تھیں۔
لیکن باتیں معلوم ہونے کا یہ مطلب نہ تھا کہ ان پر ایمان بھی آ گیا تھا۔ تھیوری اور تجربے میں جو
فرق ہے وہی رشتوں کی تعلیم اور سادہ زندگی میں نمایاں تھا۔ علم کے جو پشتارے وہ نوجوان ذہن
پر لادے پھرتی تھی بہاولپور میں تو ان کے بدلنے کی کوئی وجہ موجود تھی۔ نہ ان پر ایمان لانے
کی کوئی دلیل۔ لاہور کیا پہنچی کہ دل میں بغاوت پڑ گئی۔ یقیناً توڑ کر جیسے کسی نے علم کی ساری کوٹھڑیاں
ہی مسمار کر دی۔

فاختہ کے دل کی طرح دھڑکتی، کھڑکی میں کھڑی وہ بار بار سوچ رہی تھی، اتّم کے متعلق
زری، خالد، اور راشدہ کے متعلق، لیکن ان میں سے کوئی بھی تو اس کی تسلی کا اہل نہ تھا۔
سب گھر میں اٹھ گئے ہوں گے۔ چھتری سے چلنے والے نلکے کے سامنے سب نے وضو کیا ہوگا۔
زری چھوٹے چھوٹے گیندے پیرے بانا، پیٹھی کبھی راشدہ کبھی امّی کا منہ تکتی ہوگی۔ لیکن اب
تو سورج نکل آیا ہے۔۔۔ وہ لوگ تو کبھی کے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے ہوں گے۔
خالد پلاسٹک کا بیگ لے کر، ابا جی کی سائیکل پر سبزی گوشت لینے گیا ہوگا۔ اس کے پیر سائیکل

کے پیڈلوں پر ابھی اچھی طرح جمے نہیں رہتے۔ جب گولائی میں پیڈل نیچے چلے جاتے ہیں تو اس
کے پنجے ہتھیلیوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔ پھر وہ زور لگا کر جیسے پنجہ مارتے ہوئے پیڈلوں کو پیروں کے
قبضہ میں لاتا ہے۔

اور جو کسی دن خالد بازار سے نہ لوٹا اور اس کے پاؤں پیڈل تک نہ پہنچ سکے۔ اور کوئی
ٹرک اینٹوں سے لدا سامنے سے آ گیا تو......! ایسا ٹرک جس کے ماتھے
پر "اللہ نگہبان" لکھا ہوتا ہے تو کیا ہوگا؟... اگر کسی ایسے ٹرک کے سامنے آ کر خالد
کو پیڈل نہ ملے تو؟ رشّو نے سر جھٹکا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

انوری نے پھر چھاج پکڑ لیا تھا۔ اور رحمتی روکتی گندم پھٹکنے لگی تھی۔

رمضان نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ بیسوں والا کرتا، چاندی کے بٹن، اور
ریشمی رومال: یہ سب کچھ اپنے بیاہ سنجوگ کے لیے تھوڑا تھا۔ اتنے چھیلا بننے کی وجہ فقط
ایک ہی تھی کہ ان کپڑوں کی سائی دے کر وہ چوکڑی بھرتی ہرنی کو زیرِ دام لانا چاہتا تھا۔

جب چینی سے پانی اس پہ گرا تو جیسے ساری اجڑی تنخواہ وصول ہو گئی۔

تنویر باجی یونہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ اس نے لوٹا بھر پانی بھرا اور کھلے دروازے
کی اوٹ میں باورچی خانے کے پاس جا کھڑا ہوا۔

اندر پانی سوں سوں کر رہا تھا۔ انوری نے بڑی اتراہٹ سے بغیر پیچھے دیکھ کر کہا۔

"پانی پکنے لگا ہے رمضان!"

رمضان خاموش گھات میں بیٹھا تھا۔ جب انوری نے محسوس کیا کہ باورچی خانے

میں کوئی موجود نہیں اور پانی جوش کھا چکا ہے تو وہ چھاج کو گندم کے ڈھیر پر اچھال کر خوب اترائی باورچی خانے کی طرف چلی۔

ابھی اسے اندر گھسے دو منٹ ہوتے تھے کہ رمضان خالی لوٹا ہاتھ میں لئے لپکتا ہوا باہر نکلا اور بیت الخلا کی طرف چلدیا۔

جب رمضان کا بدلہ اتار نے انوری بالٹی بھر پانی لئے باہر نکلی تو سامنے سے خالہ فیروزہ کمر پر لگی ہوئی زپ بند کرتی آ رہی تھیں۔

"کیوں بھئی چائے تیار نہیں ہوئی ابھی؟"

"بس جی پانی کھولنے والا ہے۔ ابھی تیار ہو جاتی ہے۔"

"آغا جی کے لئے بیڈ ٹی لے آنا۔ ۔"

"اچھا۔ بیگم صاحبہ!"

یکدم فیروزہ خالہ کی نظر انوری کے گیلے کپڑوں پر جو گئی تو وہ جھٹ سے بولیں۔

"ارے انوری یہ کپڑے کیسے گیلے ہو گئے تمہارے؟"

انوری نے اپنے چپکے ہوئے کپڑوں پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"خدا قسم بیگم صاحب! آپ اس موئے رمضان کو کچھ نہیں کہتیں۔ سارے گھڑوں پر اتنی کیچ جمی ہے۔ میں یہ بالٹی پانی کی بھرنے لگی تو سارا گھڑا اچھل آیا مجھ پر۔ ۔"

"تم گھڑے صاف کر لیا کرو۔ انوری۔ ۔ ۔" بیگم صاحبہ نے حکم دیا۔

"اچھا جی۔ میں ہی صاف کر لیا کروں گی۔ اس بدبخت کے تو ہاتھ ٹوٹتے ہیں کام کرتے۔"

فیاروز! خالہ جمائی لیتی، کہنی کھجاتی اندر چلی گئیں۔

انوری نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر باورچی خانے میں غائب ہو گئی

رشو جان پر بجائے اس واقعے کا اس قدر شدید اثر کیوں ہوا؟ کچھ تو ماضی کی زندگی میں ایسے واقعات کم گذرے تھے۔ کچھ صبح کا وقت ایسا تھا کہ اس کے کانوں میں ابھی تک تلاوت کرتی امی کی آواز گونج رہی تھی۔ بے چاری منہ کے بل بستر پر جا لیٹی۔

حجرے میں سوچنے لگی۔ بہاولپور میں کیا معاشقے نہیں ہوتے؟ وہاں کیا لڑکیاں چپڑا لاکھ جیسے سرخ ہونٹ لٹکا کر نہیں چلتیں؟ کیا وہاں مرد اور عورتیں حد فاصل الانگ کر ایک دوسرے کے قریب نہیں جاتے؟ پھر یہاں اگر ایسی بات دیکھتے ہی اس کا دل کیوں پھڑپھڑانے لگا ہے۔

ساری بات تو یہ تھی کہ بڈھے دریا اور بڈیارے نالے کے درمیان جو دنیا آباد تھی سارے شہروں کی خلقت پر مستزاد تھی۔

عام آبادی کی ایک شہرگ ہوتی ہے۔ اس شہر کی شہرگیں بھی دو تھیں۔ ایک جو لہو کی گردش کے لئے مخصوص تھی۔ اور ایک وہ جس میں احساس برتری کا ناگ پھن اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ اس شہر کے لوگوں کو زیادہ عزیز تھی۔ شاید لہو کی گردش بند ہونے پر وہ زندہ رہ سکتے تھے لیکن احساس برتری کے بغیر انہیں پل بھر بھی سانس لینا دشوار ہو جاتا۔

نقل ہے کہ کسی گنجان جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ جنگل کا یہ عالم تھا کہ درخت صف در صف۔ بیلیں الجھی ہوئیں، رشتوں کی طرح پیوستہ، اور جھاڑ سر سے سر جوڑے کھڑے تھے۔ دوپہر کے وقت سورج کی کرنیں اس کچھار تک نہ پہنچ پاتی تھیں جہاں شیر استراحت کیا کرتا تھا

اس شیر دلیر و رستم صفت کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے بڑے جانوروں کا دل ہر لحظہ بوکھلایا رہتا تھا۔ ایک نہ بچہ مرحوم شیرنی کی نشانی موجود تھا کہ شیر اس کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ اور بن ماں کے بچے کی غور و پرداخت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا خیال اسقدر غالب تھا کہ شیر بچہ کو لیکر سارے جنگل کی چھان بین کو نکلا۔ اور بالآخر ریچھ کو اس کی اتالیقی سونپ کر نچنت ہو بیٹھا۔

بندر جیسے جانوروں کے بیچ نزاع کے بیچ چھوڑ کر روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ بھالو کی تقرری اور تقرب کو دیکھ کر از بسکہ جلا۔ شیر کی کچھار کے پاس پھٹکنے کی ہمت نہ تھی۔ اور وہ اسی فکر میں تھا کہ کسی طرح بھالو کی جگہ بنسائی ہو دل کی بھڑاس نکلے۔ اسی ملک میں دن رات پھرتا۔ ڈالی ڈالی پھاندتا۔ ہر جانور کے سامنے گھگیاتا۔ بالآخر ارکان دولت میں سے کسی کو گانٹھ کر شیر کی خدمت میں سرفراز ہوا۔ طریقہ خدمت کا بجا لاتا تھا۔ اور اپنی من موہنی حرکتوں سے دل شیر کا بہلاتا تھا۔ اپنی چاپلوسی اور کفش برداری کے باعث بہت جلد شیر کی صحبت میں ممتاز ہوگیا۔

ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ اے عالی مرتبت جنگل کے شاہ! سلامتی و شادمانی ترے قدم چومے۔ تیری ہیبت سے چرند پرند کانپیں۔ اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔ شیر نے لمبی جمائی لی اور بولا ... پوچھ۔ کیا پوچھتا ہے؟ بندر نے زمین بوسی کے بعد دریافت کیا کہ اے آقائے ولی نعمت یہ بتا کہ تو نے وہ کونسی خوبی ریچھ میں دیکھی کہ شہزادہ والاتبار کی اتالیقی سے اسے نجابت بخشی۔ اور اس تلطف سے پیش آیا کہ اس شہد خور میں نہ حسن ظاہری نہ اعلیٰ نسبی نہ کوئی دوسرا وصف لائق توصیف ہے۔ شاہ نے پھٹر پر پنجہ مار کر کہا کہ درخت پر چڑھنا گر ہمارے

اوصاف میں شامل نہیں۔ لیکن بھالو اس میں خوب خوب مہارت رکھتا ہے۔ سوہم نے اپنے
نورچشم کو اس کے سپرد کیا ہے کہ ہر طرح سے صاحب کمال ہو۔ بندر کچھ دیر پکتا رہا۔ پھر جیبھ
گال میں گول کرتے ہوئے بولا۔ اے شاہ جم جاہ! تیری جوتیوں کے صدقتے۔ درختوں کو پھاندنا
اور تنوں پر چڑھنا اترنا یا تو بندر کو آتا ہے یا گلہری کو . . . اگر یہ ایں خوبی بھالو کو شہزادہ
ذیجاہ کی تربیت کا ضامن کیا ہے تو کچھ اچھا نہیں کیا۔ شیر نے لمبی سی جمائی لی اور مسکرا کر
بولا۔ بوزنے تو کہتا تو ٹھیک ہے۔ لیکن شہزادوں کی تربیت میں نقطہ گر کا فرق ہوتا ہے۔ تجھ
میں اور اتالیق بلند مرتبت میں فقط ایک فرق ہے۔ تو منہ کے بل درخت سے اترتا ہے اور ریچھ
سرین کے بل . . . سارے جنگل کے درندے بھالو کے اس وصف سے ناآشنا ہیں۔ سوہم
نے اسے اسی خوبی کے باعث منتخب کیا۔

لاہور میں بھی بھالو کی سی خوبی تھی۔ ساری دنیا جہاں منہ کے بل اپنے گن اور کرتب کا
اظہار کرتی۔ وہاں لاہور والے منہ میں کوکا کولا کی بوتل لیے سرین کے بل اپنی برتری کا اظہار
کرتے تھے۔

رشو باجی نے بھی بھالو کو دیکھتے ہی زانوئے تلمذ تہ کیا اور پچھلی پڑھی بالائی جی سے بھلا
کر از سر نو مکتب میں داخل ہو گئی۔

جس وقت انوری نے اس کے کمرے پر دستک دی تو گھڑی نو بجا رہی تھی۔ ستمبر کی
دھوپ سارے آنگن پر پھیلی تھی۔ یکدم اس نے حیران ہو کر ارد گرد دیکھا۔ یوں صبح سویرے
سونے کی تو وہ عادی نہ تھی۔ پھر آج کیا ہوا؟ آج اس کی آنکھ کیسے لگ گئی۔

"آپا جی! ناشتہ کر لیں جی . . ." انوری نے پٹ کے ساتھ منہ جوڑ کر آواز دی "سب انتظار کر رہے ہیں"

"آ رہی ہوں - ایک لمحہ میں"

سر کو دوپٹہ سے ڈھانپتی وہ باہر نکلی - تو سب سے پہلے گیلری میں انوری نظر پڑی - وہ ہاتھ میں جھاڑو لیے کھڑی تھی -

"اللہ! رشّو آپا تین بار آپکو چائے کے لیے بلانے آئی ہوں - اف جی! آپ تو مردوں سے شرط باندھ کر سوتی ہیں -"

رشّو نے حیران ہو کر انوری کی جانب دیکھا - اور سوچنے لگی - بھلا اس کو میرا نام کیونکر معلوم ہوا -

"میں تو صبح سویرے اٹھنے کی عادی ہوں -"

انوری نے اپنے بٹوہ سے ہونٹ کھولے اور خوب ہنس کر بولی -

"ہائے اللہ! یہ صبح ہے آپا جی دیکھئے تو سہی -"

بات بالکل معمولی تھی - لیکن رشّو جان کا نو مرکز تقل صبح سے گڑبڑ ہو چکا تھا - انوری کو جواب دینے کی تمنا اسے ضرور تھی - لیکن مردے نہ کھلا - بے چاری چپ چاپ آگے نکل گئی -

انوری نے حیرانی سے رشّو کی طرف دیکھا - پھر چیڑ لاکھ جیسے سرخ ہونٹ پھڑپھڑائے اور بچوں ٹہنوں سے جھاڑو پھیرنے لگی -

دوسرے دن جب رشّو سائیکالوجی کی کلاس میں پہنچی تو ڈاکٹر اعجاز حسین لیکچر دے

رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے جالی کے دروازے کے پاس ٹھٹھکے ہوئے پایا تو یکدم خاموش ہو گئے۔ جیب سے بڑا سا سفید رومال نکالا۔ ربڑ والے ہارن کی طرح بھوں کر کے رومال میں ناک صاف کی اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر بلایا۔

رشو کے لئے دہلیز الانگنا اتنا ہی مشکل ہو گیا جیسے مہارانی سیتا سے رامچندر جی کی کھینچی ہوئی باؤنڈری لائن سے قدم آگے گزانا۔

سارے کلاس کے طلبا اور طالبات بھرپور نظروں سے اسکی طرف دیکھ رہے تھے . . .

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" ڈاکٹر اعجاز نے انگریزی میں سوال کیا۔

"جی . . . میں نے آج ہی داخلہ لیا ہے سائیکلوجی . . . میں۔" رشو منہ میں منمنائی

"کیا؟" ڈاکٹر صاحب نے گردن کو ایک طرف موڑ کر پوچھا۔

"جی - میں بہاولپور سے آئی ہوں - ایم۔ اے سائیکلوجی کے لئے۔"

"پھر بیٹھ جائیے' باہر کیوں کھڑی ہیں آپ؟"

سارے کلاس یکبارگی ہنس دی۔ رشو نے اسی میں عافیت جانی کہ سب سے پہلی کرسی پر جلدی سے تسلط جمالیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ وہ تازہ وارد تھی۔ لڑکے لڑکیاں اسے تجسس سے دیکھنے میں حق بجانب تھے۔ لیکن اس کی ٹانگیں کمزور پڑ رہی تھیں۔ اسکا سارا وجود برادے کی طرح بھر بھرا اور بے جان ہو گیا تھا۔

"میں کیا کہہ رہا تھا؟" پروفیسر صاحب نے کلاس سے سوال کیا۔

"آپ ایڈیپس کومپلکس کے متعلق بتا رہے تھے سر!"

"یس یس یس یس ۔ ۔ ۔ " وہ کتنی ہی دیر یس یس کہتے رہے جیسے اس اثبات کی ڈوری سے بھاگتے ہوئے خیالات کی مچھلی کو واپس پکڑ رہے ہوں۔

"میں آپ کو بتا رہا تھا۔ ماں بچے اور باپ کا رشتہ بڑا منفرد اور الجھیلا ہے۔ اس رشتے کو اگر آپ پری، جن اور بونے کا رشتہ سمجھیں تو بہت جلد فرق واضح ہو جائیگا۔ ماں وہ پری ہے جس سے بچہ (جو کہ بونا ہے لیکن جس میں جبلی خواہش مکمل نہیں) محبت کرتا ہے ماں سارا دن اس بونے سے کھیلتی ہے۔ اس کے کپڑے دھوتی ہے۔ اسے کھانا کھلاتی ہے۔ اسے پوٹی پہ بٹھاتی ہے۔ ماں کا محور یہ بونا رہتا ہے۔ اچانک شام کو کہیں سے آدم بو آدم بو پکارتا ایک جن آجاتا ہے۔ اور پری اس جن کی خاطر بونے کی پروا نہیں کرتی ۔ ۔ آپ کا کیا نام ہے مس؟

رشو یکدم اٹھ کر بولی۔

"مس رشیدہ میر"

"بیٹھئے بیٹھئے۔"

رشو کے کھڑا ہونے پر ساری کلاس بہت محظوظ ہوئی۔

یہاں لیور میں شاگرد کھڑے ہو کر جواب دیتے ہوں تو خیر ادھر لاہور کے لئے یہ طریقہ بالکل جنگلی تھا۔ ظفر نے پیچھے سے ذرا سا ہاتھ بڑھایا۔ اور رشو جان کے دوپٹے کو جھٹکا دیا۔ وہ جھٹکا کھا کر پیچا کھائی پتنگ کی طرح کرسی میں گر گئی۔

"پس کہاں تھا لڑکو؟" ڈاکٹر اعجاز نے پھر ہار مانی طرح ناک صاف کر کے پوچھا۔

"پری جن کی خاطر بونے کی پروا نہیں کرتی سر۔"

کچھ دیر انہوں نے پس پس کہنے میں گذاری۔ خیالات مجتمع ہو گئے تو لیکچر رواں ہو گیا۔

"بونا شام کے وقت سے ڈرتا ہے جب یکدم اس کا پری اس جن کی ہو جائیگی جس کا مقابلہ جسمانی طور پر وہ نہیں کر سکتا۔ اگر معاملہ یکطرفہ محبت کا ہوتا تو پھر اس میں مشکلات نہ ہوتیں۔ لیکن الجھاؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بونے کو اس جن سے بھی محبت ہوتی ہے۔ اور پری سے بھی۔ اور وہ دونوں بھی اسے پیار کرتے ہیں۔ وہ دل سے اس جن کو ختم کرنے کی تمنا بھی رکھتا ہے۔ اور اپنی اس تمنا سے چڑتا بھی ہے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے وجود کو گھناؤنا اور باعثِ شرم سمجھتا ہے۔ آپ کہاں سے آئی ہیں مس رشیدہ۔"

مارے ادب کے پھر اس نے اٹھ کر کہا۔ "جی بہاولپور سے۔"

اس بار تو قہقہہ اتنا بلند تھا۔ جیسے بہت سارے کوے یکبارگی اڑے ہوں۔

"بیٹھئے بیٹھئے پلیز۔ . . . ہاں تو میں کہہ رہا تھا جب یہ مثبت اور منفی جذبات بچے کے دل میں پیدا ہو جائیں اور اس کی شخصیت کنفلکٹ میں مبتلا ہو جائے تو اڈیپس کومپلکس کا بیج بو دیا جاتا ہے۔ . . . کچھ جن اور پریاں عقلمند نہیں ہوتے وہ آپس میں محبت کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی بونے کے ساتھ مل کر کھاتے کا میدہ ہے۔ بچے کو احساس دلاتا کہ . . محبت ایک دو پہیے کی سائیکل ہے۔ انسانی شخصیت پر دانستہ ظلم

ہے۔ محبت میں بچے کو شریک نہ کرنا اسے حسد اور رشک کے مونٹے رہنے سے بچے کا یہ احساس جو شروع میں تھوڑی سی الجھن پر محمول ہوتا ہے۔ بہت زیادہ جڑیں پکڑ جاتا ہے۔ اس کا اثر چاہے بظاہر ہو نہ ہو بچے کی آیندہ زندگی ضرور متعین کرتا ہے۔ . . آپ نے بی اے میں کونسے مضمون لئے تھے مس پیر۔"

اس بار رشیدہ نے اٹھنے کے لئے جسم ابھارا اور پھر اٹھے بغیر بولی۔

"جی اکنامکس اور سائیکلوجی۔"

"یس یس . . . ویری گڈ . . . ہم ایڈیس کومپلکس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا . . ." انہوں نے انگریزی میں پوچھا۔

رشیدہ نے اثبات میں سر ہلایا کیونکہ آواز اس کے حلق میں جم کر بیٹھ گئی تھی۔

"کچھ بچے معاشرے کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اور ان کے کردار میں انضباط پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہم آہنگی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھوتہ، یہ ہم آہنگی بھی قدرتی چیزوں کی طرح ہے۔ مثلاً بجلی اور ہوا۔ . . ہم ان کے وجود کو اس وقت سمجھتے ہیں جب انکے کارنامے دیکھتے ہیں۔ ہم آہنگی اور انضباط کو سمجھنے کے لئے بھی ہمارے پاس یہی پیمانہ ہے کہ فلاں شخص سوسائٹی میں کس حد تک سمو یا گیا ہے بغیر الجھاؤ کے۔ . . جو کردار بچپن کے الجھاؤ کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور ایڈیس کومپلکس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے متعلق میں پھر بات کروں گا۔ ہم پھر یہاں واپس آئیں گے۔ فی الحال دو چار باتیں مجھے ایسی سوسائٹی کے متعلق کرنا ہیں، جہاں محرموں کے ساتھ مباشرت قابل اعتراض نہیں، یعنی جہاں ایڈیس

کومپلکس کے پیدا ہونے کے امکانات کم ہیں۔ . . . آپ کہاں رہ رہی ہیں مس سیر ہوسٹل میں کہ کسی رشتہ دار کے پاس ؟ . . . "

"جی رشتہ داروں کے پاس ۔"

"آئی سی . . . ہاں تو میں کہہ رہا تھا ۔ نوٹ کر لیجئے کہ مہذب سوسائٹی کا تانا بانا ایسا ہے جہاں محرموں کے ساتھ جنسی تعلقات ناجائز سمجھے جاتے ہیں ۔ ایسی سوسائٹی ذہنی الجھنوں میں زیادہ مبتلا ہوتی ہے ۔ لیکن دنیا کے کچھ خطے ایسے ہیں جہاں نہ تو لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہے ۔ اور نہ ہی اسے گناہ سمجھا جاتا ہے ۔ سسلی میں باپ بیٹی کے ناجائز تعلقات قابلِ اعتراض نہیں ۔ ہوائی کے شاہی خاندان میں بھائی بہن کی شادی عام ہے ۔ مصری تہذیب اور انکاس کی سوسائٹی میں ان باتوں کو معمولی سمجھا جاتا تھا ۔ یس مس ۔ کیا ہے ؟"

رشیدہ کا سارا بدن کانپ رہا تھا ۔ اور وہ یوں محسوس کر رہی تھی ۔ جیسے وہ بالکل برہنہ کھڑی ہے ۔ اور گلی کے بچے اس کے اردگرد تالیاں پیٹ رہے ہیں ۔

"پری جن اور بونے کی کہانی تو آپ کو سمجھ آ گئی ہوگی ۔ اب میں کہانی کا وہ رخ دکھانا چاہتا ہوں جہاں بچی اور باپ کا رشتۂ الفت جو بظاہر نہایت سادہ ہے" الجھتا ہے ۔

لڑکا بچپن سے مخالف جنس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا گر سیکھ لیتا ہے ۔ مکتب زندگی میں اس کی ماں سب سے بڑی استاد ، دوست اور غم گسار ہوتی ہے ۔ لڑکی کے پاس یہ مواقع کم ہوتے ہیں ۔ وہ باپ کے پاس کم رہتی ہے ۔ اس کی محبت میں وارفتگی ، جنون اور پرستش ہوتی ہے ۔ لڑکا نئی کے منصوبے بناتا ہے ۔ لیکن ہم آہنگی میں اسے سہولت

ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ مخالف جنس کو فطری طور پر سمجھنے لگتا ہے۔ اسے یہ سمجھ پیدا کرنے میں ماں کی مدد ملتی ہے . . . بچی کے لئے ایڈیپس کومپلکس میں گرفتار ہونے کے مواقع زیادہ ہیں اسکی ایڈجسٹمنٹ (Adjustment) زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ یہ رابطہ بظاہر بھی اور بباطن بھی الجھاؤ پر مبنی محبت پر مبنی ہوتا ہے۔ آپ لوگ سمجھ رہے ہیں نا؟ . . . آپ مس رشیدہ؟"

"جی . . ."

کہنے کو تو رشیدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن اس کا دل کبوتری کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سفید رومال میں ناک کو بھوں کر کے صاف کرنے والا پروفیسر اسکی پشت پر بلیک بورڈ، سامنے پڑا ہوا سبز نما ڈسک سب پانی کے عکس کی طرح ہل رہے تھے۔

"آپ لوگوں کے فائدے کے لئے میں پرانے عہد نامے میں سے ایک اقتباس لکھ کر لے آیا ہوں۔ یہ ایک ایسی سوسائٹی کا نقشہ ہے جہاں امرد پرستی تو قابلِ اعتراض ہے لیکن بیٹی اور باپ کے جنسی تعلقات پر معاشرہ انگشت نمائی نہیں کرتا۔"

رشیدہ کی بغلوں میں پسینے کی وجہ سے ہلکی ہلکی مہک پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اس کمرے سے اس لیکچر سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ بی اے میں بھی اس نے ایڈیپس کومپلکس پڑھا تھا، لیکن نہ تو زاویہ یہ تھا نہ اس قدر بیان میں کھلاپن اور بیباکی تھی۔ رشیدہ کی نظریں پیوست فرش ہوگئیں۔ ساری کلاس کھٹا کھٹ کاپیوں پر نوٹس لے رہی تھی۔ لیکن اس کی انگلیوں میں برف کی تہیں جم گئی تھی۔ سانس میں ناہموار کیفیت تھی۔ اسے وہم سا ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی اسے مرگی کا دورہ پڑنے والا ہے۔

پروفیسر اعجاز حسین نے اپنی نوٹ بک کھولی۔ آنکھوں پر عینک جمائی اور پڑھنے لگے۔

"جب لوط ضغر میں داخل ہوا تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ

پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی۔"

پھر ڈاکٹر نے نظریں کاپی سے اٹھا کر کلاس سے پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ سوڈمی لفظ سدوم سے اخراج کیا گیا ہے۔"

کلاس میں سے بہت سی مثبت آوازیں آئیں۔ ڈاکٹر صاحب پھر پڑھنے لگے۔

"اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے

ساتھ تھیں۔ کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا۔ اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں

رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا۔ ہمارا باپ بڈھا ہے۔ اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو

دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے

ہم آغوش ہوں۔ تاکہ اپنے باپ سے اپنی نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ

کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب

لیٹی اور کب اٹھ گئی۔

اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو

میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ آؤ آج رات بھی اسے مے پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے

ہم آغوش ہو تاکہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ

کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب

اُٹھ گئی؟ ..... سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام موآب رکھا۔ وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔ اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمی رکھا۔ وہی بنی عمون کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔"

گھنٹی بجتے ہی لڑکیاں کرسیوں سے اٹھیں اور لیڈیز روم کی طرف روانہ ہو گئیں ... ثریا صفت یہ لڑکیاں بڑی اترابٹ سے لڑکوں کو حیران چھوڑ کر چلدیں۔ ان کے جانے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ سورج منجی ہیں اور طلبہ وہ شودر ہیں جن کے ساتھ اونچی برہمن جاتی کے لوگوں کو کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیئے۔

لیڈیز روم ایک لمبا سا مستطیل کمرہ تھا۔ جسکے عین وسط میں مہاگنی کا بھاری اور مستطیل میز دھرا تھا۔ اس میز کی سطح سپرٹ پالش کی وجہ سے آئینہ کی طرح شفاف، ملائم اور چمکدار تھی۔ میز کے چاروں جانب آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ کونے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل دھرا تھا جس پر چائے کے برتنوں سے لدا ایک ٹرے رکھا تھا۔

لیڈیز روم کا دروازہ کھلتے ہی متعفن پانی، باسی پیسٹری پھپھوندی بھری ہوا کی ملی جلی خوشبو آئی۔ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے کتابوں کو چیر اسی کی طرح اٹھائے دبکیلے قدم اٹھاتی، رشو جان بھی لیڈیز روم میں داخل ہو گئی۔

"یہ مائی کہاں گئی آج ... " لانبے قد والی طیبہ نے کہا۔

"ہر روز لیڈیز روم بند ملتا ہے ہمیں تو ... میں تو آج ہی پرنسپل صاحب سے

شکایت کروں گی ۔ حد ہو گئی ۔ نوٹس بڑے بڑے بھی یہیں پڑے ہیں ۔" گلنار نے جلدی جلدی انگریزی میں کہا ۔

رشو ان چہروں کو اس انہماک سے دیکھ رہی تھی جیسے سن بلوغ کو پہنچ کر لڑکیاں فلمیں دیکھا کرتی ہیں ۔ سائیکلوجی کی ان چھ طالبات کا نہ تو اسے نام آتا تھا اور نہ ہی اسمیں اتنی جرأت تھی کہ وہ کسی سے اپنا تعارف کروا سکے ۔ چپ چاپ ایک آرام کرسی میں دھنسی ٹکر ٹکر سب کا منہ تکنے لگی ۔

"توبہ، توبہ ! ڈاکٹر اعجاز صاحب تو انتہا کا بور کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ حد ہے بس " سفید رنگ کے دستانے، المبو ترے پرس سمیت میز پر رکھ کر ایک لڑکی بولی ۔

دو لڑکیاں شکل ط ظ آپس میں مشابہ اور ایک سے کپڑے پہنے ہوئے تھیں ۔ بعد میں رشو جان کر معلوم ہوا کہ یہ تو طبلے کا دایاں بایاں ہیں ۔ بایاں کبھی سُر نہیں کیا جاتا ۔ اور دایاں ہر وقت بگڑا رہتا ہے ۔ چھوٹی سی ہتھوڑی سے اسے ٹھورتے رہنا پڑتا ہے ۔

ط جلدی سے کہنے لگی ۔

"پروفیسر صاحب نے تو ہمیں بالکل ہی اناڑی سمجھ لیا ہے ۔ بی اے کے سٹوڈنٹ کا لیکچر دیتے ہیں پکڑ کر ۔"

ظ نے جلدی سے تو ڑا بجایا ۔

"اور وہ حضرت لوط کا قصہ کیوں لے بیٹھے ۔ بیچ میں بالکل غیر ضروری بات ۔"

زاہدہ لمبے اونچے شیشے دار کھڑکیاں بند کرنے میں مشغول تھی ۔ اس کا سر پیچھے سے مصری ملکہ نفرتیتی کی طرح سڈول لگ رہا تھا ۔ جلدی سے سر پھیر کر بولی ۔

"توبہ، کالج آکر تو بیحد وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ آدمی گھر بیٹھ کر مطالعہ کرلے۔ سچ!"

رشو جان یہ جملہ سنکر یکدم چونکی۔ اس نے جس لمحہ کالج کے پھاٹک کے اندر قدم رکھا تھا۔ اس وقت سے لیکر ایڈیز روم کی ٹھنڈی کرسی پر بیٹھنے تک ایک ایک لمحہ کبوتری کے پوٹے کی طرح جاندار اور بھرا ہوا تھا۔ وہ پروفیسر جس میں لڑکیاں بیٹھی نرمانے بھر کے نقص نکال رہی تھیں۔ رشو جان کو کسی انگریزی فلم کے کیریکٹر ایکٹر کی طرح پر خلوص، تجربہ کار اور بے انتہا فاضل لگ رہا تھا۔

کنپٹیوں سے اوپر سفید ہوتے بال، شکاری کتے جیسا دبلا پتلا چہرہ جس پر تجربے کی لکیریں جالے کی طرح تنی تھیں۔ لمبے لمبے ہاتھ جن کی ابھری رگیں بٹی ہوئی ڈوری کی طرح نظر آتی تھیں۔ لہجے میں متانت، بات میں روانی، دلائل میں منطق، انداز میں ٹھہراو، رشو جان پر تو اعجاز حسین صاحب کی شخصیت نے اتنا بوجھ ڈالا تھا کہ دل کی کلی یکدم پرلیس ہوگئی تھی۔ اس دن کے بعد سے جو سلسلۂ بیعت چلا تو رشو جان پوری طرح سے پروفیسر صاحب کی پیری بن گئی۔ اور ان کے احکامات کو یوں دل سے مانا جیسے اپنی بسنت نے مہاتما گاندھی کو دل سے قابلِ پرستش سمجھ لیا تھا۔

لڑکیاں اب پروفیسر صاحب کا تذکرہ چھوڑ کر آپس کے دلچسپ موضوعات پر گفتگو کررہی تھیں۔ طبلے کے بائیں نے کہا۔

"صبح میں تو نہاری کا ناشتہ کرکے آتی ہوں۔ روز بھائی میاں خود جاتے ہیں نہاری

لینے . . . . "

دائیں بے سُرے طبلے نے کہا

"اللہ جی! ہمیں تو . . . . ہوسٹل میں رات کی باسی روٹی کھانا پڑتی ہے۔ خدا قسم جو دودھ ملتا ہے۔ اس میں سے جھینگر نکلتے ہیں کبھی مچھر، میں نے تو دودھ پینا چھوڑ دیا ہے بالکل . ."

ظا بولی "اس سینچر کو تم ہمارے ساتھ چلنا، میں تمہیں ہریسہ کھلاؤں گی۔ گھر سے بھائی میاں ہری مرچیں، پیاز، اور ادرک کتر کر لے جاتے ہیں۔ پاؤ بھر دیسی گھی گائے کا گرم کر کے وہ بگھار لگتا ہے وہ مزہ آتا ہے، وہ مزہ آتا ہے کہ کیا بتاؤں . . . کبھی شب دیگ کھائی ہے تم نے؟"

درشو جان نے ان دونوں لڑکیوں کی جانب دیکھا، ہریسہ، شب دیگ، نہاری یہ کھانے کی کونسی قسمیں ہیں۔ ان کا نام نہایت روح افزا تھا۔ ان کے نام سنکر یوں احساس ہوتا تھا جیسے کسی مغلیہ سلطنت کے شاہی دسترخوان پر ٹخنے ٹخنے تک کام لیٹ کی پشوازیں پہنے کنیزیں نعمتیں چن رہی ہوں۔ چاندی اور سونے کے ظروف کندھوں پر ٹکائے آبدار خانے سے ٹھنڈی صراحیں لاتی ہوئی سیاہ حبشنیں۔ کمخواب کے بیش قیمت گاؤتکیوں پر ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی مہ پارہ مغلیہ شہزادیوں کا اجتماع۔ فارسی زبان میں چہلیں . . . چھوٹے چھوٹے لقمے حلق سے اترتی ہوئی پانی کی غٹ غٹ۔ انگبیں کے نترے شیشے کی نالی میں سے چھلکتے ہوئے۔ فضا میں ہرن کے گوشت کی مہک۔ جائفل جاوتری میں

پکے ہوئے چاولوں کی باس ۔ الائچی پان کے پتے اور کیوڑے کی خوشبو . . .

یہ سارا تصوّر صندل کے جنگل کی طرح مہکا ہوا تھا ۔

میز پر سفید دستانے اور لمبوترا پرس رکھنے والی ڈمپل امریکی اشتہاروں کی طرح مجلی اور چمکدار تھی ۔ اس کی مسکراہٹ میں چمکتے دانت ، اوپر کو اٹھی ہوئی پلکیں ، سر پہ بالوں کی آراستہ پگڑی ، کانوں میں پہنے ہوئے لیمن ڈراپ جیسے آویزے ۔ سب کچھ اشتہاری تھا ۔ وہ پشتم پشتم سوتیوں کی طرح بڑے لچھے دار اور چکنی چکنی انگریزی بولتی تھی ۔ اور بولتی چلی جاتی تھی ۔ ڈمپل سر کے بالوں سے لیکر جوتی کے پنجے تک ۔ کاروں کے نئے ماڈلوں کی طرح بڑی دلآویز تھی ۔

پہلی بار رشّو باجی نے اپنے لمبے کان بالوں تلے چھپا لینا چاہے ۔ ڈمپل کے سامنے کسی اور لڑکی کو اپنے آپ کو جنس لطیف سمجھنے کا حق ہی باقی نہیں رہتا تھا ۔ وہ میز پر کچھ اس طرح بیٹھی تھی کہ اسکا آدھا دھڑ میز کی سطح پر پوری آب و تاب سے منعکس ہو رہا تھا ۔

ڈمپل نے اپنے بالوں کو چھو کر کہا ۔ "لیجئے کرٹے پر جب تک فر کا کالر نہ لگے تو کوٹ کا مزہ ہی گیا ۔"

"لیکن ڈمپل جان میں تو ہاف کوٹ بنا رہی ہوں ۔ . . بالکل یہاں تک . . ." کولہو تک ہاتھ لے جا کر طیبہ بولی ۔

"چاہے کوٹ ہاف ہو چاہے فل ۔ ان دنوں فر فیشن میں ہے ۔ وہ تو لگوانا ہی پڑے گی کوٹ پر . . ."

کوٹ کے لئے فر ؟ رشّو جان نے دل میں سوچا ۔ ہائے اللہ جی یہ کونسا موا سوئٹزرلینڈ

ہے کہ کوٹوں پر سمور اور سنجاب کی بیک لگانا ضروری ہے ۔ ویسے بھی مردار جانوروں
کی پوستین چھو کر رشّو کو ہلکی سی جھرجھری آجاتی تھی ۔ لیکن ڈمپل کی بات سن کر رشّو جان ایکبار
خیالوں میں کھو گئی ۔ ۔ ۔ ہائے کہیں جو واقعی کوٹ کا کالر جھبری سی پوستین سے بنا ہو تو نہ
جانے گلے کو کیسا کیسا گدگدائے ؟

ڈمپل فر کوٹ سے نکل کر بغیر آستین کے بلاؤز اور نقلی محرموں تک جا پہنچی تھی لیکن
رشّو جان فر کے سمندر میں ہی ڈبکیاں لگا رہی تھی ۔

دروازے پر دستک ہوئی تو تمام لڑکیاں یک دم خاموش ہو گئیں ۔

"کون ہے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔" ڈمپل نے انگریزی میں سوال کیا ۔

"مس ! میں ہوں ۔ ظفر ۔ ۔ ۔"

یک دم لڑکیوں کے کمرے میں پلیٹ فارم جیسی کیفیت پیدا ہو گئی ۔ وہی سرگرمی ،
وہی شور و غوغا ۔ وہی تو جا میں آ والی بات ۔ ۔

"تم جاؤ ۔ ۔ ڈمپل !"

"تو میں کیوں جاؤں ۔ تم جاؤ نا ! گلنار ۔ ۔ ۔ تمہارے تو فیملی کے تعلقات بھی
ہیں ان سے ۔ ۔ ۔"

طاظ یکدم ہوا نکلے غباروں کی طرح بولیں ۔

"خیر ہم تو پکنک پر جائیں گے نہیں ۔ چاہے پروفیسر اعجاز کہیں چاہے پرنسپل صاحب
۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔"

تھوڑی سی ووٹیں کٹ جانے سے حالات نارمل پر آگئے۔ بالآخر جب تین بار دروازے پر دستک ہو چکی، تو سفید کورٹ شوز ٹھکٹکاتی ڈمپل دروازہ تک گئی۔

"فرمایئے۔"

ظفر علی نے پہلے تھوک نگلا پھر اپنے بالوں پر دست راس پھیرا۔ اور نظریں جھکا کر گویا ہوا۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے آپ لوگوں نے؟"

"ابھی تک ہم اپنے اپنے گھر والوں سے مشورہ نہیں کر سکیں۔" ڈمپل نے کیوٹکس لگی انگلیوں سے ناک کریدی۔

"دیکھیے معمولی سی بات کا آپ لوگوں نے اس قدر بڑا اشو (issue) بنا لیا ہے۔ آپ لوگ سائیکلوجی پڑھتی ہیں۔ کم از کم آپ کو اتنی انہبشن (Inhibition) کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

کہنے کو تو ظفر علی کہہ گیا لیکن ساتھ ہی اس کے کان جھنجھنانے لگے۔

"ہم سائیکلوجی ضرور پڑھتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم آزادی کو پسند بھی کریں پروفیسر ضیاء۔ کو اگر آپ کالج میں فیر ول پارٹی دے دیتے تو کیا مضائقہ تھا؟ پکنک پر تو شاید ہم میں سے آدھی لڑکیاں بھی نہ جا سکیں۔"

"مس آپ بتایئے بھلا کالج اور شالیمار میں فرق ہی کیا ہے؟ فیر ول تو یہاں بھی پروفیسر ضیاء کا ہوگا اور وہاں بھی۔ کم از کم پکنک اولڈ فیشن چیز نہیں ہے۔ پارٹی

کی طرح ۔۔۔ آپ اپنی ساتھی لڑکیوں کو منا لیجئے ۔۔ پلیز ! ۔ یہ بہت ضروری ہے"
ظفر بولا۔

"میں کوشش کروں گی ۔"

"خیر ! میں کل آپ سے پوچھنے آؤنگا ۔"

"اچھا ۔"

"سلام علیکم ۔ مس !"

"وعلیکم سلام ۔ ۔"

دونوں بادِل ناخواستہ دروازے کی اوٹ چھوڑ کر اپنے اپنے محور کی طرف چل دیئے۔

ظفر علی جب شام کو ہوسٹل میں پہنچا تو باہر والی لان پر لڑکے ٹینس کھیل رہے تھے ہواہیں خنکی لیکن دھوپ میں ابھی تک تمازت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں بس اتنی جان رہ گئی تھی جیسے چھپکلی کی دم کٹ کر بھی تڑپتی رہتی ہے ۔

وہ غازی کے کمرے میں پہنچا۔ غازی بستر کی چادر سے ایک بڑا سا شیشہ پونچھ رہا تھا۔ رشید کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اور افتخار حسبِ عادت اور حسبِ معمول اپنی پائپ میں تمباکو ٹھونس رہا تھا۔

"ان لڑکیوں کا بھی انت نہیں پایا کسی نے ۔ سج بن کر یوں کالج آتی ہیں کہ احساس ہوتا ہے سوئمبر رچانے آتی ہیں۔ اور ذرا بات کرو تو چھوئی موئی بن جاتی ہیں، سمٹی پھرتی

ہیں ۔ لجائی جاتی ہیں ۔ اونہہ . . . " ظفر علی نے گھستے ہی کہا ۔

" کیوں ظفر ، آج بہت دکھ اٹھائے ہیں کیا لڑکیوں کے ہاتھ ؟ " نمازی نے سوال کیا ۔

" ساری سائیکلوجی سمجھ آتی ہے ۔ نہیں آتی سمجھ تو ان لڑکیوں کی سائیکلوجی کی ۔ ان کو اگر پکنک پر نہیں جانا تھا تو پہلے ہی منہ سے پھوٹتیں ، اب جب سب انتظام ہو گئے ہیں تو اتراتی پھرتی ہیں ۔ اجازتیں نہیں ملیں ہیں گھر سے . . . اونہہ . . "

رشید نے میز سے سر اٹھایا اور آہستہ سے بولا ۔

" جب ونسٹن چرچل ہندوستان میں تھا تو اپنے جرالوں سے بات کرنے کے لئے اس نے لفظ انتخاب کئے تھے . . . چلو . . . مارو . . . اور تالی ہو ۔ لڑکیوں کے معاملے میں بھی یہی تین لفظ کام آتے ہیں ۔ چلو . . . مارو . . اور . . تالی ہو . "

" تالی ہو کا کیا مطلب ہے ؟ " افتخار نے سوال کیا ۔

" لڑکیوں سے بات کرنے میں خطرہ ہے ۔ خطرہ کی علامت دو ہڈیاں ان ان پر نصب انسانی کھوپڑی . . یہ ہے تالی ہو ۔ ہر مہم میں ، ہر جانبازی میں تالی ہو ضرور ہوتا ہے ۔ ہر لحظہ ، ہر لمحہ . . "

" کن کی باتیں کر رہے ہو ؟ آراستہ گڑیا عورت نہیں ہوتی ۔ کپڑے ، میک اپ اور ہیر پنوں کا پن کشن ہوتی ہے ۔ اسکے وجود سے کپڑا اور پنیں نکال لو تو باقی

نادرہ رہ جاتا ہے تین دن کا باسی . . ." افتخار بولا۔

ظفر علی افسردہ خاطر پلنگ پر بیٹھ گیا اور سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"لیکن اگر اب لڑکی لوگ پکنک پر نہ گئیں تو پروفیسر اعجاز مجھ پر الزام دھریں گے سارا . . . عجب مصیبت ہے۔"

"اصلی عورت تو طوائف ہوتی ہے۔ دولت اگر اسے پیاری ہے تو وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ آپ سے عشق کرتی ہے تو بھی جھوٹ نہیں بولتی۔ مارنا چاہے گی تو مارے گی اور ضرور مارے گی۔ مرنا چاہے گی تو ماں باپ کی اجازت لئے بغیر مر جائے گی۔ دو کشتیوں پر پیر رکھنا ان کا پیشہ نہیں ہے۔" غازی بولا۔

سب جانتے تھے کہ جنید غازی کا ہیرا منڈی سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق کے باوجود اس کے چہرے پر ایک ملکوتی کیفیت رہتی تھی۔ جیسے دھوبیوں، لکڑہاروں اور چنگڑوں کو وعظ دے کر سیدھا چلا آ رہا ہو۔

افتخار نے سر اٹھا کر غازی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تو بھئی اے بی سی ڈی تو لکھ دی سارے گتے پر۔ اور بھی کچھ لکھنا ہے کہ بس؟ . . ."

"ایک طرف کرنے ہیں پس لکھو اور دوسری طرف لو . . . یہ دونوں ضروری ہیں۔"

"پھر وہی بک بک ہونے لگی ہے۔" ظفر نے پوچھا۔

"تمہارے نزدیک بک بک ہے تو گھر جاؤ مزے سے۔"

"یار نئی بات تو تمہاری روحوں نے کبھی بتائی نہیں۔" ظفر نے کہا۔

"ہمیشہ سوال بھی تو دہی پرانے ہوتے ہیں۔" غازی بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ کوئی روح اس گلاس میں آسکتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

"بیٹھو، دیکھو اور بات مت کرو۔"

ظفر خاموشی سے بیٹھا ان تینوں کو دیکھتا رہا۔ افتخار نے اس گتے کو میز پر رکھا جس پر انگریزی میں ساری اے بی سی ڈی لکھی تھی۔ غازی نے شیشہ چمکا کر گتے پر جمایا" اور رشید کو آواز دی۔

"او نیستی کے بچے۔ ادھر آ، اب تو۔"

پانچ ماچس کی تیلیاں جلانے کے باوجود ابھی تک پائپ نہیں سلگا تھا۔ وہ ویسٹرن فلم کے ہیرو کی طرح جھپ کھاتا اٹھا۔ اور میز کے گرد بیٹھ گیا۔ غازی نے شیشے کے گلاس کو تولئے سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور یہ ذات شریف کونسی تھیں جو آج بہاولپور سے آئی ہیں۔"

"ذرا کان لمبے ہیں اس لڑکی کے۔" افتخار بولا۔

کان؟ ... اتنی جلدی تم نے کان بھی دیکھ لئے اس کے؟" رشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دیکھنے والے ہر لڑکی کو ایک ہی نظر دیکھا کرتے ہیں۔ یہ نظر لڑکی کے سارے وجود کو کارتوس کی طرح

برماتی چلی جاتی ہے ۔ اسس ایک نظر میں محدب اور مجوف شیشہ دونوں فٹ ہوتے ہیں ۔ ساری تفصیل پتہ لگ جاتی ہے ۔ ایک لمحہ میں ۔ لو بھئی دوستو یہ رہا گلاس ؟"

پلانچیٹ کا کھیل جاری ہوگیا ۔ رشید ، افتخار اور غازی میز پر شیشہ رکھ کر اوپر گلاس اوندھا کر کے اپنی اپنی انگشت شہادت اس پر جما کر بیٹھ گئے ۔ ان کے چہروں پر یکدم بہت سنجیدگی اور پرہیزگاری آچکی تھی ۔

ظفر ان تینوں سے کچھ فاصلے پر بیٹھا سگریٹ پینے میں مشغول تھا خدا جانے کیا بات تھی لیکن رشیدہ کو کم کتی کہہ کر افتخار نے جیسے اس کا موڈ بھگو دیا تھا ۔

"کوئی اچھی روح جو اس وقت یہاں سے گذر رہی ہے اس گلاس میں آئے اور اس گلاس کو جنبش دے کر اپنے آنے کی اطلاع دے ۔ ۔ ۔ کوئی اچھی روح ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی اچھی روح ۔"

غازی سوئے ہوئے انگریزی میں بار بار اس التجا کی تکرار کرنے لگا ۔ بحر الغزال کے حبشی جادوگروں کی طرح اس کی آواز میں سوز ساز اور گھنا گھنا اندھیرا تھا ۔ خپلا سترا کے گھنے جنگلوں کی طرح یہ اسرار کی وادی تھی ۔ خاموش ، اندھیری اور ممنوع ۔

"کوئی اچھی روح جو اس وقت یہاں سے گذر رہی ہو ۔ اس گلاس میں آئے اور اس گلاس کو جنبش دے کر اپنے آنے کی اطلاع دے ۔"

دو تین بار جب ساحر اپنا منتر پڑھ چکا اور کمرے کی فضا اپنی خاموشی سے بوجھل ہو گئی تو گلاس ذرا سا ہلا ۔ تینوں انگلیاں جو گلاس پر ہلکے سے دباؤ سے ٹکی تھیں آہستہ

سے لرزیں۔

"اچھی روح ! کیا تم اندر ہو ؟ "

گلاس شیشے کی سطح پر گھومنے لگا۔

"اچھی روح اگر تم اس گلاس کے اندر ہو . . تو یس تک جاکر اپنے آنے کا سراغ دو . ." انگریزی میں غازی نے التجا کی۔

غازی کے چہرے پر کسی ایسے لاما کا تبحر، تقدس اور کم سخنی چھائی تھی جس کی ساری عمر عبادت کے چکر چلاتے گذری ہو۔

"اچھی روح کیا تم یہاں ہو ؟ "

گلاس چیں چیں کر کے شیشے پر بھٹکنے لگا۔

"اچھی روح کیا تم ہمارے سوالوں کا جواب دو گی . . بولو . . دو گی اچھی روح" رشید نے پوچھا۔

گلاس بھاگ کر یس کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ بتاؤ پیاری روح . . . کشمیر کب پاکستان کو ملے گا ؟ "

"یہ بھی کوئی سوال ہے۔" ذرا انتشار کی بات کو پس پشت ڈال کر غازی نے اپنا سوال جاری کر دیا۔ "کیا وہ پیشہ چھوڑ دے گی بولو ؟ "

"اچھی روح ! بتاؤ۔ کیا وہ پیشہ چھوڑ دے گی ؟ اور مجھ سے نکاح کرے گی۔ . . بولو . . بولو . . "

روح گلاس کو یس کی طرف گھسیٹ کرلے گئی۔

"اور مجھ سے شادی کرے گی؟" غازی نے پھر پوچھا۔

اب گلاس نو کی طرف بھاگنے لگا۔

غازی نے غمزدہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"کیا محمد علی رضؒ کلے اپنا ٹائیٹل تاقیامت رکھے گا۔" رشید نے سوال کیا۔

گلاس مختلف حروف پر تیزی سے پھرنے لگا۔

وہ تینوں حروف کو ملا کر لفظ اور لفظوں کو ملا کر جملے بنانے لگے۔ لیکن جملہ بننے سے ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

"یہ کوئی سوال ہے۔ کوئی ڈھنگ کا سوال کرو یار۔" افتخار بولا۔

"اچھا میں کام کا سوال پوچھتا ہوں . . . پیاری روح یہ بتاؤ۔ یہ نئی لڑکی جو آج کالج میں آئی تھی۔ یعنی رشیدہ میر، یہ کہاں کی رہنے والی ہے۔"

گلاس نے بہت جلد بہاولپور لفظ کے ہجے کر دیئے۔

"کیا یہ اچھی لڑکی ہے کہ باقی فرعون زادیوں کی طرح ہے۔" افتخار نے پھر سوال کیا۔

"مختلف" کے ہجے کئے گئے۔

"کیا یہ ہم چاروں میں سے کسی سے محبت کرے گی۔" رشید نے جھک کر گلاس سے سرگوشی کی۔

"مجھ سے نہیں اچھی روح . . . میں پہلے ہی کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔ ان تینوں میں سے ۔" غازی نے باقی تین لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے سوال کیا۔

گلاس آہستہ آہستہ چاروں طرف گھومنے لگا۔ گول گول چکر . . اودھ کٹی قوسیں . . نصف قطر بنانے لگا۔

"بتاؤ، بتاؤ، روح اچھی روح سچ سچ بتاؤ!"

ظفر نے منہ پرے کر لیا، نئی لڑکی کو یوں تختۂ مشق بنانا اسے کچھ اچھا نہ لگا۔ اس نے سگرٹوں کی ڈبیا اٹھائی اور جلدی سے بولا۔

"اچھا بھئی سولانگ ہم تو چلے۔"

"رکو، رکو! ابھی مس ڈمپل کے متعلق سوالات ہوں گے۔"

"نو تھینک یو! مجھے کچھ انتظامات کرنے ہیں پکنک کے سلسلے میں . . ." وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا باہر چلا گیا۔

کمرے میں پلانچٹ کے گرد بیٹھے لڑکوں نے اونچا سا قہقہہ لگایا اور پھر کمرے پر مکمل خاموشی چھا گئی۔

لم کتی رشیدہ میر جب پہلا دن کالج میں گزار کر گھر پہنچی تو خالہ نیروزہ باہر برآمدے میں بیٹھی ایک پرانا سویٹر ادھیڑ رہی تھیں۔ انوری جیپڑ الالکھ جیسے سرخ ہونٹ لاڈ سے کھولے ان کے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔ پاس والی کرسی پر خالو جمال آنکھوں پر عینک لگائے صبح کا اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ ان کا معمول تھا کہ صبح ناشتہ سے

وقت اخبار کی سرخیاں دیکھ لیتے، اور دوپہر کو پہلے صفحے پر بکرمی سن اور ہجری سن سے لیکر آخری صفحے کی پرنٹ لائن تک سب کچھ توجہ، انہماک اور یورش سے پڑھتے۔ کچھ خبریں وہ اپنی بیوی سے گفتگو کرنے کی خاطر پڑھا کرتے تھے۔ فلم کے اشتہاروں کا صفحہ، قتل، اغوا کی خبریں، جائدادوں کی خرید و فروخت کی تفصیل، ڈاکہ، رہزنی، ڈکیتی، بنکوں کی لوٹ مار کی واردات، کا بیان اسی ضرورت کے تحت آتا تھا، کھیلوں کا صفحہ گو ان کے کسی کام نہ آتا تھا، لیکن یاد ماضی سے اسکی کڑی ضرور ملتی تھی، ایک زمانے میں جب وہ اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے، اور محض اس وجہ سے ان کو داخلہ ملا تھا کہ وہ کرکٹ خوب کھیلتے تھے۔ انہیں کھیلوں سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کے پاس کئی ایسی کتابیں موجود تھیں جن میں ننگ دھڑنگ مرد صرف جانگیہ پہنے مچھلیاں پنڈلیاں نکالے، پیٹ میں ہزار ہزار ہر ور ہر قسم کے مسل نکالے گردن کو بل دیئے۔ سینے کی وی بنائے موجود تھے۔

بی سی ایس کرنے سے پہلے خالد جبال کو ان تصویروں سے عشق تھا، پھر ان کا مقابلہ ایک ہندو لڑکے پرشوتم سے ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ جوڈو باکسنگ باڈی بلڈنگ، کرکٹ وغیرہ زندگی سے نکل گئی۔ آنکھوں پر عینک آن بیٹھی، معدے میں تبخیر رہنے لگا۔ گفتگو میں کتابی پن آگیا۔ اور وہ پی سی ایس ہو گئے۔ پرانے دنوں سے یہ ہلکا سا رشتہ اب بھی باقی تھا کہ وہ کھیلوں کا صفحہ دیکھ کر، اور کھلاڑیوں کی کارکردگی تفصیل سے پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

ایڈیٹر کے خطوط اور سیاسی حالات دفتری لوگوں سے بات چیت کرنے کے کام آتے تھے۔ اسٹاک ایکسچینج اور بلیک مارکیٹ کی رپورٹ، بازار کے بھاؤ۔ ٹرین اور ہوائی جہازوں کی آمد اور روانگی کی خبریں اس لئے ضروری تھیں کہ اس سے ان کی برتری ظاہر ہوتی تھی۔

ریڈیو کے پروگرام البتہ انہیں ناپسند تھے۔ اسکی وجہ کچھ یہ بھی تھی کہ ریڈیو پروگراموں کے متعلق چاہے ان کی معلومات کتنی بھی وسیع کیوں نہ ہوتیں وہ اپنی بیٹی تنویر کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ تنویر کو تو روشن آرا، ثریا ملتانیکر، فریدہ خانم، اقبال بانو، اے شکور، منور سلطانہ، جمیلہ اختر سلطان کھوسٹ وغیرہ کی ساری ساری ہسٹریاں معلوم تھیں۔ ان کے تعددِ ازدواج، رہائش گاہوں کے پتے اور رشتہ داروں، دوستوں تک کے نام آتے تھے۔ یہاں بھلا خالو جمال کی دال کیا گلتی؟

اخبار کے علاوہ خالو کو اپنے کام سے دلچسپی تھی اور بس!

جب سے وہ انٹی کرپشن میں آئے تھے، چوک کے سنتری سے لیکر منسٹرز اور ان تک اور پرانے آئی سی ایس قسم کے مقتدر افسروں سے لے کر معمولی چپراسیوں تک کو ایک ہی رسی سے پھانسی دیتے تھے جو فائل ان کے پاس پہنچ جاتی، ماونٹ ایورسٹ تلے دب جاتی پھر کوئی سفارش، کوئی لالچ، کسی قسم کا سیاسی دباؤ، کسی نوعیت کی حیلہ سازی ان کا فیصلہ نہ بدل سکتی۔ رپورٹ ہمیشہ وہی ہوتی جس پر خالو جمال کی چھٹی حس کا پختہ اعتقاد ہوتا۔

کورپشن کے بھی ازل سے کئی روپ ہیں۔ اور اس کے ہر روپ کا فلسفہ بھی ہر عہد میں بدلتا رہتا ہے۔ فلسفہ چاہے کچھ بھی ہو، مجبوری چاہے کچھ بھی کہے، اتنی بات ضرور طے

ہے کہ ہر عہد میں کرپشن آنیسر سے صاف گوئی کی توقع کی جاتی رہی ہے۔ اور خالو جمال دفتر میں بہت صاف گو اور معاملے کے کھرے سمجھے جاتے تھے۔

کورپشن کا محکمہ لاہور میں بہت پرانا تھا۔ مہاراجہ رام چندر کے سپوت لوہو نے جب لاہور کی بستی بسائی، اور سورج بنسی راجاؤں کا نام اس شہر کے ساتھ جوڑ کر امر کیا تو خود راجہ لوہو کے پتا مہاراجہ رام چندر کی سروس بک پر کرپشن کا دھبہ لگ چکا تھا۔ مہاراجہ رام جو بڑے دیالو سوربیر ستیہ وان تھے۔ اور جن سے پہلے ستاون راجہ بڑے بڑے بلوان ہندوستان کی گدی پر پورے دو ہزار برس راج کر چکے تھے۔

مہاراجہ رام جنہوں نے بعد میں اشو میدھ یگ کیا، اور مہارانی سیتا کی سونے کی مورتی بنا کر گدی پر رکھی کہ مہارانی کا سمبل بھی قائم رہے۔ اور انہیں دوسری شادی بھی نہ کرنی پڑے۔ مہاراج رام کو اسی جیتی کر اس وقت گھر سے نکالنا پڑا، جب مہارانی گھر پر تی تھی۔ اور لوہو اور کشو اس کے توام بچے جو اس وقت پیٹ میں تھے بلا قصور جلا وطن کر دیئے گئے۔

کورپشن آنیسر دھوبی نے اپنی دھوبن سے کہا تھا۔

"جاری جا نیہہ لگائے دوجوں سنگ۔ اور رہے دھوبی کی جورو۔۔ ای راجہ رام نہیں ہیں کہ بی سنگل دیپ کے راجہ سنگ موجے بہار دیکھی آوے، اور رہے ستہ وتی سیتا۔۔۔ جاری جا۔۔"

کہتے ہیں کہ مہاراجہ رام پر طعنے کے اس کھونٹے تیر کا ایسا اثر ہوا۔ کہ فوراً راجہ بھیم کے

ساتھ مہارانی کو بن باس دیا۔ (یہ کنور لچھمن ہر بن باس میں بڑے اہم رہے۔ اللہ جانے، انہیں رامچندر کا زیادہ پاس تھا کہ ستی سیتا کا؟)

ان دنوں رٹ کرنے کا رواج نہ تھا ورنہ دھوبی ضرور زنغے میں آجاتا۔ ہوسکتا ہے۔ مہاراجہ رام چندر بھی خود دھوبی کے ہم خیال ہوں۔ اور یہ دھوبی محض آڑ کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ انہوں نے مہارانی پر بدچلنی کا دھبہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ستی! یہ تو اور تنشچے میں جانتا ہوں کہ تو ہمالہ کی برف سے بھی پوتر ہے۔ گنگا جل سے بھی ادھک پوجنیے یوگ ہے۔ پرنتو پرتیے جو بات دھوبیوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کو میں راجہ رام کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔"

شاید ان دنوں دھوبی اتنی بڑی سیاسی جماعت کے لیڈر تھے کہ ان کی بات ادھر منہ سے نکلی، ادھر پوری ہوئی۔ خدا جانے گھپلا کیا تھا۔ اتنی بات واضح ہے کہ مہارانی سیتا کو مہاراج رام نے بن باس دیا۔ مہارانی کو چھوڑنے کنور لچھمن ساتھ گئے۔ . . اور کریڈنشل آئنسیر دھوبی نے بہت بڑا کیس جیت لیا۔

ویسے بھی سنا ہے کہ سوڈا کا شک استعمال کرنے والوں کا جبلتی طور پر تزکیۂ نفس کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے جب مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی میں پہلا وعظ دیا تو یہ دھوبیوں سے مخاطب تھا۔

خالو جمال کا دھوبیوں سے کتنا گہرا تعلق تھا، اس کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے نام کی تختی جو پھاٹک کے کونے پر نصب تھی اس پر لکھا تھا۔

جمال اظہر بخاری"

بخاریوں کا شجرۂ نسب وہ سبکتگین [illegible] عہد تک صاف ستھرا پڑھی ور بیری [illegible] لیکن کچھ لوگوں نے یہ پخ نکال رکھی تھی کہ سبکتگین نہ بخاری تھا نہ ہاشمی . . . ممکن ہے یہ الزام تراشی انہوں نے کی ہو جو جمال اظہر صاحب کے ہاتھوں زخم خوردہ ہوں . بہر کیف اعتراض کرنے والوں کا خیال تھا کہ بخاری بننے کا بخار انہیں سن سینتالیس کے بعد چڑھا ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

جس وقت رشیدہ گھر پہنچی اس وقت خالو جمال باآواز بلند اخبار پڑھ کر خالہ فیروزہ کو سنا رہے تھے ۔

"میرا بیٹا ، زبیر خان ، جو میرے ہی مکان کے ایک حصے میں رہتا ہے ۔ بوجہ آوارگی و دیگر حرکات کی بنا پر میں نے اس کا کھانا پینا بول چال بالکل بند کر دی ہے ۔ میں اس کے کسی قول و فعل کا ذمہ دار نہ ہونگا ۔"

محمد حیات خان ، امر نام سنگھ بلڈنگ ، قلعہ گوجر سنگھ لاہور ۔

انوری کے ہاتھوں کی جنبش میں خالہ فیروزہ کا سر آگے پیچھے ہچکولے لے رہا تھا ' یہ عاق نامے کی خبر سنتے ہی وہ بولیں ۔

"توبہ ! بعد میں جو یہ لوگ عاق کرتے پھرتے ہیں تو پہلے ہی اولاد کی خبر گیری کر لیا کریں ! !"

"سب تمہاری طرح اولاد کے دیوانے نہیں ہوتے ۔"

خالو جمال اپنی بیوی کے بڑے مداح تھے۔ ان کی گھرداری اور بچوں کی تربیت سے لے کر نوکروں کی دیکھ بھال سب انتظامات سے خالو جمال کو کلّی اتفاق تھا۔

"بے وقت بڑھاپا بھی آگیا ان بچوں کی فکروں میں۔ پرسوں انارکلی میں مسز عبدالباری ملی تھیں۔ خدا قسم مجھ سے سکول میں تین سال آگے تھیں۔ اور اب مجھ سے دس سال چھوٹی لگتی ہیں۔"

"فیصلہ کر لو۔ جوانی درکار ہے کہ اچھی نیک چلن اولاد . . ."

خالہ فیروزہ نے لمبی سانس بھری۔ درکار تو انہیں دونوں چیزیں تھیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ نصیب میں دونوں چیزیں نہ تھیں۔ ریشمی کپڑا، زیور اعلیٰ سے اعلیٰ جوتیاں، ہر طرح کی میک اپ، کوئی چیز بھی بڑھاپے کی باڑھ روکنے میں کامیاب نہ تھی ادھر اولاد کا نقشہ بھی دن پر دن بگڑتا ہی جا رہا تھا۔

دو ہی بچے تھے، تنویر اور ریاض۔ لیکن یوں سمجھئے کہ بے لگام رہوار پر آسن جمائے بیٹھے تھے۔

پہلے تو ریاض کے دوست کالج سے ساتھ آتے تھے، اور وہ پہروں پھاٹک پر کھڑا ان سے باتیں کرتا تھا۔ پھر جو خالہ فیروزہ نے روک ٹوک کی تو وہ باہر جانے لگا اور دوسروں کے پھاٹکوں کے آگے کھڑا رہنے لگا۔ اس سے دوسری قباحتیں نکلیں۔ ان قباحتوں کی بھنک گو ابھی تک خالو جمال تک نہ پہنچی تھی لیکن اندر ہی اندر سڑے سیب کی مانند خالہ فیروزہ کا دل پک گیا تھا۔

رشیدہ ہاتھوں میں کتابیں لیے، رومال میں ان پیسوں کو گرہ دیتی آئی جو اسے بس سے اترتے وقت کنڈکٹر نے دیے تھے۔

"سلام خالوجان . . . سلام خالہ جی . . ."

"وعلیکم سلام ۔ داخلہ مل گیا . . ." خالو نے پوچھا۔

"جی ۔"

"کتنے لڑکے لڑکیاں ہیں کلاس میں؟"

"انیس لڑکے ہیں جی اور چھ لڑکیاں ۔"

"دل لگ گیا تمہارا؟"

"جی ۔" اس نے یکدم مینڈک کی طرح اچھلتے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کھانا کھالو اندر جاکر رشو ۔ رمضان کہاں ہے الوزی ۔"

"وہ مرن جوگا تو کسی بنواڑی کی دوکان پر کھڑا ریڈیو سن رہا ہوگا ۔" الوزی نے منہ بنا کر کہا ۔ "آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے جی ۔"

"نعمت خانے میں کھانا پڑا ہے رشیدہ ۔ یہ الوزی ذرا میرے سر میں تیل لگا رہی ہے ۔ رات سے سر پھٹا جا رہا ہے ۔"

"کوئی بات نہیں خالہ جی . . . میں آپ ہی کھالوں گی ۔"

جب رشو کھانا کھانے چلی تو اسے شدید بھوک لگی تھی، لیکن جب وہ نعمت خانے تک پہنچی اور سلور کی کٹوری میں ٹھنڈا اروی گوشت اور تام چینی کی تھالی میں

سیاہ چھتی لگی موٹی موٹی روٹیاں دیکھیں تو نہ جانے کیوں حلق بند ہونے لگا۔ اور ایک ایک لقمہ بمشکل تمام اترنے لگا۔

بہاولپور میں جب وہ کالج سے لوٹتی تو انگیٹھی پر سالن کی دیگچی دھری نظر آتی۔ توا چولہے پر ہوتا۔ ادھر ڈیوڑھی میں اس کا قدم پڑتا اور ادھر امی لچی جیسی نرم نرم روٹی پکا کر چھابے میں دھرتیں۔۔۔ نجانے رشو کی آنکھوں میں کیوں اتنے سارے آنسو آ گئے۔

خالد ضرور سرخ صافی میں اکنی کی برف لایا ہوگا۔ زری اور راشدہ نے سکول کے یونیفارم اتار کر چھینٹ کی قمیصیں پہن لی ہونگی۔ منہ ہاتھ اور پیر دھو کر چھوٹے چھوٹے ربڑ کے سلیپر پہنے ہونگے۔ وہ امی کے پاس چھوٹے چھوٹے مونڈھوں پر بیٹھی ہونگی، آج پھر روغنی ہنڈی پر ان کی جھڑپ ہوئی ہوگی۔ اور خالد ڈرائینگ کی کاپی اور رنگین پنسلوں کا تقاضا کر رہا ہوگا۔

رشو نے بمشکل تمام ایک روٹی کھائی اور پھر چوروں کی طرح گیلری میں سے گزر کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے غسلخانے کا دروازہ بند تھا اور ریاض پلک جھپک نہانے میں مصروف تھا۔

رشو نے آنکھیں موند لیں اور پلنگ پر دراز ہو گئی۔ نانی اماں کی یاد نہ جانے کیوں سر سے آنے لگی۔ نانی ماں کہا کرتی تھیں کہ جب ان کی شادی ہوئی تو وہ بیاہ کر محمود دلی گئی تھیں۔ جس مکان میں وہ اتریں، وہ دراصل ایک احاطہ تھا۔ ادھر ادھر پانچ گھر تھے، آنگن سب کا ساجھا تھا، گرمیوں میں سب کے چولہے باہر جلتے، سب کے

بچے اکٹھے کھیلتے، کھیلتے، جھگڑتے، اور پھر آپ ہی من جاتے، کبھی کسی ماں نے اپنے بچے کی طرفداری نہ کی تھی۔ بچے سب کے آنگن کی طرح سانجھے تھے۔ اسی لئے زندگی بلبل کی طرح ہر وقت چہکتی رہتی تھی۔

اندر گھروں میں ماسی جیونی کا گھر سب سے الگ تھلگ تھا۔ وہ جب بھی آنگن میں آکر بیٹھتی چارپائی کھڑی کر کے سب سے اوٹ کر لیتی۔ ماسی جیونی بڑی خاموش، وضع دار، اور رکھ رکھاؤ کی عورت تھی۔ ضرور کسی اچھے گھر کی بیٹی تھی، لیکن چاچا دارا نے چکلی اکھاڑ کر جو اس گھر میں لگا دی تو پھر ماسی جیونی پر ہری ہری کونپلیں نہ نکلیں۔ ناشگوفے نہ پھوٹے ویسے تو چار بچے بھی تھے لیکن جیسے چقماق بھیگ چکا ہو۔ بھرے گھر کے باوجود ان کے لب ہنسی کی چنگاریاں نہ چھوڑتے، اسی بجھے پن نے آنگن سانجھا ہونے کے باوجود ماسی جیونی اور باقی احاطے والوں کے درمیان ایک ردِ ربار بنا رکھی تھی۔

بڑی مصیبتوں سے یہ پاٹ پاٹ کر جب نانی ماں جیونی ماسی کے دل تک پہنچیں تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ سادر پہنچ گئی ہیں۔ یہ تو کائنات ہی اور تھی، چاچا دارا کام کاج کا کوڑھی تھا۔ جو رقبہ باپ دادا سے وراثت میں ملا تھا اسو رہن تھا۔ جانے کہاں کاروبار کرتا تھا۔ لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ کبھی کبھی وہ کمینوں کے تھیلے میں خورد و نوش کا سامان لے آتا تو ماسی جیونی تمام چینی کی تھالیوں میں سوغاتیں سجا سجا کر انہیں ریشمی رومالوں سے ڈھانپتی اور پھر انہیں بچوں کے ہاتھ میں تھما کر نام بنام سب کے گھر بھجواتی۔

ویسے تو ماسی جیونی سے چاچا دارا کی کوردبتی تھی۔ لیکن نہ اس قدر کہ یہ خوف انہیں کسی ڈھنگ کے کام پر مستعد ہونے کو ابھارتا۔ محلے کے بزرگ سمجھاتے تو چاچا کہتا۔

"سب کو وہی مالک دیتا ہے . . . پانی میں مچھلی کو، پتھر میں کیڑے کو، ہوا میں پرندے کو . . . سب کو وہی پروردگار ہے۔ دارے کو کیا بھول جائے گا؟ جب دانت نہ تھے تب دودھ دیا۔ جب دانت دیئے تو کیا اَن نہ دے گا؟"

چاچا کی ایسی باتوں کے سامنے ناصح حضرت کا منہ تک جاتا۔ اور وہ نہایت بے اعتقاد، بھڑ دلا، اور بے توکل نظر آنے لگتا۔ رفتہ رفتہ احاطے والے چاچا ہی کے توکل پر ایمان لے آتے۔ یہ اور بات تھی کہ گرمیوں میں جب سارے چولہے آنگن میں جلنے لگتے تو ماسی جیونی کی جان پر بن آتی۔ شام کو جب من چھیٹوں کی آگ چٹاخ پٹاخ شعلے چھوڑتی سارے آنگن میں گرم تھاپیوں کی گوبریلی خوشبو اٹھتی تو ماسی جیونی بھی چارپائی کھڑی کر کے چولہے کے پاس آ بیٹھتی۔ اُسکے بگھار میں سے کچھ ایسی اشتہاانگیز خوشبو اٹھا کرتی تھی کہ حمل والیوں کا جی فوراً کھٹی میٹھی چیزوں کے لئے پھڑک اٹھتا۔

ایک روز نانی اماں اسی بگھار کی خوشبو پر اٹھیں اور سیدھی ماسی جیونی کے چولہے کے پاس جا پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ یہ آٹا بڑا دیگچہ اپلوں پر سوں سوں کر رہا تھا۔

نانی ماں نے ماسی سے پوچھا۔

"ماسی آج کیا چڑھا رکھا ہے۔ تیرے لادن سے تو کھائے پر بھی بھوک لگ آتی

ہے ۔پیٹ والے بھی مانگنے لگتے ہیں۔"

ماسی جیونی بولی۔

"کچھ بھی تو نہیں، بچے کتنے دنوں سے کھچڑی کے لئے ضد کر رہے تھے، سو اسی کا بگھار دیا ہے ابھی۔ . . . مہراں کو بہت شوق ہے کھچڑی کا۔"

"کھچڑی کا ہے کی ماسی . . . مسر کی کہ مونگی کی؟"

"کل ہی تازہ موٹھ لائے تھے . . . سو وہی ڈالے ہیں۔"

نانی ماں کا کہنا تھا کہ اسی لئے اتی کو موٹھ کی کھچڑی اس قدر پسند ہے کیونکہ اس روز ان تک ماسی جیونی کا بگھار جا پہنچا تھا۔

نانی ماں اور ماسی جیونی کی باتیں کہیں مہراں نے سن لیں۔ کہاں تو ماسی جیونی تھی کہ اپنے گھر کی باتیں خود اپنے آپ سے نہ کہتی تھی اور کہاں انکی بیٹی مہراں تھی کہ قاصد کبوتر کی طرح ہر گھر کی بات لے اڑتی۔ الٹی مست کی لڑکی کھچڑی کا سن کر بھاگی بھاگی نختی میراثن کے ہاں جا پہنچی۔ نختی ہر جمعرات کو احاطے میں روٹی لینے آیا کرتی تھی، احاطے والے سبھی اس پر ترس کھاتے تھے۔ لیکن ماسی جیونی کا تو معمول تھا کہ ہر جمعرات کو اندھی میراثن کے لئے ضرور ایک آدھ روٹی ٹکا چھوڑتی۔ مہراں نے جانے جا کر کیا جڑا کہ بڑا سا سلور کا ٹیڑھا میڑھا کٹورا اٹھا، لاٹھی ٹیکتی، بڑبڑاتی ہانپتی نختی بھی آ پہنچی۔

یہ پہلا دن تھا کہ جیونی کے ہاتھ سے صبر کا پیمانہ چھوٹ گیا۔ پہلے تو اندر لے جا کر مہراں کی کمر میں دو چار دھموکے دیئے، پسلی میں ٹکیاں رسید کیں، پھر ٹی پر سر رکھ کر

یوں رونے لگی جیسے کوئی مرگیا ہو۔ بڑی دیر ماسی جیونی کا تماشہ نانی ماں کھڑی دیکھتی رہیں۔ جب آنسوؤں کی باڑھ رکی اور ہچکیوں کا تار بندھا تو نانی ماں نے نہایت منت سماجت سے اس قہرمانی کی وجہ پوچھی۔ پہلے تو جیونی ٹالتی رہی پھر بولی۔

"دیکھتی نہیں ہو نھتی باہر دیگچے کے پاس بیٹھی ہے۔"

"نھتی" ؟ . . . پھر کیا ہوا ماسی ؟"

"تو اس کو کیا دوں ؟ اپنا کلیجہ ؟ اسکے کٹورے میں کھجور کی گھٹلیاں کیسے ڈالوں جو اس دیگچے میں پک رہی ہیں۔ گھٹلیوں بھرا دیگچہ چھچڑی بننے سے تو رہا۔"

ابا جان کی وفات پر جب نت نئی تکلیفات ان پر آنے لگیں تو نانی جان ماسی جیونی کی باتیں سنا سنا کر انہیں دم دلاسہ دیا کرتی تھیں۔

رشیدہ کو آج نہ جانے کیوں ماسی جیونی یاد آرہی تھی جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

. . . .

جس روز پکنک تھی، اس روز صبح سے رشیدہ کا دل بجنے لگا تھا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ خالہ فیروزہ سے اجازت طلب کرتی۔ اور نہ ہی اتنی سکت تھی کہ کلاس میں جانے سے انکار کر دیتی۔ اب بیٹھی سوچتی تھی کہ کالج جائے کہ گھر بیٹھی رہے۔ اسی گوگو کے عالم میں کبھی اس نے بالوں کو چوٹی بنایا اور کبھی چوٹی کھول کر جوڑا باندھا۔ لیکن ہر بار جب وہ آئینہ دیکھتی تو دل بجھ سا جاتا۔ اپنے لمبے لمبے کان بے حد بدوضع

نظر آتے۔ ان کالوں کا کوئی کیا کرے؟ مہاتما گاندھی کے کالوں کی طرح، ادھ کھلے

کواڑ کی مانند چہرے سے پرے پرے، کھڑے تک رہے ہیں۔ یہ بھی خیال جی کو کھائے

جا رہا تھا کہ ادھر کالج کی ساتھنیں ایسا سنگھار کر کے آئیں گی جو بظاہر تو کاٹن کی قمیص

اور پھولدار نائیلون جالی پر مشتمل ہوگا، لیکن تراش خراش کے اعتبار سے یہ لباس

(ساحاھ) کی تخلیق نظر آئے گا۔

کھوکھی سے انوری نظر آ رہی تھی۔ اس نے آج تنویر کی بہت ہی چست قمیص

پہن رکھی تھی۔ کمیبری ساٹن کی قمیص جس کی کمر پر لمبی سی زپ آدھی کھلی تھی۔ اور اس

ادھ کھلے چھروکے میں سے گندھے ہوئے آٹے جیسی سفید جلد نظر آ رہی تھی۔ وہ

لمبی تار پر کپڑے نچوڑ نچوڑ کر ڈال رہی تھی۔ اور ساتھ ہی کچھ گنگناتی جاتی تھی۔۔۔

رمضان مرغیوں کے ڈربے کے پاس باسی روٹیوں کے کھیلوندے لئے بیٹھا

تھا اور ان کے چھوٹے چھوٹے بھورے کر کے مرغیوں کو دیئے جاتا تھا۔ ہر بار جب

انوری کپڑا جھٹکتی اور پانی کی بوندیں اس پر پڑتیں تو وہ منہ بنا کر کہتا۔

"اوں ہوں۔۔۔ ادھر کو کپڑے جھاڑ، ضرور میری طرف ہی بارش کرے گی"

جب انوری اس کی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پھر سے سلفچی میں سے کپڑا

نکالتی، گنگناتی، اور اسے جھٹکتی تو رمضان وہیں سے چیرواہے کی ہانک لگاتا، اور

ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹتا۔ اس کھیل سے جیسے دونوں محظوظ ہو رہے تھے۔ گفتگو

کا ایک ایسا سلسلہ جاری تھا جس میں کوئی فل سٹاپ تھا ہی نہیں۔

بالوں میں کان چھپا کر رشو نے اپنا برقعہ اٹھایا اور چھوٹی سی زپ لگی پلاسٹک کی تھیلی لیکر
اس میں کچھ پیسے ڈالے، اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

ارے باجی! برقعہ پہن کر پکنک پر جائیں گی آپ؟.. "تنویر غسل خانے کی طرف جاتے
ہوئے رک گئی۔

"میں تو کالج صرف اطلاع دینے جا رہی ہوں۔"

"کیسی اطلاع باجی۔"

"میں پکنک پر نہیں جا سکتی۔"

"ہائے وہ کیوں باجی!" نائٹ سوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تنویر نے سوال کیا۔

"میں رات کو خالہ جان سے اجازت نہیں لے سکی۔ اس لئے۔"

تنویر ہنسنے لگی۔

اُس کے کٹے ہوئے بالوں میں بندھے ہوئے ربن، گلابی رنگ کا نائٹ سوٹ، پیروں
میں پڑی ہوئی چکوالی جوتیاں . . . سب اس کے موڈ میں شریک ہو گئیں۔

"اللہ! خالہ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ باجی! اگر بھول گئی تھیں تو شام کو بتا دیجیے
گا انہیں۔ ہم تو اسی طرح کرتے ہیں۔"

"اچھا؟"

"اور کیا؟ اب کالج کی اتنی فنکشنز ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی بھول بھی جاتا ہے ان سے پوچھنا
شام کو بتا دیتے ہیں انہیں، آپ ضرور جائیے باجی! کس کی فیر ول ہے؟"

"پر دفیسر ضیاء کی۔"

"اللہ! یہ برقع تو پہن کر نہ جایئے باجی جان۔ خدا قسم اس سے تو بہتر ہے کہ آپ چادر اوڑھ لیں، سفید ریشمی لٹھے کی . . . اس کا بھی بہت فیشن ہے آجکل۔ میں لاؤں اپنی چادر . . . ؟"

رشیدہ کا جو اسی جگہ رکی رہی تو یہ کچھ لٹھے کی چادر کے لیے نہ تھا۔ وہ تو کھڑی سوچ رہی تھی کہ خالہ جان سے اجازت لیے بغیر پکنک پر جانا درست بھی ہے کہ نہیں؟ بہاولپور میں چاہے کنوکیشن ہو چاہے سالانہ اجلاس، ہفتہ بھر پہلے امی کی خوشامد کرنا پڑتی تھی۔

وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ تنویر چادر لے آئی۔

"اس لٹھے کی چادر کا بہت رواج ہے لاہور میں باجی! جو خاندان ذرا پہلے برقعے کے زیادہ پابند تھے۔ انہوں نے برقعے اتارے تو یکدم منہ سر ننگے باہر جانے کا حوصلہ نہیں پڑا یہ چادر اسی لیے بڑی مفید رہی . . . . بڑا سہارا رہا خاندانی عورتوں کو اس کا۔"

رشیدہ نے پوچھنا چاہا کہ یہ برقع اتارنے کی آخر وجہ کیا تھی لیکن تنویر کچھ ایسی روانی میں تھی کہ سوال کی بچر پھنسانے کی مہلت نہ ملی۔

"ویسے بھی باجی جو لڑکیاں لٹھے کی چادر پہن کر آتی ہیں کالج میں۔ وہ اچھے گھرانوں کی سمجھی جاتی ہیں۔ خدا قسم اتاریے یہ برقعہ۔ اولڈ فیشن چیز . . . یا تو انسان پورا فیشن کرے یا چادر اوڑھے بس۔"

دس بجنے میں قریباً دس منٹ تھے۔ سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے لڑکیاں

شالا مار پہنچے۔ لڑکیوں میں سے کوئی بھی غیر حاضر نہ تھی۔ چھ لڑکے البتہ کم تھے۔

لڑکیوں کی ٹولی میں سے ڈمپل سب سے پیاری اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس نے سلیک نما شلوار جس کے پائنچوں میں ٹچ بٹن لگے تھے پہن رکھی تھی۔ قمیص میں دونوں جانب چاک نہ تھے ہمپرین سے نیچے پچھلی جانب البتہ ایک وہ ٹنک ڈالکر چلنے کی سہولت کو ذرا اکھیرا کھولا ہوا تھا۔ کمر پر عین کولہوں کے اوپر فٹ بھر زپ تھی۔ سلیٹی رنگ کی اس قمیص کی نہ تو آستین تھیں نہ ہینگر پر ٹنگی ہوتی یہ قمیص ہی لگتی ہو گی۔ اس لباس میں ڈمپل اس طرح چل رہی تھی جیسے بورژوا چینی عورتیں۔ بیرون چین کی عورتوں کو چینی مشاطائیں اسطرح پر باندھا کرتی تھیں کہ تمام انگلیاں اندر کی جانب موڑ کر صرف انگوٹھے کو باہر رہنے دیا جاتا۔ اب انگوٹھا کبوتری کے سر سے مشابہ اور باقی پاؤں کبوتری کے دھڑ جیسا نکل آتا۔ سنا ہے جب چین میں فیوڈل نظام تھا تو وہاں کے مرد فیٹشزم کے مریض تھے۔ عورتوں کے پیروں سے ان کا جنسی تعلق اتنا گہرا تھا کہ کئی بار صرف پیر دکھا کر ہی رشتہ طے کر لیا جاتا۔

کبوتری وضع کے پیر گو چلنے میں مزاحمت کرتے تھے۔ لیکن ان کبوتروں کے سہارے چلتی عورتوں کی چال میں ایک ایسی نزاکت پیدا ہو جاتی تھی جس سے چینی مردوں کی جمالیاتی حس کو بڑا اسہارا ملتا۔

ساری پارٹی پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔ سب سے آگے ڈاکٹر اعجاز، پروفیسر ضیا اور پروفیسر بیگ تھے۔ ان کے دائیں بائیں ڈمپل اور طیبہ چل رہی تھیں۔ انکے

بعد باقی پانچ لڑکیوں کی ٹکڑی تھی۔ حافظ نے آج بالکل ایک سے کپڑے پہن رکھے تھے،
لڑکیوں کے بعد غازی اور ظفر کا ٹولا تھا۔ اور زیادہ سامان ان ہی کے کندھوں پر تھا۔
ساری ٹولی میانہ محل میں پہنچ چکی تھی۔ پروفیسر اعجاز اس جگہ کھڑے تھے کہ جہاں
سنگ مرمر کی "چادر" موجود ہے۔ اس آبشار کی لذت زیب النساء دختر عالمگیر کے دل پر
کندہ ہے۔ سنا ہے کہ وہ محل میانہ میں ہمیشہ آ کر بیٹھتی اور سیر آبشار دیکھا کرتی۔ چونکہ
"وہ حسن وجمال کی کیفیتیں دل پر بہت گذری تھیں۔ اس لئے ٹوٹتے موتیوں کو
پہروں دیکھتی اور جی ہی جی میں نہ جانے کتنے شعر کہتی۔ ایک رباعی جو ہم تک پہنچی ہے
وہ یہ ہے۔

اے آبشار نوحہ گراز بہر چیستی؟
چین برجبین فگندہ زاندوہ کیستی؟
آیا چہ درد بود کہ چون من تمام شب
سر را بسنگ میزدی و می گریستی؟

اتنے بڑے شہنشاہ کی بیٹی اور ایسی زخم خوردہ باتیں۔ کہتے ہیں کہ سارا جھگڑا
روٹی کا ہے۔ کھانے کو روٹی ملے تو پھر دکھ درد آپ ہی دور ہو جاتے ہیں۔
نہ جانے یہ کیا دکھ تھا جس نے زیب النساء کو سب کچھ ہوتے ہوئے سر دھن
اور گریستن میں مبتلا کر رکھا تھا۔
پروفیسر اعجاز کی پشت آبشار کی جانب تھی۔ اور وہ کہہ رہے تھے۔

"خوابوں میں ہمیشہ تمنائیں پوری ہوتی ہیں۔ ہمارا ایڈ دن کے وقت اگیو اور سپر اگیو کی نگرانی میں رہتا ہے۔ لیکن رات کے پڑتے ہی وہ رسیاں تڑوا کر اپنی تمنائیں پوری کرتا ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں میرا مطلب؟"

لڑکیوں کا گروہ جوان سے قریب تر تھا، اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"گو سپر اگیو اپنا تمام تر تسلط نیند میں بھی نہیں چھوڑتا۔ لیکن اِڈ بغیر سپر اگیو کو مجروح کئے اپنا تمناؤں کا بھیس بدل کر عموماً انہیں مجروح کرنے کی حد تک اپنی من چاہی مراد پاتا ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں پروفیسر ضیاء۔"

ضیاء صاحب نے آہستہ سے ہاں کہا۔ وہ اس وقت اپنے ٹکوں کے کارڈ، خارن ایکسچینج اور بی او اے سی کے ٹکٹ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ جو ابھی تک ان تک نہ پہنچا تھا۔

"خواب دیکھنے میں تو یہ مغل شہزادے سبھی حاتم تھے۔ لیکن شاہجہان کے خواب سنگِ مرمر کے بنے تھے۔ آپ جانتی ہیں نا کہ یہ عمارت شاہجہان نے بنوائی تھی"۔

لڑکیاں مسکرانے لگیں۔ بھلا اتنی سی بات کون نہیں جانتا؟

"شاید آپ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ باغ بھی ایک خواب کی تعبیر ہے۔ شاہجہان کے خواب کی تعبیر۔ ۔ آپ لوگ اگر چاہیں تو میں یہ خواب آپ کو سناؤں؟"

بسے بسویے کی صدائیں ہر طرف اٹھنے لگیں۔

"کہتے ہیں کہ ایک دن شاہ جہاں اپنے باپ کے مقبرے پر شب باش ہوا۔ ساری

رات باغِ دلکشا میں آرام سے گذری۔ صبح کے وقت کیا دیکھتا ہے کہ ایک ایسا باغیچہ نگاہوں کے سامنے ہے جس میں پانی اوپر والے درجے سے ہو کر درجۂ نشیب کو جاتا ہے۔ اور وہاں سے ہو کر پھر نیچے کو بڑھتا ہے۔ خواب میں کسی نے کہا کہ یہ باغِ ارم ہے سو جب آنکھ کھلی تو ارم کو زمین پر بنانے کا ارادہ کیا۔ اور کامیاب ہوا۔

پروفیسر بیگ جو انگلش لٹریچر پڑھاتے تھے۔ اور جنہیں اڈ۔ انگیو اور سپر انگیز سے زیادہ ہیملیٹ اور براؤننگ سے عشق تھا، جلدی سے انگریزی میں بولے۔

"علی مردان خاں زندہ نہ ہوتا تو شاہجہان کے سارے خواب طاق میں دھرے رہتے۔ ویسا صاحبِ کمال صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ نہروں کا وہ سلسلہ چلایا کہ ہند کے ریگ زار کو لہلہاتا سبزہ بنا دیا۔"

ظفر اور غازی کی ٹولی محلِ میانہ کے بغلی راستوں سے ہو کر باغِ حیات بخش میں پہنچ چکی تھی کہ جہاں مقام ساون بھادوں اور دو خوبصورت بارہ دریاں موجود ہیں پہلے یہ دونوں بارہ دریاں سنگِ مرمر کی تھیں۔ لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ان سے کچھ ایسا لگاؤ پیدا ہوا کہ یہاں سے اکھاڑ کر امرتسر کے رام باغ میں جا نصب کیں۔ اب یہ دونوں بارہ دریاں خشتی ہیں۔

ظفر اس تختِ سنگ پر پہنچا کہ جس کے چاروں طرف سنگ مرمر کا پنجرہ دار کٹہرا بنا ہے۔ اس تخت کو شاہجہان کی خاص یادگار سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ بحین حیات اسی پر اکثر اجلاس فرمایا کرتا تھا۔ تخت پر چڑھ کر ظفر نے کیمرے کا اپرچر فٹ کیا، اور میانہ

محل کی جانب لینز کو گھمایا، اور پروفیسر اعجاز کو آواز دی۔

"پروفیسر صاحب ذرا ادھر رخ کیجئے۔ آپ بھی پروفیسر ضیاء۔"

لڑکیوں نے کچھ ہٹ جانے کا بہانہ کیا۔ کچھ چہرے پھیرنے کے عمل میں مشغول ہوئیں

چیں بچیں چہرے اور نزاکت سے مڑی گردنیں اتنی تیز نہ تھیں کہ تصویر نہ اتر جاتی ظفر نے

تخت شاہجہانی سے ایک بھرپور پوری پانچ تصویریں اتاریں اور ایک ایک میں لسٹر کی چادر

اوڑھے رشیدہ موجود تھی۔

کھانا کھانے کے لئے باغ حیات بخش میں پڑاؤ ڈالا گیا۔ عین بائیں جانب جہاں چار

سرو کے درخت ایستادہ ہیں، ان کی چھاؤں میں دریاں ڈال کر ٹفن باسکٹیں کھولی گئیں

اس خورونوش کے سامان کے لئے ایک ہفتہ پہلے پانچ پانچ روپے چندہ لے کر ظفر

کے سپرد کئے گئے تھے۔ لڑکوں نے کھلم کھلا اور چیلنج کے طور پر کھانا کھایا۔ لڑکیوں نے

چھپ چھپ کر نظریں بچا بچا کر بظاہر اعتراض کرتے ہوئے۔ انکار کرتے ہوئے لڑکوں

کی نسبت دوگنی چیزیں ہضم کر دیں۔

ڈاکٹر اعجاز جو ذیابطیس کے مریض تھے، جیب سے سوئٹکس کی گولیاں نکال

رہے تھے۔

"ڈمپل میری چائے میں یہ گولیاں ڈال دینا۔۔۔ دو۔۔۔ تھینک یو۔"

ڈمپل نے سوئٹکس کی ڈبیا لے کر اپنے پرس میں رکھ لی۔ چائے کا وقت ابھی

دور تھا۔

"شفیا تم امریکہ کب پہنچ رہے ہو؟" ڈاکٹر اعجاز نے سوال کیا۔

"ابھی تو ٹکٹ بھی نہیں پہنچا سر!۔۔ لیکن خیال ہے دو دن بیروت میں رہونگا، وہاں میرے ایک انکل ہیں۔ وہاں سے لندن، دس دن لندن میں قیام ہوگا۔ وہاں سے ماسے چوسٹس۔۔"

"وہاں ڈاکٹر ایمبر روز سے تمہاری ملاقات ہوگی۔ میں تمہیں ایک خط لکھ دونگا تعارفی وہ تمہاری ہر طرح مدد کریں گے۔"

پروفیسر اعجاز سے تھوڑی دور غازی، رشید، ظفر اور افتخار بیٹھے تھے، ان کی پلیٹوں میں مرغ کی ہڈیاں، کالی مرچیں، ٹماٹر کے پرت اور کچھ آلو کنارے لگے تھے۔ وہ اس قدر کھا چکے تھے کہ اب لڑکیوں کی طرف دیکھنا یا چہل قدمی کے لئے اٹھنا بھی ممکن نہ رہا تھا، باقی لڑکے ٹکڑیوں میں بٹ کر، کچھ تالاب کی جانب اور کچھ نیچے بائیں باغ کی طرف جا چکے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد لڑکیاں مغلیہ حمام کی طرف چلدیں۔ روشش کے اوپر سے نیچے جھانک کر ڈمپل نے کہا۔

"اللہ! کس قدر مشکل ہے یہاں نہانا، نہ ٹب ہے نہ سنک۔۔۔ توبہ ان مغلوں نے اور تو سب کچھ کیا لیکن حمام دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ تہذیب سے کس قدر دور تھے۔"

ط جلدی سے بولی۔

"واہ ڈمپل واہ! یہاں ٹب اور سنک کی کیا ضرورت ہے، جہاں نہانے کو

فوّارے ہوں وہاں ٹبوں کے ساکت پانیوں کا کیا فائدہ ؟ . . "

بات مغلیہ حمام سے ترکی حمام اور ترکی حمام سے جاپانی غسل، اور جاپانی غسل سے ہندوؤں کی گڈوی پر اور گڑھی سے ہو کر، رہٹ کے چہ بچہ تک اور چہ بچہ سے سمندروں کے اردگرد چمکیلی ریت اور ریت پر بیٹھے ہوتے سورج کا غسل لیتے ہوئے جسموں تک پہنچی . . . رشیدہ صرف خاموش تھی، اور وسٹر کی چادر سر پر لیے چپ چاپ، نیچے تکے جا رہی تھی۔ اس حمام نے تو جیسے اسے مبہوت کر دیا تھا۔

یہ حمام کہ شاہجہاں بادشاہ کے ذوق کی کھلی دلیل ہے۔ سنگ مرمر کا تین درجہ حمام کہ جہاں پانی گرنے کی آواز، بطور بارش باراں مسموع ہوتی ہے۔ طاقچہ ہائے محرابی خرد خرد یہاں اس نزاکت اور خوبی سے بنے ہیں کہ جب یہاں چراغاں کر کے مغلیہ شہزادیاں غسل فرماتی ہونگی تو شعاع چراغاں بطور برق اور پانی بارش سے مماثل نظر آتا ہوگا۔ بیچ میں پانچ فوّارے کہ پانی جنکا خزانہ آب سرد سے۔ مہتابی کی طرح چھوٹتے ہیں۔ اس حمام کے سامنے جو غلام گردش ہے کہتے ہیں کہ اس میں کنیزیں پھولوں کے طشت لیے۔ دیبا، کم خواب اور ریشم کے لباس کندھوں پر رکھے۔ حمام کی جانب گل افشانی کرتی تھیں۔ حمام کے اوپر کہ جہاں سے اب نیچے حمام کھلا نظر آتا ہے۔ سیاہ بانات جیسے جسموں والی سیاہ چشم اردابیگنیاں آہو کا کندھوں پر آبدار تلواریں دھرے پہرہ دیتی تھیں کہ کسی کی نظر بھٹک کر اس جانب نہ جائے۔ عماریوں میں لد لد کر لباس آتے تھے۔ تالاب کے چار رویہ قطاروں میں کنیزیں دست بستہ کھڑی ہاتھوں ہاتھ ان کو دیتی تھیں۔ گل پاش اور عطر بیز پانیوں میں نہاتی شہزادیوں تک جب

یہ لباس پہنتے، ان کو سینکڑوں ہاتھ مس کر چکے ہوتے، ہزاروں حریصانہ نظریں ان کے آر پار ہو چکی ہوتیں۔ وہ نظریں جو براہِ راست شہزادیوں کے صندلی جسموں تک نہ پہنچ سکتی تھیں یوں کپڑوں میں ملفوف ان تک جا پہنچتیں۔

شام کے سائے جب شالامار تک پہنچے، تو فضا میں عجیب قسم کی سردی، خوشبو اور سائے بڑھنے لگے۔ دن کی روشنی میں جو باغ کھلتا گل داؤدی کا پھول تھا۔ اب زرد رو کرگس کی طرح نظر آ رہا تھا۔ حیات بخش باغ کی وہ دیوار جو محل میانہ سے منسلک تھی اور جس میں دو بغلی دروازے اوپر محل میانہ تک پہنچتے تھے۔ شام کی سیاہی میں یہ پتھر یہ سرخ پتھر اس تہہ خانے سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ جہاں شاہجہان نے اورنگ زیب کے ہاتھوں تخت کھو کر دن بسر کئے تھے۔ سرو دن کے وقت سنجیدہ، شام کے وقت پراسرار اور رات کو ہیبت ناک ہو جاتا ہے۔

اس طرف جہاں دریا بہتی ہے۔ اور اب ایک کینٹین بن چکی ہے۔ ظفر اور نمازی نے پہنچ کر چائے کا آرڈر دیا۔ لواڑی کرسیوں پر سیر کے شوقین بیٹھے کوکا کولا پی رہے تھے۔ چائے کے ہاف سیٹوں کے ساتھ باسی کیک اور پلستر اکھڑی پیسٹریاں چلی آ رہی تھیں۔ نگار خانہ میں پاسچرائزڈ دودھ کی بوتلیں، کوکا کولا کے کریٹ، چائے کی پتیوں کے خالی ڈبے، باسی کیک اور کام کرنے والوں کی سائیکلیں پڑی تھیں... کہتے ہیں کہ یہاں ایک انگریز سیاح نے قیام کیا تھا۔ نگار خانے کی چھت پر جب وہ مچھروں کے خوف سے مسہری لگا کر اور برائیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے

سرہانے پستول رکھ کر سوتا تھا تو اس کے خوابوں میں میانہ محل میں بال روم ڈانسنگ ہوتی تھی۔ اور وہ مغل لباس پہنے روش پر ٹہلتا پھرتا تھا۔

دو گولیاں سوئیکس ڈال کر ڈمپل نے چائے کی پیالی ڈاکٹر اعجاز کو پیش کی۔ سارے میں صرف برتنوں کا شور تھا۔

ظفر نے پیسٹری کی تھالی رشیدہ کی جانب بڑھا کر آہستہ سے کہا۔

"لیجئے۔ آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔"

رشّو نے پلکیں اٹھائیں۔ یہ نظر بالائی کی طرح ملائم اور شہد کی طرح میٹھی تھی۔ اس نے آہستہ سے پیسٹری کا ٹکڑا اٹھایا۔ لمحہ بھر کو دونوں کی نظروں نے دست پنجہ ملایا، پھر شرقی اور غربی پھاٹکوں کی جانب مڑ گئیں۔

شالامار باغ کے تین تختے حمام کے تین درجے۔ ساون بھادوں اور میانہ محل کی چید سے کہیں زیادہ خوبصورت ظفر کو وہ آنکھیں لگیں، جو لمحہ بھر کو اٹھیں اور پھر پلکوں کا نقاب اوڑھے رخساروں سے پیوست ہو گئیں۔

ہر لڑکی نے چاہے وہ آدھی چمچ چینی پیتی تھی چاہے دو چمچ، چائے میں چینی ڈالنے سے انکار کیا، ان کی دیکھا دیکھی رشیدہ نے بھی چائے میں چینی نہ ملائی۔ پہلا گھونٹ ہی حلق میں گیا تھا کہ ابکائی آگئی۔ ایسا بے مزہ آب جوش اور وہ بھی پتنا پتنا اس نے آج تک نہ چکھا تھا۔ پیالی کو پرے سرکا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ معاً اس کی نظر سامنے گئی۔ ظفر تالاب والے چبوترے پر ٹانگیں لٹکائے کیمرے کا رخ اس کی طرف

کیے بیٹھا تھا۔ رشیدہ نے اٹھ جانا چاہا بھاگ جانا چاہا، لیکن چاہنے اور بھاگنے میں

جو وقفہ تھا، اس میں تصویر اتر چکی تھی۔

ظفر نے نظروں ہی نظروں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ کیمرے کو کندھے پر لٹکایا اور

خشتی بارہ دری کی طرف چلا گیا۔

جب ظفر پکنک کے بعد گھر پہنچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کندھے

پر کونین کی دولت لٹک رہی ہے۔ پہلی بار اس کا جی نہ چاہتا تھا کہ کیمرے میں سے

سپول نکال کر کسی سٹوڈیو کے حوالے کرے۔ اور نیگیٹو دھلائے۔ پھر جی میں یہ تمنا بڑی

جان لیوا ابھر رہی تھی کہ کسی طرح تصویریں فوراً دھل جائیں اور وہ لٹھے کی چادر میں لپٹی

لڑکی کو دیکھ سکے۔ . . . وہ باقی لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی؛ سٹین لس سٹیل کے

برتنوں میں بہاولپوری کوزہ . . . . کانچ جیسا نازک، چینی آرٹ کی طرح دلآویز

اور ہڑپے کی تہذیب کی طرح پر اسرار . . . .

وہ گھر پہنچا تو ہمیشہ کی طرح گھر پر میلے کی سی ہڑبونگ چھائی تھی۔ یہ ایک بڑی برادری

کا سردار خاندان تھا۔ آنگن میں اماں کھری چارپائی پر بیٹھی پرات بھر پیاز کاٹ رہی تھیں؛

پاس ہی دو چار تائیاں، ممانیاں، نانیاں، چھوٹی توپ جیسے جسموں والی، سفید دوپٹے

اور سفید شلواریں پہنے بیٹھی تھیں۔

یہ عورتیں کسی زمانے میں گوری چٹی جوان، اور فتنہ ساز ہوں گی، اب فقط یہ

ٹیپ ریکارڈر تھیں۔ اور ان پر جوان لڑکیوں کی بے حیائی، زچہ بچہ کے قصے،

موجودہ پود کی بے سروپا باتیں، غیر موجود عورتوں کی بدگوئیاں، اپنے بچوں کے لئے انھوں نے جو قربانیاں دیں اور کس طرح وہ طوطا چشم واقع ہوتے۔ ان کی تفصیلات کے ٹیپ چڑھے تھے۔

"اتنی دیر لگادی پکنک پر؟" ماں نے آنکھوں پر عینک درست کر کے پوچھا۔

"بس جی کچھ ہو گئی۔۔۔"

"خالہ حمیرا کو سلام نہیں کیا۔ شملے میں ان کا ہمارا مکان ساتھ ساتھ ہوتا تھا"۔

"ادھر تو آ۔۔۔ کون ہے؟۔ منظر؟"

"نہیں حمیرا۔ ظفر ہے۔۔۔" ماں نے جلدی سے غلطی دور کی۔

"اچھا، اچھا۔۔۔ تب تو یہ گود میں تھا جب دیکھو اسے دست ہی لگے رہتے تھے۔ اوپر سے شملے کی ٹھنڈ۔ بہن جی کا تو سارا دن پوتڑے دھوتے نکلتا۔ ادھر آ۔۔"

ظفر نے اس وقت جب کہ وہ مس یونیورس سے مل کر آرہا تھا۔ اپنے دستوں کا ذکر سن کر وہ بوکھلا گیا۔

"پاس جاؤ۔۔ خالہ سے ملو۔۔ کیا بیوقوف لڑکے ہیں آج کل کے۔۔ چلو۔۔"

خالہ حمیرا نے ظفر کو اپنے آپ سے لپٹا لیا جیلی کے تودے سے لپٹ

کر ظفر کو عجب کراہت سی آئی۔ خالہ کے منہ سے روزہ داروں کی سی بو کا بھبھوکا نکلا۔ اتنی ساری دعاؤں کو اس خوشبو میں لپیٹ کر انہوں نے ظفر کی نذر کیا کہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ اس میں باقی نہ رہا۔

جلدی سے سب کو سلام کر کے وہ اندر کی طرف چلا۔ عجب مصیبت تھی اپنے اس گھر میں گھستے ہی ہر روز اسے اسی نوعیت کی عورتوں سے بغل گیر ہونا پڑتا تھا۔ ادھر جوان لڑکیاں جوان معمر عورتوں کے ساتھ آتی تھیں۔ ان کا رویہ بھی طرفہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی پر پھڑ پھڑاتی فاختائیں سی اڑنے لگتیں۔ بڑے پراسرار قہقہے بلند ہوتے۔ کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔ ظفر کی تو جان پر بن جاتی۔

ڈرائینگ روم میں حسب معمول بھانجیوں، بھتیجیوں، نواسیوں، پوتیوں کا انبار لگا تھا۔ کہیں کہیں نمک کے طور پر کوئی بھانجا بھتیجا بھی صوفے میں دبکا بیٹھا تھا۔ بہر کیف ہمیشہ کی طرح اس کمرے میں عموماً نوجوان لڑکیوں کا مکمل راج تھا۔ لتا کا گیت ریڈیو پر بج رہا تھا۔۔ اور ایک کیف صورت لڑکی اپنے آپ کو اس وقت شہزادی مہ پارہ سمجھ رہی تھی۔

لتا آہیں بھر رہی تھی۔ انتظار کر رہی تھی۔ گھر جانے کے لئے کلائی چھڑا رہی تھی۔ اور کلائی چھٹ جانے کے باوجود بڑی شوخ چشمی سے جمی کھڑی تھی۔ وہ پوکھر کے پاس پانیوں میں کنکر پھینکتی انتظار کر رہی تھی۔ اس کا انگ انگ محبت میں سرشار تھا۔۔۔ وہ ازلی اور ابدی عورت کا روپ دھارے صرف محبت کئے جا رہی تھی۔۔۔ اس کی زندگی

میں صرف ایک لفظ تھا۔ ۔ ۔ ایک فعل تھا۔ ۔ ۔ ایک اسرار تھا۔ ۔ ۔ اور وہ تھی محبت! اس کا جسم، اسکی شخصیت، اس کی باتیں سب اسی ایک بات میں ڈھلی تھیں۔ اور یہ محبت اس کی آواز کے محدب شیشے سے گذر کر کئی لاکھ گنا بڑی ہو کر لڑکیوں تک پہنچ رہی تھی۔

لڑکیاں ان نغموں میں سرشار ہو کر سیراب عورتوں کی طرح محسوس کر رہی تھیں، نوخیز لڑکیاں (جنکا جسم ابھی ان جانے جی سے اپنی تبدیلیوں کو قبول کرنے میں مصروف تھا) شاداب لڑکیوں کی طرح آشفتہ سر ہونے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

لتا کی آواز نے ایک عجیب کام کر دکھایا تھا۔ یہ ایک ایسا انکیوبیٹر تھا جس میں انڈا اڈالتے ہی چھٹی مرغی تیار ہو جاتی ہے۔ لڑکیوں کو بس لتا کا نغمہ درکار تھا۔ اور اپنا وجود ۔ ۔ ۔ وہ اندر ہی اندر نوجوان لڑکوں سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے محبت کر رہی تھیں محبت سے محبت کر رہی تھیں۔ ۔ محبت کے عکس سے محبت کر رہی تھیں۔

لتا کے انکیوبیٹر میں جوان کی ہوئی ان گنت لڑکیوں سے گھر اٹا پڑا تھا۔

ظفر کو جھرجھری سی آگئی۔ ان ہی لڑکیوں میں کہیں کوئی اس کی دلہن بھی تھی۔

وہ اوپر والی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ سیڑھیوں کے موڑ پر مظفر بھائی مل گئے وہ مال پر امپورٹڈ گڈز کی بڑی چمکیلی سی دکان کے مالک تھے۔

”کہاں رہتے ہو صاحب بہادر!“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”یہیں رہتا ہوں جی۔ ۔ ۔“

"ملاقات نہیں ہوئی آپ سے۔"

"آپ دوکان پر رہتے ہیں، میں کالج چلا جاتا ہوں۔ یہ مشکل ہے۔"

"ہاں یار! یہ مشکل ہے۔ . . . اچھا بھئی اتوار کو رکھیں گے کسی روز ہیں۔"

"ہاں جی، رکھیں گے جی . . . انشاء اللہ۔"

پکنک کا ہر لمحہ یاد کرتے ہوئے ظفر دوسری منزل پر پہنچا اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

دوسری منزل خاص الخاص شادی شدہ نوعمر عورتوں کے لیے مخصوص تھی۔ کمروں سے پوتڑوں کی باس اور کیوٹی کیورا پاوڈر کی ملی جلی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ غسل خانوں میں چھوٹے چھوٹے جانگھیے، فراکیں، بش شرٹیں اور پاجامے دُھل رہے تھے۔ غسل خانوں سے باہر پانچ برس سے کم عمر کے بچوں کے چھوٹے چھوٹے کموڈ پڑے تھے۔ کوڑے کے ٹین کے پاس، بسکٹوں کے ڈبے، پنسلیں، پلاسٹک کے ٹوٹے کھلونے، پرانی سائیکلیں اور ایسے انگنت گندے کپڑے لتّے پڑے تھے جن سے عورتوں نے فرش پر گرا ہوا پیشاب اور بچوں کا سفید سفید پاخانہ صاف کر رکھا تھا۔

یہ بالائی منزل گھر کی امیر ترین، اور گندی ترین منزل تھی۔ یہاں بکسوں میں طلائی زیور، نائیلون، زری کی قمیصیں، نقرئی برتن، ٹرانسسٹر، الیکٹرک شیونگ ریزر . . فرانسیسی سینٹ، بدیسی گھڑیاں، نقدی، اور انعامی بانڈ تہ در تہ بند تھے۔ پانچ شادی شدہ نوجوان عورتیں، بمع اپنے بچوں کے یہاں رہتی تھیں، مرد اس منزل کے

سونا بوڑنے میں کچھ اس درجہ مشغول تھے کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ اس منزل کی حالت سیاسی اکھاڑے کی سی ہے۔ ہر روز ایک نئی پارٹی بنتی ہے اور پچھلی پارٹی کے پول کھولتی ہے۔ اس منزل کی اپنی زندگی تھی۔ حسد کی زندگی، ساز باز کی زندگی، افواہوں کی زندگی۔ . .

"اللہ کہاں جا رہے ہو چوری چوری، ظفر؟" اظہر بھائی کی بیوی بولیں۔ وہ غسل خانے میں کھڑی مہاسوں پر کریم مل رہی تھیں۔

"بس جی۔ اپنے کمرے میں جا رہا ہوں جی۔ . ."

"ادھر آنے کی تو تم نے قسم کھا رکھی ہے۔" نگہت بھابھی اترا کر بولیں۔

"بس جی، پڑھائی میں وقت ہی نہیں ملتا۔ . ."

"میرے پاس بیٹھنے کو وقت نہیں ملتا، عذرا کے پاس پہروں گذارنے کا وقت ملتا ہے" وہ بُرا مان گئیں۔

"وہ تو عذرا بھابھی نے زبردستی پکڑ کر بٹھا لیا تھا جی۔ کل، کریلے گوشت کھلانے کو۔"

"پھر تو ہمیں بھی کریلے گوشت پکانے پڑیں گے۔"

"نہیں جی، میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ ویسے ہی۔"

"تمہاری مرضی ہے۔"

یک دم وہ پیٹھ موڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

ظفر پنجوں کے بل چلتا ہوا، تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ مظفر بھائی کی بیوی عذرا

سے منہ بھیڑ ہو گئی۔

وہ منّی کی پیٹھ دھو کر تُوری کی طرح لٹکائے چلی آ رہی تھیں۔ اتنی سی ورزش سے ان کا سانس اکھڑ چکا تھا۔ اور دودھ چڑھے سینے کا اتار چڑھاؤ بڑی دور سے نظر آتا تھا۔

"اللہ۔۔ بابا۔۔۔ ظفر۔۔ کہاں؟"

"جی اوپر جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔"

"منّی کو دست آ رہے ہیں۔ دوائی نہیں لا دے تے کوئی۔"

"کمیرہ رکھ آؤں جی اوپر۔۔۔ ابھی آیا۔۔۔"

اب تو وہ سرپٹ بھاگا کیونکہ اسے علم تھا کہ عذرا بھابی جن سے اس کے تین رشتے تھے، ان ہی رشتوں کے توسط سے کم از کم تین کام ضرور کروائیں گی۔ پہلے بچی کو دوائی لا کر پلانی ہو گی۔ بعد میں کچھ فرنیچر اٹھا کر اِدھر سے اُدھر رکھنا پڑے گا۔ اور اس کے بعد منّی کو لے کر اسوقت تک ٹہلانا پڑیگا، جب تک وہ سو نہیں جائیگی۔ اتنی چھوٹی سی جان آئن سٹائن کی نیند لے کر پیدا ہوئی تھی، دن میں کل تین ساڑھے تین گھنٹے سوتی، اور پھر گلہری کی طرح چاق و چوبند۔

تیسری منزل پر وہ اور ابا جی رہتے تھے۔ یہ منزل گو ہر لحاظ سے باقی گھر کے مقابلے میں گوشۂ عافیت تھی۔ لیکن یہاں کی قباحت اپنی تھی۔ اگر ابا جی گھر ہوتے یعنی وہ اپنے کمرے میں موجود ہوتے۔ تو شبیر جیسی سیدھی زندگی بسر کرنا پڑتی۔ جانگھیہ پہن کر دھوپ میں

لپٹنے کا ٹھاٹھ ختم ہو جاتا۔ بائی نوکیولر لگا کر نیچے آنے جانے والیوں کو نہ تاکا جا سکتا۔ ممنوع کتابیں پڑھنے کے امکانات کم ہو جاتے۔ سٹل لائف کی تصویریں بنانا ناممکن ہوتا۔

ابا جی کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور وہ مطالعے میں مستغرق نظر آتے تھے۔ ظفر نے گریہ پائی سے اپنے کمرے کا راستہ لیا، نہ جانے ابا جی نے اپنا راڈر کہاں فٹ کر رکھا تھا جسکو چاہتے اور جہاں چاہتے وہیں بلا لیتے۔

"ظفر؟"

"جی ابا جی۔۔۔"

"ذرا ادھر آنا۔"

وہ دم دبائے کتے کی طرح اندر چلا گیا۔

"دنیا کے مذاہب پر یہ بہت اچھی کتاب آئی ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں دلچسپی ہوگی اس میں۔۔"

ابا جی پینتالیس اور پچاس کے پیٹے میں تھے۔ اپنی بیوی کے بیٹے اور اپنے بڑے بیٹے مظفر کے چھوٹے بھائی لگتے تھے۔ سیدھا قد، منہ میں تمام دانت ذاتی، جسم دبلا پتلا۔ نہ ایسے سینک سلائی کہ کیکڑے سے لگیں، نہ موٹے کہ ہاتھی سے دکھائی دیں۔ بے انتہا متناسب جسم تھا۔ کپڑے ہمیشہ اسں دکان سے سلاتے تھے جہاں ملٹری والے اپنی وردیاں بنواتے ہیں۔ کپڑا بڑا اعلیٰ پہنتے۔ جوتے ہمیشہ دو رنگے، چینی موچیوں کی صناعی کے اعلیٰ نمونے، پائپ پیتے تھے، اور بات کرتے

وقت پائپ کا تمباکو پائپ کی کوکھ میں بھرتے رہتے تھے۔

ان کی دلی آرزو تھی کہ ان کی اولاد جو کہ چار لڑکوں اور تین لڑکیوں پر مشتمل تھی انہیں اپنا دوست سمجھے۔ بدقسمتی سے جسقدر وہ اس بات کے لیے کوشش کرتے تھے اسی قدر ان کی اولاد ان کی دوستی سے گریز کرتی تھی۔ وہ چاہتے کہ بچے ان سے اپنی اپنی مشکلات کا ذکر کریں اور وہ حسب توفیق دوست بنکر ان کی مشکلات کو رفع کریں۔ لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ ہر بچہ اپنا اپنا دکھ مشک نافے کی طرح اپنے اندر چھپائے پھرتا تھا، حتیٰ کہ بڑی بیٹی جو عرصہ پانچ ماہ سے گھر آئی بیٹھی تھی باپ کو یہ نہ بتا سکی کہ اس کے جستی ٹرنک میں ایک عدد طلاق نامہ بھی موجود ہے۔

"کیوں کیسی کتاب ہے؟"

"شکل و صورت سے تو بہت اعلیٰ لگتی ہے۔۔۔ ابا جی!"

"بڑی ریسرچ کے بعد ایسی کتابیں وجود میں آتی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

تمام مذاہب پر مرتبع و مجلّد کتاب کو گھٹنوں پر رکھ کر ظفر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"لارڈ رسل کہتا ہے کہ مذاہب کی جنگ کا اب آخری دور دم توڑ رہا ہے۔ صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا تو پورے چھ سو سال تک عیسائی اور مسلمان آپس میں لڑتے رہے۔ ادھر صلاح الدین ایوبی کا ڈنکا بجا، ادھر عیسائی لوگوں نے رچرڈ شیردل کو آسمانوں پر چڑھا لیا۔ بالآخر صلح ہو گئی۔ کیا تمہارا خیال ہے ایسی جنگ اب ہو سکتی ہے بیٹے؟"

ظفر نے کتاب پر گرفت سخت کر کے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ . . . کہ مذہب اب وجہ نزاع نہیں رہا دنیا میں . ."

"تمہارا کیا خیال ہے، ظفر، مذہب انسانیت کے حق میں نفع بخش ہے کہ نقصاندہ؟"

"میں نے کبھی سوچا نہیں اس ضمن میں اباجی!"

"تمہیں سوچنا چاہیئے۔ یہ تمہاری سوچنے کی عمر ہے۔ پتنگوں پر وقت ضائع کرنے کی نہیں ہے۔"

ظفر کے دل میں باپ کے خلاف ہلکی سی بغاوت اٹھی۔

وہ کتاب پر اور بھی جھک گیا۔ خدا جانے پتنگ کے متعلق کیسے اباجی کو علم ہو گیا۔

"میں تم سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے دوست ہو۔ اس سارے گھر میں میری نیت کو کوئی نہیں سمجھتا۔ سب مجھے ڈکٹیٹر سمجھتے ہیں حالانکہ میں چینی لوگوں کی طرح نہایت حلیم ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا، مذہب انسانیت کے حق میں کیسا ہے۔ نفع بخش کہ مضرت رساں؟"

"پہلے میں یہ کتاب پڑھ لوں پھر . پھر ہم آپس میں گفتگو کریں گے اس بات پر"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اگلے ہفتے تک مطالعہ کر لو گے نا اس کتاب کا۔" اباجی نے سوال کیا۔

"جی ہاں! انشاء اللہ۔"

"ہکسلے کا ناول پڑھ لیا ہے تم نے۔۔" اباجی نے پوچھا

"دراصل جی آج کل پڑھائی کا بہت زور ہے، وقت نہیں ملا، ساٹھ صفحے پڑھے

ہیں میں نے ابھی۔"

"کیسا ہے۔"

ظفر نے ہکسلے کا ناول کھول کر بھی نہ دیکھا تھا۔ گال سے زبان چپکا کر لمحہ بھر توقف

کیا اور پھر بولا۔

"اس کا پڑھنا سہل نہیں ہے اباجی۔۔۔ نہایت دقیق باتیں کرتا ہے ہکسلے۔

۔۔۔ ناولوں میں بھی۔"

پائپ کی کوکھ میں تمباکو ٹھونستے ہوئے پورے آدھ گھنٹے تک انہوں نے تصریح

کے ساتھ ہکسلے پر تبصرہ کیا

اباجی جب بولنے پر آتے تھے تو پروفیسر اعجاز سے بھی زیادہ معجز بیانی کرتے تھے

"تم کو مطالعے میں زیادہ وقت صرف کرنا چاہیے۔ ظفر!"

"ہاں جی۔۔۔ وہ تو ہے۔۔"

"سول سروس چاہے نہ کرو لیکن اتنی بات طے ہے کہ امتحان ضرور دینا ہوگا

تمہیں۔"

"ہاں جی! وہ تو دونگا ضرور۔"

"اگر انسان باقاعدگی سے اخبار کا مطالعہ کرے۔ جنرل نالج اچھی ہو۔ کلاسکس

کی سمجھ خاطر خواہ ہو تو نیل ہونا ناممکن ہے۔"

"جی ہاں . . . ایسا ہی ہے۔"

"یہ کتاب پڑھ کر رائے ضرور دینا ۔ بلکہ نوٹس بنا لینا اپنے لئے . ."

"ہاں جی . . اچھی بات ہے۔"

جب وہ اباجی سے مل کر اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے اندر ڈھول سا کھوکھلا پن محسوس کر رہا تھا ۔ اس کے ہاتھوں میں دنیا کے عظیم ترین مذہبوں کی خوبصورت کتاب تھی ۔ یہ کتاب پکڑے ہوئے اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا ۔ نیچے سڑک پر نیلی سیاہ کاریں آجا رہی تھیں ، اس نے جی میں سوچا میں اباجی کی خاطر اس کھڑکی سے کود سکتا ہوں ، ہکسلے کے ناول پڑھ سکتا ہوں ۔ ان کے لئے جان دے سکتا ہوں ، لیکن دوستی . . توبہ ، توبہ ! اباجی سے دوستی کسی قیمت پر نہیں کر سکتا ۔ اکیلا میں کیا کوئی بھی تو نہیں کر سکتا ۔

دوستی تو غازہ لگے لاہور اور رشیدہ میں ہو رہی تھی ۔ شام کے وقت مال پر روشن ڈے لائٹ بتیاں ، دو رویہ کھڑے چھتنار درخت جنکی پنڈلیوں تک سفیدی کی کوچی پھیری تھی ۔ دوکانوں کے جلتے بجھتے بورڈ ۔ دوکانوں کے باہر کھڑی کاریں ، ان کاروں میں سے نکلتی ہوئی ماڈرن لڑکیاں جو فرانسیسی انداز دلکشی کی خاطر خواہ پیروی کر رہی تھیں ۔ لڑکیوں سے پرے سینما گھر ، سینما گھروں کی بغل میں ریڈیو بجاتے ہوٹل یہ سب کچھ ننو کے لئے بہت دلآویز تھا ۔

کالج میں وہ دو شخصیتوں سے بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ ایک تو ڈاکٹر اعجاز حسین اور دوسرے ڈمپل۔۔۔ ڈمپل سے گو اس کی دوستی نہ ہو سکی لیکن وہ ڈمپل کو ہمیشہ منہ کھول کر دیکھتی رہتی تھی۔ ڈمپل میں آرٹ پیپر جیسی چکنائی اور ہوائی اڈے جیسا رومان بھرا تھا۔ رشو اندر ہی اندر ڈمپل کی انگلی سے رسّی کی طرح لپٹی جا رہی تھی۔

پروفیسر اعجاز کی بات ذرا مختلف تھی۔

انھیں دیکھ کر رشو کو اباجی یاد آتے تھے۔ اباجی کی کنپٹیوں پر بھی اسی طرح سفید بالوں نے یورش کر دی تھی۔ وہ ہمیشہ قمیض تو نہ پہنتے رہتے۔ لیکن ان کا ڈھانچہ شلوار قمیض میں اسی قدر رعب دار لگتا تھا۔ بہاول پور دراصل سفید پوشوں کا شہر تھا۔ ۔۔۔ ایسے سفید پوشوں کا جو حصولِ دولت کی خاطر بہاول پور چھوڑ جانا چاہتے تھے لیکن جنھیں بہاول پور کی مٹی، اس کی گلیاں، اس کی تہذیب گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب بہاول پور سے دلّی کو راستہ جاتا تھا۔ تب بہاولپور ایک پُر بہار شہر تھا۔ پھولوں سے لدی ڈالی کی طرح پُرکشش اور شگفتہ۔ لیکن اب یہ صرف سفید پوشوں کا شہر تھا۔ جہاں صرف نجابت اور خاندانی شجروں کی باتیں ہوتی تھیں۔ پدرم سلطان بود کے نعرے لگتے تھے۔ اور شہر کے معزز شہری اپنے اپنے گھر پہنچ کر اپنی اپنی عزت کو پگڑی کے ساتھ کھونٹی پر لٹکا کر اطمینان کا سانس لیتے تھے۔

رشّو کے والد بھی سفید پوش تھے۔ آبائی زمینیں جنہیں ہندوستان سے منسلکہ نہروں کا آنا جاتا پانی تباہ کر چکا تھا . . . ان سے بمشکل تمام اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ سال بھر بڑی کفایت سے گذر اوقات کی جا سکتی۔ وہ تو اماں کی جزرسی تھی کہ قرض لئے بغیر کام چل رہا تھا۔ ورنہ ابّا جی تو نہ جانے کیا کیا سکیمیں بناتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے حالات سے اس قدر تنگ آجاتے کہ کویت اور بحرین جانے کا پکّا منصوبہ بن جاتا ایسے میں انہیں کھونٹے سے باندھنے والی دادی اماں تھیں جنہیں اپنی کنگروں والی حویلی سے بڑا پرانا پیار تھا۔

ابّا جی کی ساری امیدیں زمین پر ٹیوب ویل لگوانے کے بعد رشّو کو بی اے بی ٹی کروانے کے ساتھ بندھی تھیں۔ جب وہ ایف اے میں ہوئی تو ابّا اُسے اپنے ساتھ کھانا کھلانے لگے۔

کھانے کے دوران وہ ساری اچھی اچھی بوٹیاں، روغنی ہڈی حلوے میں سے گریاں، ناریل نکال کر اس کی تھالی میں رکھتے جاتے اور کہتے :

"ہماری رشّو لڑکی تھوڑی ہے . . . یہ تو لڑکا ہے لڑکا . . . اس کی تو میں شادی کبھی نہیں کرونگا۔ ہماری رشّو تو بی اے بی ٹی کرے گی۔ کیوں رشّو؟"

"جی ابّا جی . . ."

"اور پھر ہماری رشّو بہاولپور سکول کی ہیڈ مسٹریس بنے گی۔ انسپکٹر آف سکولز بنے گی . . یہ تو ہے میرا دایاں بازو . . . یہ تو ہے ہی میرا بیٹا . . . کیوں رشّو؟"

"جی ابا جی۔"

"ابا کو دغا تو نہیں دے گی رشو؟"

"نہیں ابا جی۔"

"شاباش میرا بیٹا! جب تو پیدا ہونے والی تھی تو میں تیری ماں سے کہا کرتا تھا.. سن بھاگ بھری، ہم ریاستی لوگوں کے ہاں ہمیشہ پہلوٹھی کا بیٹا ہوا کرتا ہے۔ میں اس کا نام یا تو شمشیر علی رکھوں گا یا ضیغم پرویز..."

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں بچی سے۔" اماں کہتیں۔

"باپ بیٹا بات کرتے ہوں تو تو بیچ میں نہ بولا کر... ہاں... پھر تو پیدا ہوئی تو میں نے تیری ماں سے کہا... یہ دراصل بیٹا ہی ہے۔ وہ رب سائیں مجھے آزما رہا ہے۔ میرے صبر کو آزما رہا ہے۔ میں نے تیرا نام اشرف النسائ رکھا تھا۔ خدا جانے تیری ماں نے اسے رشیدہ میں کیوں بدل دیا۔"

"اچھا اچھا! لقمہ بھی تو توڑ یئے۔" اماں خفگی سے کہتیں۔

"ہم اپنی اشرف النسائ کی شادی نہیں کریں گے۔ شادی میں کیا دھرا ہے.. ہمارا بیٹا تو افسر بنے گا افسر.. دورے پر جایا کرے گا۔ چپراسی اس کی چق کے سامنے سٹول پر بیٹھا کریں گے... دغا تو نہیں دے گا۔ رشو بیٹا ہمیں"

"نہیں ابا جی"

بی اے تک رشو کے رزلٹ دیکھ کر کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ دغا دینے

کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بی اے کا رزلٹ نکلے ابھی تین ماہ ہوئے تھے
کہ اچانک ایک دن ابا جی بیٹھے بٹھلائے دغا دے گئے۔ دادی اماں کو اپنے بیٹے
کی بے وفائی پر اس قدر غصہ چڑھا کہ عین ابا جی کے چالیسویں پر جب سارے گھر سے
اگربتیوں کی خوشبو، اور کھجوروں کی گٹھلیوں کی ٹکاٹک سنائی دے رہی تھی۔ دادی ماں نے
اپنا رخت سفر باندھا، اور بیٹے کی گوشمالی کرنے سیدھی اگلے جہاں پہنچیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین میں نجانے کیا بات تھی کہ رشو کو بھولے ہوئے ابا جی بری طرح یاد
آنے لگے۔ ادھر خالہ کے گھر میں اس کی باتیں سننے کو کس کے پاس وقت تھا۔ جب دل بہت
بھر آتا تو وہ ٹرنک میں سے اپنی ڈائری نکالتی، اور اپنی خوبصورت لکھائی میں لکھنے لگتی۔۔
۔۔ یہ ڈائری اس کی سب سے بڑی دوست تھی، سب سے پیاری رفیق۔۔

بائیس نومبر:

آج نومبر کی بائیس تاریخ ہے۔ لاہور میں مجھے آئے مہینہ بھر ہو چکا ہے۔ لیکن مجھے
یوں احساس ہوتا ہے جیسے صدیوں سے یہاں ہوں۔ جیسے میں یہاں سے کبھی باہر گئی ہی
نہیں۔ اماں کو خط لکھتی ہوں تو وہ ساری باتیں لکھنے پر دل مائل نہیں ہوتا جو یہاں ہوتی ہیں
کچھ اس لئے نہیں کہ میں ان سے کچھ چھپا رہی ہوں فقط اس خیال سے کہ وہ جس ماحول میں
رہتی ہیں وہاں ان باتوں کو سمجھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اور اسی لئے وہ میری باتیں
سمجھ نہ پائیں گی۔

اور تو اور خود خالہ فیروزہ کے گھر کا نقشہ اگر میں ان سے ہو بہو بیان کروں تو دیکھیں

گی کہ ابھی بہاولپور واپس چلی آؤ۔ اور سچی بات یہ ہے کہ بہاولپور والوں میں سب کچھ ہے لیکن وسعتِ نظر نہیں ہے۔ خدا قسم ذرّہ بھر وسعتِ نظر نہیں۔ پورے کنوئیں کے مینڈک۔ وہ بھلا کیا سمجھیں گے کہ لاہور درّہ خیبر اور دلّی کی درمیانی کڑی ہے۔ اور درمیانی کڑی ہمیشہ زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔

میں امّاں کو کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں کہ خالہ کا گھر روشن خیال گھر ہے۔ میہاں تنویر اپنے کالج سائیکل پر جاتی ہے۔ اس کے بال کٹے ہوئے ہیں۔ وہ . . . اور یہاں خالو کے دوست کئی انکل بلا تکلف آتے ہیں۔ اور پہروں رہتے ہیں۔ توبہ! توبہ! امّاں سمجھنے کی کوشش بھی نہ کریں گی کبھی۔

لیکن یہ انکل لوگ ہیں کیا بلا؟ . . . سچ مچ!

رشّو جان ابھی ڈائری لکھ رہی تھی کہ انوری بلا دستک دیئے اندر آگئی۔ رشّو نے جلدی سے ڈائری بند کر دی

"آپا جی . . ."

"کیا ہے انوری؟"

اب اسے انوری سے اس قدر وحشت نہ رہی تھی۔

"پڑھ رہی ہیں آپ؟"

"نہیں تو . . .

لکھ تو رہی ہیں"

"یہ تو ایسے ہی ہے ایک . . ." رشو نے ڈائری بند کر کے انوری کی جانب دیکھا۔ انوری جیسے کچھ چھپا رہی تھی

"وہ آپا جی ایک کارڈ لکھوانا تھا آپ سے"

"کسے کارڈ لکھوانا ہے ؟"

"اپنے ابے کو خط لکھنا ہے آپا جی" وہ چپڑ الاکھ جیسے ہونٹ آپس میں سٹا کر بولی۔

"لکھواؤ . . . کیا لکھوانا ہے۔ کارڈ ہے تمہارے پاس ؟"

سینے پر دوہرے کئے ہوئے شفون کے پلو میں سے انوری نے کارڈ نکال کر میز پر دھر دیا۔

"آپا جی وہ بات یہ ہے . . . وہ میرا ابا آیا تھا جبراں سے"

"اچھا . ."

"ہم . . . وہ . . . ابا میرا . . ."

رشیدہ نے محسوس کیا کہ انوری کچھ بتانے اور چھپانے کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔ اس نے انوری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹھ جاؤ ناں . . . اور اچھی طرح بتاؤ کیا لکھنا ہے گھر . ."

انوری ٹانگیں لٹکا کر اس کھڑکی کی سل میں بیٹھ گئی جہاں سے آنگن نظر آتا تھا۔

"وہ آپا میرا ابا تو سودائی ہے"۔

"کار ڈیر پر لکھنا ہے۔" کھلکھلا کر ہنس دی۔

"نہیں جی! لکھنا تو یہ ہے۔ ۔ ۔ آپ اپنی طرف سے لکھ دیں کہ ابھی بیگم صاحبہ چھ

مہینے اور مجھے چھٹی نہیں دیں گی کسی قیمت پر۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔"

یک دم رشیدہ نے پوچھا "تو کیوں خالہ تمہیں چھٹی دے رہی ہیں کیا؟"

"نہیں جی وہ آیا آیا تھا میرا۔ ۔ ۔ بیگم صاحبہ کے پاس۔ ۔"

ابا پر آ کر وہ رک گئی۔

"تم صاف صاف کچھ بتاؤ تو لکھوں۔"

انوری نے آنگن کی جانب منہ پھیر لیا۔ اسکی آنکھوں میں نیل کنٹھ کے پروں جیسا

نیل اتر آیا تھا۔

"ابا میری شادی کرنا چاہتا ہے جھبراں میں۔"

"شادی؟" ۔ ۔ "وہ تو خیر ہو ہی جایا کرتی ہے۔" رشیدہ بولی۔

"وہ جی لڑکا مزارعہ ہے۔ کھیتی باڑی کرتا ہے۔ رہٹ پر دیسی صابن سے نہاتا

ہے۔ گلے میں اس کے تعویز لٹکے ہیں، سر پر مکھن لگاتا ہے۔ پاؤں میں تری کی جوتی پہنتا

ہے۔ پورا گنوار ہے۔ گنوار! میں اسے کیا کرونگی۔"

رشو جان نے پہلی بار مڑ کر انوری کو اصلی روپ میں دیکھا۔

یہ لڑکی تیل کے چولہے پر روٹی پکاتی تھی۔ پنکھے تلے سوتی تھی۔ فرج میں سے

برف کی ٹکڑیاں نکال کر ٹھنڈا پانی پیتی تھی۔ ریڈیو سنتی تھی، فلم دیکھی تھی۔ ۔ ۔ اس کا

لباس چاہے پرانا اور مسکا ہوا تھا۔ لیکن جسم سے لپٹا جاتا تھا۔ اس کے کھونڑے ہیلوں والے تھے۔ اور ان ہیلوں والے جوتوں کے اندر اس کے پیروں پر تنویر باجی کی کیوٹکس لگی تھی۔

اللہ یہ لڑکی کس کے ماتھے جا سے گی؟ اونچے گھرانوں میں نوکرانی بن کر رہنا ایسے ہی تھا جیسے کوّے کو مور نے اپنے پروں کی اترن دیکر کہا ہو لے آزما دیکھ، ان کو لگاتے ہی تیری زندگی بدل جائے گی۔ . . . اونچے گھر کی یہ ملازمہ . . . یہ مور کے پنکھ سجائے ہوئے کوا کس منڈیر پر بیٹھ کر ہڈی چبائے گا؟

"آپ لکھ دیجئے جی . . . کہ بعد خیریت احوال کے واضح ہو کہ میں یہاں پر خیریت سے ہوں۔ ابھی چھ مہینے تک تو بیگم صاحب چھٹی نہیں دیں گی اس کے بعد آپ آگرے جائیے تنخواہ کا منی آرڈر آپ کو ملتا رہے گا۔ ہر مہینے . . . ٹھیک ہے نا آپا جی؟ . . ."

دشو نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"لکھ لیا جی . . ." تھوڑی دیر بعد انوری نے سوال کیا

"ہاں . . . اب پتہ بتاؤ؟"

"چھبراں۔ ڈاکخانہ خاص . . . ضلع شیخوپورہ . . . محمد ضمیر کھوکھر کے پاس جاوے جی ڈاکخانہ خاص . . ."

پوسٹ کارڈ لکھوا کر بڑی احتیاط سے انوری نے پھر اسے دوپٹہ کے پلّو میں لپیٹ کر سینے پر ڈال لیا۔

"شکریہ آپا بی . . ."

"کوئی بات نہیں ۔"

رمضانی کو آواز دیتی انوری دڑنگے مارتی چلی گئی ۔ رشیدہ نے لمبی سی سانس لی۔ اور جی میں سوچا ۔ کبوتری آنکھیں بند کر کے سوچتی ہے "بلی چلی گئی" ۔ . . حالانکہ بلی کی مونچھیں اس وقت اس کے پیروں سے آدھ انچ کے فاصلے پر ہوتی ہیں ۔

کب تک انوری کب تک ؟

آنکھیں بند کرنے سے ساری عمر تو نہیں گذر جاتی ۔

آنکھیں بند کرنے سے مزارعوں کا لڑکا جو رہٹ پر دیسی صابن سے نہاتا ہے . . وہ تو پھر بھی ویسی نکٹھی ہی سر پر لگائے گا اور زری کی جوتی ہی پہنے گا ، آنکھیں بند کرنے سے حاصل ؟

انوری کی اس گھر میں جو اہمیت تھی ، اس کا اندازہ رشو بہت جلد لگا چکی تھی ۔ خالو جمال کے دفتری حالات اور گھریلو امور کے انتظامات میں بڑا فرق تھا

خردمندوں کی حکایاتِ غریب سے نقل ہے کہ ایک حرّافہ پرفنِ خرمنِ صبر و شکیبائی کی دشمن کسی دیہات میں بیاہ کر گئی ۔ اس بد فطرت زن بد افعال کا طریق یہ تھا کہ صد زیب و زینت سے آراستہ و پیراستہ بالائے بام نظارہ کناں رہتی تھی ۔ اور آتے جاتے دہقانیوں سے ہنسی ٹھٹھا کیا کرتی تھی ۔

قضائے کار ایک جوان طرح دار پر ارمان نادان صورت اس زن

دل شکن کو دیکھ کر حیران و پریشان ہوا اور رسوائی اور بے حیائی کا خیال دل سے نکال کر وصل کا شیدائی ہوا۔ یہ جادو چشم بد خصلت بھی ویسی ہی تمنائی ہوئی۔ الغرض جب شام سیہ فام نے سیاہی شب سے رخ خورشید کالا کیا تو وہ ذات کا تنبولی تابدان کی راہ اس زن بد خو غفلت شعار لعنت بکار کے پاس پہنچا۔ دونوں خوابِ غفلت میں سرشار و مدہوش سو رہے۔

اس گوشے میں جہاں خود دونوں وصل کی شراب چھکا چھک پیے خورسند حال بدمست پڑے تھے۔ ادھر سے پچھلے پہر اس زنِ شعلہ خو کا سسرا کاندھے پر ہل دھرے نکلا۔ یہ احوال کثیر الاختلال دیکھ کر وہ دہقانی اس قدر غصے سے نیلا پیلا ہوا کہ چاہا ایک ہی بار تیغ آبدار سے اس فاحشہ کا قصہ پاک کر ڈالے۔ پر اپنے بیٹے سے از بسکہ ڈرتا تھا، سو چپ رہا۔ لیکن اُس زنِ بے تمیز کے پاؤں سے گجری نقرئی اتار لی کہ یہ بوقتِ سحر منکر نہ ہو جائے۔ وہ تو گجری نقرئی لیکر کھیتوں کو روانہ ہوا۔ ادھر اس رشک لیلی کی آنکھ کھلی۔ اپنے حال سے آگاہ ہوئی۔ ماتھا ٹھنکا کہ شکا فریب جادو کا ٹوٹ گیا۔ تنبولی زادے کو دم دلاسے دیکر رخصت کیا، اور انگڑائی لیتی بے حجاب اپنے شوہر کے پاس پہنچی کہ یہ گنہ گار، خستہ بیکس، محنت کی نیند پڑا سوتا تھا۔ بصد انداز و دلربائی شوہر کو جگا کر بولی "واہ رے مونس و غمخوار تیری بے رخی نے یہ دن دکھایا کہ اب تو مجھے زینت آغوش بھی نہیں بناتا، اور میں کونے کھدروں میں منہ چھپائے سسکیاں بھرتی پھرتی ہوں"۔ ۔ ۔

یہ بانگڑو جورو بد خو کا یہ بے محابا التفات دیکھ کر جامے میں پھولے نہ سمایا اور خوب ملتفت ہوا۔ دونوں باہم شیر و شکر ہو کر پڑ رہے۔ پہر بھر بعد اس قتالہ نے

میاں کو جگایا۔ اور اپنا منہ دکھا کر بولی - اے یارِ جانی! سرمایۂ زندگانی کہیں یہ سنا ہے کہ جہاں جورو، خاوند خواب میں خرسند ہوں۔ وہاں بوڑھا سسرا بہو کی گجری اپنے ہاتھ سے اتارے جائے۔ ایسے بدسرشت بڈھے تو گردن زدنی ہیں۔

الحاصل وہ پیر کو اس زنِ بے مہر کا خسر کھیتوں سے لوٹا، اور فرزند دلبند سے کہنے لگا کہ بدخصال ناہنجار، بدکار عورت تیری ایسی ہے کہ ایک شخص غیر کے ساتھ خلائے گوشے میں اس بے فکری اور فراغت سے سوتی تھی کہ گجری اسکی میں نے اتاری اور اس کو خبر تک نہ ہوئی۔

باپ کی باتیں سن کر وہ گیدی خر مرد ادبک مرغِ بے ہنگام بولا ... کہ اے بوالہوس اس بڑھاپے میں بھی تجھے بڑا ایش لگا ہے کہ بہو بیٹے سے سوانگ کرتا ہے۔ اور بہو کی پنڈلیاں چھوتا پھرتا ہے۔ جو کبھی ایسی ناشائستہ حرکت پھر کی تو دیکھ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

زنِ فاحشہ نے جھٹ، بیچ بچاؤ کیا۔ اور میاں کو سمجھا بجھا کر ایک طرف لے گئی، اور بولی " واہ! تم بھی خوب ہو تم کو بات بزرگوں سے کرنے کا شعور نہیں! گجری اتاری تھی تو عجز کونسی قیامت آگئی۔ تم کو شرمندہ کرنا کیا ضرور تھا۔

اپنی زنِ ذی شعور کی باتیں سن کر یہ گاؤدی بہت متاثر ہوا اور اُس شعور پر ایمان پہلے سے کہیں زیادہ لے آیا۔

چونکہ مرد ادبک مرغِ بے ہنگام خالوجمال کے گھر میں ایک زنِ ذی شعور رہتی

تھی۔ اس لئے وہ محنت کی نیند سویا کرتے تھے۔ اور انہیں خبر ہی نہ تھی کہ کس کی پگڑی نقرئی کس کے ہاتھ میں ہے۔

واضح رہے کہ جوں جوں خالو جمال عمر میں بڑھ رہے تھے۔ خالہ فیروزہ ان کے دل کو پہلے سے زیادہ، کہیں زیادہ عزیز ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کی تنخواہ خالہ کے لئے تھی۔ گلبرگ میں نئی تعمیر شدہ کوٹھی خالہ کے نام تھی۔ دو عدد نہری مربعے خالہ کے حق میں بیع تھے، نئے رولز کے تحت پنشن کی وارث بھی خالہ ہی کو مقرر کیا تھا۔ پچھتر ہزار کی پالیسی حادثے یا موت کے وقوعہ کی حالت میں خالہ فیروزہ ہی کو ملنی تھی۔

لیکن خالہ کا رویہ مختلف تھا۔ انہیں خالو کے منہ سے بو آتی تھی۔ جب خالو رات کو سونے سے پہلے، اور نماز پڑھنے کے بعد، نقلی دانت اتار کر پلاسٹک کے گلاس میں رکھ کر سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی لیے خالہ کے ساتھ ڈبل بیڈ میں لیٹتے تو خالہ، بے چاری سناٹے میں آجاتیں، خالو بے چارے ان ساٹھے پاٹھے مردوں میں سے نہ تھے کہ ڈھلی دوپہر میں بھی ان کا حسن شاہ بلوط کی طرح قد آور رہتا۔ وہ تو ساری زندگی ایک ہائی کلاس قسم کے کلرک رہے۔ فائیلوں میں ڈوبے ہوئے، پی آئی اے کے مرغوں کی طرح ایک ہی گرہ میں کھاتے پیتے پلتے رہے۔ انہیں ہرگز معلوم نہ تھا کہ دفتر کی کھڑکی سے باہر کیا کچھ ہو رہا ہے۔

دو تین بار یورپ گئے لیکن اس طور پر کہ قیام گاہ سے سیدھے دفتر اور وہاں سے واپس ۔ ۔ ۔ نہ کوئی تھیٹر، نہ کوئی نائٹ کلب، نہ کوئی سیر سپاٹے، نہ کوئی ملاقاتی

دوستیاں۔ ان کے بھانویں تو جیسے کنٹھا دیس بسے، ویسے بسے بدیس، پہلے تو خالہ کو جمال صاحب کی ان ہی باتوں سے بہت گہری محبت تھی، ان کی ایک کھونٹے سے بندھے رہنے کی خاصیت کو وہ بڑے زور و شور سے سراہا کرتی تھیں، لیکن جب یہ بیل کسی اور تھان پر جاکر چرنے کے قابل نہ رہا تو خالہ اسے ڈنڈے مار مار کر کہتیں ”واہ کبھی سنا ہے کہ مرد ذات ایسی ہو۔۔۔ ابھی تو زنخنے ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مار لیتے ہیں۔ ان حضرت کو تو ہمیشہ سے عورت کو دیکھتے ہی پسینہ آجاتا ہے۔ اس میں سارا قصور شاید خالہ کا نہ تھا، کیونکہ اب وہ ایک ایسے دور سے گزر رہی تھیں جسے مینوپاز کا پریشان عہد کہا جاتا ہے۔ جو باتیں خالہ کے لئے پہلے قابلِ قبول تھیں اب وہ ان سے بڑی شدید نفرت کرنے لگی تھیں، جن چیزوں کا ہلکا سا پکا تھا اب ان کا بھس چڑھا تھا کہ عقل کی حد سے تجاوز کئے جاتی تھیں۔

دراصل سارا فتور لہو کا ہے۔

اس گھر کا لہو بگڑ چکا تھا۔ اس میں انٹی باڈیز شامل ہو چکی تھیں، جسطرح ایک نوزائیدہ بچہ جسکا آر ایچ فیکٹر مثبت نکل آئے، تو عموماً وہ جانڈس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا لہو تبدیل نہ کیا جائے تو یہی آر ایچ فیکٹر، اسکے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس گھر کا آر ایچ فیکٹر بگڑ چکا تھا، اور سارے گھر کو ساون کے اندھے کی طرح ہر جگہ سبز ہی سبز نظر آتا تھا۔۔۔

بیچاری خالہ کا قصور تو تب ہوتا اگر وہ نوجوان ہوتیں، اور پھر خالو سے محبت

نہ کرتیں!

محبت کی بات تو کوئی ان دنوں ظفر سے کرتا۔ اسے اندر باہر، ارد گرد بس ایک ہی چیز نظر آتی تھی اور وہ بھی محبت! نئی نئی رشیدہ کو خط لکھنے کے بعد ظفر نے زبان سے لفافے کی گوندیلی کی، اور جل تو جلال تو پڑھتا لفافے کو بند کرنے لگا۔ لفافہ بند کرنے کے بعد اس نے محبت سے اس پر رشو کا پتہ لکھا۔ اور اسے مذاہب عالم کی اس ضخیم کتاب میں رکھ دیا جو اسے اباجی نے عارضیتاً دی تھی۔

شام پڑ رہی تھی آج کوٹھے پر اباجی نہ تھے۔ ایسی سکون کی گھڑیاں اس گھر میں کم آتی تھیں، دوسری منزل میں کوئی بچہ منہ کھولے اونچے اونچے رو رہا تھا، ظفر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ نیچے کھلونے جیسی کاریں آجا رہی تھیں۔ شہر کی آبادی اینٹوں میں محبوس مرنخوردہ اور ہڑپے کے کھنڈروں کی طرح بے جان نظر آتی تھی۔ ظفر اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر شہر کا تماشا دیکھنے کا شوقین تھا۔ اس بازیچۂ اطفال میں کھو کر وہ اپنی بے بضاعتی کو پرکھتا۔ اس کے اباجی سٹلزے اتر آتے، یہاں سے وہ اس موذن کی آواز سن سکتا تھا جو ہر اذان سے پہلے، مائیکروفون پر اذان دینے سے پہلے چند ایک گھریلو قسم کی باتیں کر لیا کرتا تھا اور جسے شاید یہ علم نہ تھا کہ جہاں مائیکروفون اذان کو ہوا کے دوش پر اچھالتا ہے وہیں "وہ چاول پک گئے ہیں، کاکا کہاں ہے۔ مولیاں گوشت پکالو" قسم کی باتیں بھی اونچی کر کے لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکتا ہے۔

مظفر بھائی کار لے کر اپنی دوکان پر جا رہے تھے۔ ۔ ۔ رکیں گے جی۔ ۔ ۔

کسی دن . . . غروب آفتاب کے قریب ۔ اظہر غالباً کہیں کرکٹ کھیلنے جا چکا تھا ۔ آبا جی بی این آر کا کوئی لیکچر سننے گئے ہوئے تھے . . . . اس وقت ظفر اکیلا تھا ۔ یہ بہاولپور کی لڑکی کیسی ہے ؟ . . . ظاہر ہے اچھی ہے ۔ یہاں پہ کیوں آئی ہے ؟ . . . تمہارا اقرار لوٹنے . . . احمق ! کیا یہ میرے متعلق کبھی سوچتی ہے ؟ وہ کیوں سوچے گی ؟ ایسی بھیگی بلیوں کو ان کاموں کی فرصت نہیں ہوا کرتی ۔

ابھی وہ ان ہی باتوں کے متعلق غیر ضروری سوال و جواب کا کھاتہ بھر رہا تھا کہ بیرونی سیڑھیوں پر کھٹکا ہوا ۔ اباجی کبھی اندر والی سیڑھیوں سے اوپر نہیں آتے تھے ! ظفر نے جلدی سے "دنیا کے عظیم مذاہب" کھولی اور پڑھنے لگا ۔ اس کی نظروں کے سامنے بدھ کے سٹرپا پھیلے تھے ۔ کانوں میں نہ جانے کب کے پڑھے ہوئے الفاظ گونجنے لگے . . .

محبّت سے دکھ کی چتا جلتی ہے ۔

محبّت سے خوف کا دیا جلتا ہے

جسنے محبّت سے چھٹکارا حاصل کر لیا

وہ نہ دکھ سے ڈرتا ہے نہ خوف سے

کسی نے اس کے دروازے پر مدھم سی دستک دی ۔

"کون ہے ؟"

"میں ہوں ۔ غازی ۔"

"ہا ہا۔ ۔ ۔ آجاؤ! یار! میں بہت بور ہو رہا تھا۔ آجاؤ۔ ۔ ۔"

غازی چپ چاپ اندر آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"میں یہ کتاب دیکھ رہا تھا۔ غازی یہ دیکھو! سدھارتھ، کپل وستو کا شہزادہ چہرے سے یونانی لگتا ہے۔ ہے نا۔ ۔ ؟"

غازی خاموش رہا۔

"میں سوچ رہا تھا۔ ہر بڑا آدمی، ہر مہاتما، پہلے احساسِ کمتری میں سلگتا ہے پھر اس جگہ پہنچتا ہے جہاں سے وہ دوسروں کے احساسِ کمتری دور کر سکے۔ سدھارتھ کپل وستو کے اس شہزادے کو بھلا کس چیز کی کمی تھی۔ ۔ ۔"

غازی اب بھی چپ تھا۔

"بدھ نے گیا کے درخت تلے نروان حاصل کیا اور بولا:

محبّت سے دکھ کی چتا جلتی ہے

محبّت سے خوف کا دیا جلتا ہے۔

جس نے محبّت سے چھٹکارا حاصل کر لیا

وہ نہ دکھ سے ڈرتا ہے نہ خوف سے

۔ ۔ ۔ سن رہے ہو؟"

غازی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی۔

"یار! وہ نہیں مانتی۔"

"کون نہیں مانتی ؟" ظفر نے آہستہ سے پوچھا۔

"وہ مکھی بھبیوا کی بچی۔"

"اچھا۔ گلنار کی بات کر رہے ہو ؟"

"اور ہم کس کی بات کریں گے۔" غازی نے گیا کے بدھ کی طرح کہا۔

"کیا نہیں مانتی ؟"

"میں نے اس سے کہا تھا۔ تم پیشہ چھوڑ دو، ہم کراچی چلے جائیں گے۔"

"تمہارے اباجی مان گئے ہیں ؟ غازی !"

"اباجی! اباجی ! . . ." وہ دیر تک اباجی، اباجی کہتا رہا۔

غازی کے ابا جھنگ کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کی جاگیر قریباً ساٹھ مربعوں پر مشتمل تھی جو زرعی اصلاحات ہونے کے بعد انہوں نے گھر کے مختلف افراد کے نام بیع کر کے مختار نامے عام اور خاص، حاصل کر لئے تھے۔ اس زمین کے شکمی اجارہ داروں کی فہرست اتنی طویل تھی کہ شاید ان کے رجسٹر میں بھی درج نہ تھی۔ دروغ حلفی اٹھانے کے ماہر، دعوے زائد المیعاد کے مقدموں کی پیروی میں گرفتار، اشتمالات میں دخلکاری کے مائم، جھوٹے تملیک ناموں کے پیچھے مرنے والوں، مزارعوں کی تقاوی کو ترکہ پدری سمجھنے والے تعزیراتِ ہند کے حافظ تھے۔ ان کا سارا وقت ایسے بکھیڑوں میں گذرتا تھا کہ تین نوجوان لڑکے جو بن ماں کے بچے بھی تھے، اپنے اپنے حالوں مست تھے اور اباجی کو علم بھی نہ تھا کہ ایک کا نام بستہ بے میں لکھا جاچکا ہے۔ دوسرا زمینداری

کی جگہ نوجوان دوشیزاؤں کا عاشق ہے ۔ اور تیسرا جسے سدھارنے کے خیال سے انہوں نے لاہور بھیج دیا ، گلنار کے نام کا دیپ جلائے بیٹھا ہے۔ پہلی بار جب گلنار کا بھوت غازی پر شدّت سے سوار ہوا تو وہ سر پر کفن باندھے گاؤں پہنچا ۔ رات تک اباجی بیلے میں بیٹھے چاچا کرم داد اور کالو مراثی سے قانونِ استقرائی کی باتیں کرتے رہے۔ غازی نے کئی چکر لگائے لیکن چاچاجی ایک سانس میں بولتے تھے ، سانس اکھڑ اکھڑ جاتا لیکن بات کا تانا نہ ٹوٹتا۔ ہر بار جب وہ پاس آتا تو وہ کرم داد سے کہتے۔

"دیکھ لے کمّی کمین کی اولاد اور اصل اشرافوں کی اولاد میں یہ فرق ہوتا ہے ۔ بی اے کر رہا ہے ، غازی ہمارا . . . بی اے "۔

جس قدر زیادہ وہ تعریف کئے جاتے تھے اسی قدر غازی کا گھٹنا بیٹھتا جاتا تھا ۔

"میری تو تمنا تھی کہ یہ وکالت کرے ، لیکن خیر جو ڈپٹیل فیصلہ اس نے کر دیا ، کر دیا "۔

چاچا کرم داد نے حسرت بھری نظروں سے غازی کی جانب دیکھا ۔ ان کی اولاد سیدھی سادھی دیہاتی تھی ، پانچ لڑکے اور تین لڑکیوں میں سے ایک نے بھی کبھی شہر کا رخ نہ کیا تھا ۔

لڑکے بڑے محنتی اور زلائی گوڈی کے شوقین تھے ۔ سہاگہ پھیرنے اور غلہ گاہنے کے علاوہ انہیں کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی ۔ گھر میں کوٹھے کے کوٹھے دانوں سے بھرے تھے ، لیکن چاچا کرم داد کو نیاز محمد ، اپنے بھائی کی اولاد پسند تھی ۔ اٹھتے

بیٹھتے کہتے۔

"ہمارا گھر تو بے نصیب ہے۔ بھائی نیاز محمدؒ کی اولاد کو ذرا دیکھو۔ بڑا لڑکا لایل پور میں نوکر ہے۔ در میانہ ایف اے کر چکا ہے۔ اور اب غازی کو دیکھ لو، لاہور میں بی اے کر رہا ہے، بی اے۔ اور ایک یہ پانچ لونڈے ہیں، اپنا خط بھی نہیں لکھ سکتے!۔"

جب کالو مراثی چاچا کی ٹانگیں خوب دبا چکا اور چلم کے پھول ٹھنڈے ہو گئے تو چاچا کرم داد آہیں بھرتا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ کھرّی چارپائی پر صرف تہمد باندھے، پگڑی کا سرہانہ بنائے نیاز محمدؒ کچھ سویا اور کچھ جاگا ہوا تھا کہ غازی نے آگے بڑھ کر ہمت سے کہا۔

"ابّا جی، ایک بات ہے ... آپ سے۔"

"کرو کرو ... کرو کرو۔"

"وہ جی میں شادی کرنا چاہتا ہوں ..."

"شادی؟ شادی؟ ..." ابا جی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے، اور غازی کو محسوس ہونے لگا، جیسے وہ اپنی ٹانگوں پر نہیں بلکہ چارپائی کے پایوں پر کھڑا ہے۔

"وہ جی ... ایک لڑکی مجھے پسند آگئی ہے شہر میں۔"

"شہر میں ... لڑکی ...؟"

گلنار سے محبت کا جوش تھا جو اُبل اُبل کر باہر نکل رہا تھا۔

"جی بہت اچھی لڑکی ہے وہ نیک سادہ مزاج . . ."

"باپ کیا کرتا ہے لڑکی کا"

باپ؟ . . . کونسا باپ؟ . . . آج تک غازی نے سوچا تک نہ تھا کہ گلنار کا باپ کیا کرتا ہے؟ ہاں گلنار کی بی بی جی پرانی نائیکہ تھیں۔ سر پر سفید دوپٹہ لے کر کانوں کے دونوں طرف اڑسا رکھتی تھی۔ گلنار سے پیشہ کرواتی تھیں۔ پانچ وقتہ نمازی تھیں۔ اور بلا کا اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ ان کے پکتے ہوتے شلغم گوشت، کرم کا ساگ اور مچھلی تو بس ایسی تھی کہ منہ سے لیکر معدے تک ہر جگہ سے لپیٹ آنے لگتی۔

"وہ جی باپ تو اس کا . . ."

"سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں" ابا جی کی زبان میں گھگنت آگئی۔

تھر تھر کانپتے ہوتے غازی بولا۔

"جی . . . اس کا باپ نہیں ہے"

"اچھا، بیوہ کی اولاد ہے"

وہ تن سنگھ شرپا کی طرح ماونٹ ایورسٹ سر کرنے کے درپے تھا۔

"جی نہیں، بیوہ نہیں ہے اس کی ماں . ."

ابا نیاز محمد سونٹے کی طرح سیدھا ہو گیا

"طلاق ہے کیا؟ . . ."

اب غازی کو محسوس ہوا کہ جس قدر وہ اس معاملے کو سہل سمجھتا تھا اتنا یہ مسئلہ

سیدھا نہیں ہے۔

"نہیں جی . . . طلاق تو نہیں ملا ہوا انہیں . ."

"تو کیا حرام کی اولاد ہے کسی کی . . . بول"

"جی وہ . . . وہ بہت نیک ہے ۔ معاشرے نے انہیں اس دلدل میں دھکیل دیا ہے ۔ وہ فرشتوں کی طرح نیک ہے . . . لیکن حالات اسے . . ."

"پیشہ کروانے پر مجبور ہیں" اباجی فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولے۔

"جی . . ."

"کیا کہا . ."

"جی . ."

"نکل جاؤ اسی وقت یہاں سے ۔ الّو کے پٹھے، حرامزادے ۔ کسی گشتی کی اولاد نکل جاؤ . . . ابھی اسی وقت"

"اچھا جی . . ."

"میرا منہ کھڑے کیا تک رہے ہو؟ پہلے سردار اس گھر سے نکلا ۔ پھر اکبر کو نکلنا پڑا میری ساری امید تم سے وابستہ تھی ۔ تم بھی نکل جاؤ"

"اس وقت کہاں جاؤں اباجی . . . صبح لاہور چلا جاؤنگا"

"اسی وقت ۔ اسی لمحے . . . اسی گھڑی نکل جاؤ ۔ الّو کے پٹھے، گشتی کی اولاد، حرامزادے . . ."

غازی اپنا سامنہ لیکر باہر کی طرف چلنے لگا، اصطبل کے قریب اسے ساجھا مل گیا۔ وہ تالرڑاں سے آئی ہوئی گھوڑی کو جسے وہ پری کہتا تھا، دانہ ڈال کر آرہا تھا۔

"کدھر بھاجی؟ . . . اس وقت؟"

بس کہیں نہیں . . ."

"صغراں کی تو شادی ہوگئی پچھلی جمعرات . . ." ساجھا گڑے مردے اکھیڑنے لگا۔

"میں صغراں سے ملنے نہیں جا رہا . . ."

"سیّد ہے کمہار کی جیواں تو آج کل گڈو شاہ کے چیلے کی چیلی بنی ہوئی ہے۔"

"بکو مت۔"

"پتہ نہیں اس گاؤں کی لڑکیوں کو کیا مار ہے ہنس ہنس کر ساجھے سے باتیں کرتی ہیں۔ اور یارانے کہیں اور لگاتی ہیں۔ کڑ کڑ کہیں اور انڈے کہیں . ."

"ایک چارپائی ہو تو دے دو ورنہ چپ رہو۔"

"ایک چارپائی، بادشاہو۔ لکھ چارپائیاں لگّو۔ ہمارے تو گھوڑے بھی چاہیں تو رنگیلے پلنگوں پر سو سکتے ہیں۔"

جب ساجھا غازی کے لئے چارپائی لے آیا تو وہ چند منٹوں میں کھری چارپائی پر لیٹ کر جوانی کی نیند سو گیا۔ اس کے سر سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا تھا۔

لیکن جیسے یہ سارا بوجھ اتر کر ملک نیاز محمد صاحب کے کندھوں پر جا پڑا . .

زخم خوردہ تو پہلے ہی تھا۔ تیسرے بیٹے کو گھر سے نکال کر یک دم زندگی خالی ہوگئی،

بڑی حویلی میں غازی کو آوازیں دیں۔ نذیراں، بگا، اور جبروت دبے دبے ادھر ادھر غازی کو ڈھونڈنے لگے۔

ملک صاحب بھٹے کر للکار رہے تھے۔

"کہاں گیا ہے وہ الّو کا پٹھا... گشتی کی اولاد... اس وقت کہاں گیا ہے بدبخت سوّر،... رات کے وقت کہاں منہ کالا کرتا پھرتا ہے؟... زندگی حرام کر دی ہے ان لوگوں نے، دیکھو ناں نہ کسی سے پوچھا نہ سنا گھر سے چلا گیا اٹھ کر... ہم شرم کے مارے نہ کسی سے پوچھ سکتے ہیں نہ کسی کو بتا سکتے ہیں.. حرامزادہ، گشتی کی اولاد.."

بکتے جھکتے صبح کے قریب جب چودھری نیاز محمدؒ کی آنکھ لگ گئی تو اس وقت انہیں جاگ آئی جب غازی اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ غازی سوٹ کیس کو چابی گھما کر مقفل کرنے ہی والا تھا کہ اباجی آن وارد ہوئے۔

"میں نے رات کو تجھے کہہ نہیں دیا تھا سوّر زادے کہ اس گھر میں تیرے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں تو کیا لینے آیا ہے؟ طوائف کے عاشق؟"

"میں جی اپنا سامان لینے آیا ہوں..."

"سامان؟ یہ تیرا سامان ہے کہ میری دولت، کسی نواب کی اولاد۔ پڑھائی کرنے گیا تھا لاہور کہ طوائفوں کی جلیبیں بھرنے۔ بول.. بول.. بول..."

یکدم غصّے کے مارے اباجی کا منہ کھلنے بند ہونے لگا، لیکن آواز بند ہو گئی،

بالکل خاموش فلموں کی طرح ۔

تھوڑی دیر یہ کیفیت رہی ۔ غازی سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا ۔ لیکن پھر جب اس نے جمروت کو تانگا جوتنے کے لئے کہا تو یکدم ابا جی کے گلے میں لاؤڈ سپیکر لگ گیا ۔

"جوتا مار کر چلے جاؤ . . . . بڈھے باپ کے منہ پر ۔ تم کو تو یاد بھی نہیں کہ میں نے کس مصیبت سے تم کو پالا ہے ۔ دوسری بیوی نہیں کی کہ یہ شہدے کس طرح پلیں گے ؟ جا جا . . . جاتا کیوں نہیں ؟ کھڑا منہ کیا تک رہا ہے ۔ نکل جا ، میری نظروں سے دور ہو . . . گشتی کی اولاد . . . . الو کا پٹھا . . . طوائف کا حمایتی ! . . ."

جب لاہور واپس پہنچ کر یہ سارا واقعہ اس نے من وعن ظفر کو سنایا تو اسے پورا یقین تھا کہ اب اسے گاؤں سے کوئی منی آرڈر نہیں آئے گا اور اسے پڑھائی کا سلسلہ منقطع کرنا پڑے گا ۔ لیکن جب اسی مہینے پانچسو روپے کا منی آرڈر آگیا تو غازی اور ظفر نے سرد جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ چھوڑ دیا ۔ اور ابا جی سے باقاعدہ معافی مانگ لی ۔

ظفر کو وہ دن بری طرح یاد آ رہے تھے ، جب گلنار سے شادی کرنے کا بھوت پہلے پہل غازی پر چڑھا تھا ۔

"کیا سوچ رہے ہو تم ؟ . . ." غازی نے سوال کیا

"میرا خیال ہے ، اب تم گلنار سے شادی کرنا نہیں چاہتے ۔"

"کون میں ؟ . . . کس کی بات کر رہے ہو؟" . .

"تمہاری اور کس کی ۔"

"میں تو آج بھی گلنار سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک اگلی زندگی کے آخری سانس تک اور قیامت کے روز جب حضرت اسرائیل صور پھونکیں گے تب بھی میں اس سے شادی کرنا چاہوں گا ۔"

ظفر کی نظروں میں رشیدہ کا چہرہ گھومنے لگا ۔

"پھر کرتے کیوں نہیں ۔"

"اب وہ نہیں مانتی . . ۔"

"وہ نہیں مانتی ؟ . . . کیا مطلب ؟" ظفر نے ابرو اٹھا کر پوچھا ۔

"وہ کہتی ہے دو سال پہلے میں تیار تھی ۔ لیکن تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے ، اب مجھے اپنے پیشے سے پیار ہو گیا ہے تو تم چاہتے ہو میں اسے چھوڑ دوں اور ہاتھ کٹوا کر بیٹھ جاؤں . . . ۔"

"پیشے سے پیار ہو گیا ہے . . . لیکن وہ تو تمہاری محبت کا دم بھرتی تھی ۔"

"یہی تو مشکل ہے ۔ محبت تو وہ مجھ سے ہی کرتی ہے ۔ لیکن . . . لیکن پتہ نہیں کب میں نے اس کی انا کو مجروح کر دیا ہے ۔ اُسے یقین نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں ۔ وہ مجھے کہتی ہے مجھ پر ترس نہ کھاؤ ۔ میرے لئے یہی زندگی بہتر ہے ۔ میں گھریلو عورت نہیں بن سکتی ۔ مجھ میں وہ دیا روشن نہیں رہ سکا ۔ جس سے چھوٹے گھر میں

اجالا ہو سکتا تھا۔ میں اب فانوس کی روشنی ہوں، بڑی سڑک پر کوکا کولا کا سائن بورڈ ہوں
مجھے آسائش سے محبت ہو گئی ہے۔ . . . میں اسے لاکھ یقین دلاتا ہوں۔ بہتیرا سمجھاتا
ہوں۔ لیکن وہ نہیں مانتی . . . . نہیں مانتی گدھی کہیں کی۔"

"شادی کے متعلق امتحانوں کے بعد سوچنا۔ فی الحال ایم اے کی طرف توجّہ دو، گلنار
کہیں بھاگی نہیں جاتی۔"

"مجھے یوں لگتا ہے وہ مجھے چڑانے کی خاطر کسی سے کسی دن شادی کرے گی۔"

"نہیں کرتی نہیں کرتی، بابا . . . خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا ؟"

"بالکل . . ."

"عجیب سی ڈھارس بندھ گئی ہے تمہاری بات سے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ تمہارے
پاس انٹوشن پر نوٹس ہیں پروفیسر حیدر کے ؟"

"ہاں۔"

"ذرا مجھے دے سکو گے دو چار دن کے لئے، میں نے پچھلے دنوں ایک نوٹ بھی نہیں
لیا۔"

غازی کو ظفر نے اپنے نوٹس پکڑا دیئے تو وہ خاموشی سے سیڑھیاں اتر گیا۔
ظفر کو وہ رات یاد آ گئی جب وہ اسی طرح بڑی آہستگی سے غازی کے ساتھ گلنار
کے کوٹھے پر گیا تھا۔ گلنار گا بجا کر ابھی ادپر آئی تھی۔ وہ دونوں اوپر پہنچے تو سب سے پہلے

اس کی نظر بی بی جی پر پڑی ۔ وہ تخت پوش پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں ۔ سلام پھیر کر انہوں نے بڑے تپاک سے کہا ۔

"آؤ بیٹا غازی آؤ آؤ ! رک کیوں گئے ، آجاؤ . . ."

غازی بی بی جی کے پاس تخت پوش پر بیٹھ گیا ۔

" اتنے دن کہاں رہے ؟"

" امتحان تھا جی ، بی اے کا . . . بس اسی کی تیاری میں لگا رہا ."

"اچھا اللہ پاس کرے ، بڑا افسر کرے ، نصیبوں میں بھلے دن لکھے ہوں ۔ ملک کی قسمت تجھ سے کھلے ۔ عزیزوں کو تجھ سے فیض حاصل ہو . . . یہ کون ہے ؟"

"یہ ہے جی میرا دوست ظفر ۔"

"اچھا اچھا ، سلامت رہے خوش رہے ."

" ابھی پیچھے سے آئی ہے نازی . . . نازی ! . . بیٹی نازی ، غازی آیا ہے . . . نازی غازی ، غازی نازی . . . کیا پیارے نام ہیں . . . غازی آیا ہے اے . . ." بی بی جی نے گلنار کو آواز دی جسے وہ پیار سے نازی بلاتی تھیں ۔

گلنار غسل خانے میں تھی اور پانی کے چھپاکوں کی آواز آرہی تھی ۔

"جمعرات کو بھی نہیں آئے تم اس دفعہ ۔ مجھے تو فکر سا ہو گیا ۔ جی میں آئی کہ ہوسٹل جا کر دیکھوں ، پھر میں نے سوچا خواہ مخواہ . . . کہیں تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے ."

"وہ جی میں نے بتایا ناں آپ کو امتحان ہو رہے تھے . . ."

ایک بار پھر بی بی جی طوطے کی طرح آنکھیں پھر اپھر اکر دعائیں دینے لگیں۔ ۔
"جمعرات کو تو نازی نہ کسی مجرے پر جاتی ہے نہ گانے کی محفل گھر پر لگاتی ہے۔ نو گزے کی قبر پر خود جا کر چراغی چڑھاتی ہے۔ اس بار بسم اللہ کے بیٹے کے ختنے تھے جمعرات کو۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا چل گلنار۔ ان کے گھر ہماری بارہ پگڑیوں کی مٹھائی بنتی ہے۔ چل ذرا گھڑی دو گھڑی ہنس بول آئیں۔ کہنے لگی نہ بی بی جی۔ ۔ ۔ جمعرات کو ملک غازی آتے ہیں ہمیشہ۔ ۔ پیروں فقیروں کا دن ہے۔ میں کسی طوائف کے گھر نہ جاؤنگی۔ میں نے ہنس کر پوچھ لیا اور تو کیا ہے بیٹی؟ بس جی اتنا روئی اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں، نزلہ ہو گیا۔ اس بات کا ذکر نہ کرنا اس سے، ناراض ہو جائیگی مجھ سے۔ ۔ ۔ آ جا نازی۔ ۔ ۔ توبہ کتنے گھنٹوں میں منہ دھوتی ہے تو۔ دیکھ تو غازی صاحب کب سے آتے بیٹھے ہیں۔"

گلنار سفید رنگ کی بے جان سی لڑکی تھی جسے بات بات پر پلکیں جھپکانے اور لب کاٹنے کی عادت تھی۔ ماتھا مردوں کی طرح اونچا، کھلا اور کونے دار تھا۔ بات کو عموماً درمیان میں ہی چھوڑ دیتی، کسی کی بات سنتی تو دائیں بائیں یوں دیکھنے لگتی جیسے خوفزدہ ہو۔ ڈھنگ سے میک اپ کرنے کا طریقہ ابھی اس نے شاید اس لئے نہ سیکھا تھا کہ اس کی سفید گردن ابھی جلوہ آرا تھی۔ دن بھر نہایت گندے میلے ہوئے نیلے کاسنی کالے کپڑے پہنے رہتی پاؤں میں کبھی جوتی نہ دیکھی۔ لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر ریڈیو سنتی، گلنار دراصل گرگٹ کی مانند تھی۔ رات کے وقت وہ بڑی اعلیٰ قسم کی جہاندیدہ طوائفوں کی بزنس فیل کر دیتی اور دن کے وقت اللہ میاں کی گائے بنی رہتی۔ اسلئے اسے سمجھنا مشکل تھا۔ ۔

بسم اللہ جی نے ان دونوں کو بڑی محبت سے باورچی خانے میں بٹھا کر بھنے ہوئے

بٹیرے، ڈیلے کا اچار اور گاجر کا مربہ پیش کیا۔ اور جب وہ کھا چکے تو وہ گرم پانی کی

بوتل میں چوہے سے کینٹی اور گرم پانی ڈالنے لگیں اور بولنے لگیں۔

"سن بیٹا! اب میں چلتی ہوں۔ جب نمازی چلا جائے نازی بیٹا تو اندر سے

کنڈی لگا لینا۔ رستہ کھلا نہ رہے۔"

ایک بار دل کھول کر دعائیں دینے کے بعد کلیجے سے گرم پانی کی بوتل لگائے

وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ظفو اس کھڑکی میں جا بیٹھا جہاں سے چاندنی میں شاہی مسجد بڑی پراسرار نظر آ

رہی تھی۔۔۔"

غازی اور گلنار ایک ہی پلنگ پر بیٹھے تھے۔ دونوں چپ تھے۔ نہ نمازی

نے گلنار سے کوئی بات کی نہ گلنار نے اسے بلایا۔ بڑی دیر جب اسی طرح گذر گئی تو

گلنار نے آہستہ سے پوچھا۔

"تیل ڈال دوں آپ کے سر میں؟"

غازی نے مثبت جواب دیا نہ منفی۔ آرام سے پلنگ پر لیٹ گیا۔ گلنار نے الماری

میں کڑوے تیل کی کپی نکالی۔ غازی کے سر کو اپنے زانو پر رکھا۔ اور بڑے انہماک

سے اس کے سر میں چمپی کرنے لگی۔ بغیر بولے کوئی پون گھنٹہ تیل ڈلوانے کے بعد

غازی کا ماتھا اور کان تک تیل سے تر ہو گئے تو گلنار نے تولیے سے اس کا سر اور اپنے

ہاتھ پونچھے اور ڈریسنگ ٹیبل سے سرمہ دانی اٹھا لائی۔

غازی کے سر کو مضبوطی سے پکڑ کر نازی نے جلدی جلدی دو سلائیاں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

غازی نے گلنار کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لیا اور بڑی عقیدت سے اسے بوسہ دے کر بولا۔

"تو جی . . . اب ہم چلے . . ."

گلنار وہیں بیٹھی رہی لیکن جب وہ سیڑھیاں اتر رہے تھے تو اوپر دالانے کمرے کی چٹخنی لگنے کی آواز ظفر نے خصوصی طور پر سنی۔

"یہ کیا واہیات بات ہے"

غازی بت بنا اترتا جا رہا تھا۔

"کچھ پیسے نہیں دیتے یہاں"

"بی بی جی ۔ اکنی نہیں لیتیں مجھ سے۔ بیٹا بنایا ہوا ہے انہوں نے مجھے"

جب انہوں نے ہوسٹل کے لئے تانگہ لے لیا۔ تو ایکبار پھر ظفر نے پوچھا۔

"یار یہ کیا واہیات بات ہوئی تیل لگوایا، سرمہ ڈلوایا اور لوٹ کے بدھو گھر کو آیا . . ."

"بس اتنی ہی بات ہے"

"اتنی ہی بات کے لئے اتنی دور آتے ہو . . . ؟"

غازی بہت دیر خاموش رہا۔ جب موہنی روڈ کے سامنے تانگہ پہنچا تو وہ

آہستہ سے بولا۔

"میری ماں بھی یہی کچھ کرتی تھی۔ پہلے سر میں تیل ڈالتی تھی۔ پھر سر سے کی دو سلائیاں

لگاتی تھی آنکھوں میں اور پھر میرا ماتھا پوچھتی تھی۔"

اس کے بعد ظفر کبھی غازی کے ساتھ نازی کے کوٹھے پر نہ گیا۔ اسے اس کوٹھے

سے خوف آتا تھا۔ ایسا گھریلو ماحول تو ان کے تین منزلہ مکان میں بھی نہ تھا!

غازی کے جانے کے بعد ظفر نے موٹی کتاب میں سے رشیدہ کے نام لکھا ہوا

خط نکالا اور اسے پوسٹ کرنے آہستہ آہستہ نیچے اتر گیا۔

رشیدہ کو دو خط ایک ساتھ ملے۔ ایک تو ظفر کا دوسرا وہ دعوت نامہ جو اس کی

ہم جماعت طیبہ نے اپنی سالگرہ کے بلاوے کے طور پر بھیجا تھا۔

ظفر کا خط سادہ نیلے کاغذ کا چھوٹا سا پرچہ تھا۔ نہایت ہی سادہ اور مختصر:

محترمہ!

شاید آپ یہ خط پا کر خفا ہوں گی۔ ممکن ہے آپ میری رپورٹ بھی کر دیں لیکن

خوفزدہ ہونے کے باوجود میں آپ کو خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا۔ بس آپ سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جیسی

میں نے پاکیزہ لڑکی نہیں دیکھی۔ میری تمنا ہے کہ آپ کبھی ملوث نہ ہوں۔

نیک دعاؤں کے ساتھ : ظفر احمد

اس خط میں ایک حرف بھی محبّت کے متعلق نہ تھا۔ پھر بھی رشّو کا دل مرغی کے پوٹے کی طرح خدشات کے پتھروں سے بھر گیا۔ اس نے جلدی سے کنڈی چڑھالی۔ اور اس خط کو چھپانے کی جگہ ڈھونڈنے لگی۔ لیکن پھر اس نے حوصلہ کر کے اس خط کو جلا دینے کی ٹھانی۔ مگر محبت نامے کو جلا دینا اتنا سہل نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس وقت جبکہ یہ زندگی کا پہلا تجربہ ہو۔

رشّو جان نے بلّی کے بچے کی طرح اس خط کو چھپانے کے کئی جتن کئے۔ کبھی تکئے تلے۔ کبھی نوٹ بک میں۔ کبھی پرس میں۔ لیکن کہیں بھی اس خزینۂ جانسوز کو رکھنے سے تسلّی نہ ہوئی۔ بالآخر اس نے اس حرزِ جان کو ٹائی کے اس خالی ڈبے میں رکھا جو خالد نے اسے بہاولپور سے چلتے وقت دیا تھا۔ اس ڈبے کو ٹرنک کی تہہ میں اخبار اور لٹھے کی شلواروں کے درمیان چھپایا اور چپ چاپ پلنگ پر جا لیٹی۔

ظفر پر یکدم اسے غصّہ آنے لگا۔۔۔ یہ ہوتا کون ہے مجھے خط لکھنے والا۔۔۔ میں اسے کالج سے نکلوادونگی۔۔۔ اونہہ!۔۔۔ ہاں۔۔۔ بالکل"

ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ پر بھی غصّہ آنے لگا۔ اللہ میں نے اسے ٹائی کے ڈبہ میں کیوں رکھ لیا ہے؟۔۔۔۔ جلا دینے کے قابل تھا۔۔۔ بالکل۔۔۔ بالآخر دل نے سمجھایا کہ یہ تو پرنسپل کو دکھانے کی خاطر اٹھا رکھا ہے۔ ایسی مرمّت کراونگی جناب کی کہ ساری ظفر مندی شکستِ فاش میں بدل جائے گی۔

بڑی دیر تک وہ ظفر کے متعلق سوچتی رہی جب غصّے کا پہلا اُبال ختم ہو گیا تو

ظفر کی شکل ابھرنے لگی۔

ظفر بلیلیٹز کی طرز کا لڑکا تھا کہ الہڑ کھرے پن، بدہیتی اور بد وضعی کے باوجود اس پر نظر پڑتی تھی۔ کپڑوں کی طرف سے وہ ہمیشہ لاپروا رہا۔ بوٹ پالش کئے اسے بنتے گذر جاتے۔ شیو کے معاملے میں کبھی کبھی تو وہ اس قدر محتاط ہوجاتا کہ دن میں دو بار کھونٹی نکالے پھرتا اور کبھی ہلکی ہلکی داڑھی رکھ کر نیوی کٹ کا سگریٹ بن جاتا۔

ظفر پر جو بھی موڈ طاری ہوتا اس میں ہمیشہ شدت کا پہلو ہوتا۔ ایک بار نویں جماعت میں اسے سنگھاڑے کھانے کا خبط ہوا تھا۔ ایک دن میں سیروں سنگھاڑے کھا لیتا۔ اور منہ سے لیکر آنتوں تک سفید سیمنٹ سے بھر جاتا۔ کالج کے پہلے دو سال مباحثوں میں اسقدر گرم جوشی سے جتا رہا کہ ہر ڈکلمیشن، ہر کونٹسٹ ہر مباحثہ اس کے بغیر نامکمل رہتا۔

کالج میں اسے کنگ آف سپیکرز کہتے تھے۔ بحث کو الجھانا، مباحثے میں شریک ہونے والے تمام ارکان کو پٹڑی سے اتارنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایوان میں جو بھی بحث اس کی زیر صدارت ہوتی ہمیشہ کامیاب ہوتی۔ اور جس بحث میں وہ سپیکر بن کر داخل ہوتا اس سیشن میں صرف اس کو داد ملتی۔ وہ بڑا مجمع گیر آتش نفس اور خوش گفتار تھا۔ انگریزی، اردو، پنجابی تینوں زبانوں میں اتنی روانی سے اور اتنی جلدی بولتا جیسے بجلی کے مٹن کے بٹن دبا رہا ہو۔

تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا تو اسے تھرڈ ڈویژن کے باوجود بڑی آسانی سے داخلہ

مل گیا۔ پرنسپل کو خیال تھا کہ یہ آدمی اپنے میرٹ کی وجہ سے کالج کے لیئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ظفر مکمل طور پر مباحثوں سے اکتا چکا ہے۔ اور تو اور وہ تو ڈیکلیمیشن کو سننے کے لیئے بھی نہ جاتا۔ بہت سے لڑکوں نے اُسے مباحثوں میں شرکت کرنے پر مجبور کیا۔ ہر بار وہ یہی کہتا۔

"بحث کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ بال کی کھال اکھیڑنے سے حاصل؟ میرا بابا سے آپ چاہے کچھ سمجھتے ہوں مجھے اپنے نظریوں کے متعلق شکوک نہیں ہونے چاہییں۔ آپ اگر اس عہد میں بھی دنیا کو چپٹا سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ یہ ملک آزاد ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہونا چاہیئے۔"

مباحثوں کی ہنگامہ خیز فضاؤں سے نکل کر ظفر نے اپنے آپ کو لفنے کی بکراں وسعتوں کے حوالے کر دیا۔ بی اے کے فائنل میں پہنچنے تک اس کے پاس تین ٹیپ ریکارڈر ایک ریڈیو گرام۔ دو ٹرانزسٹر اور ایک پرانا گراموفون اکٹھے ہو گئے۔ ہر محفل موسیقی میں سینے پر ہاتھ رکھے شرکت کرنا اس کا اولیں فرض تھا۔ اس کے پاس روشن آرا، نزاکت علی، سلامت علی، امانت، فریدہ، ثریا ملتانیکر، زاہدہ سلطانہ۔ کے وہ ٹیپ تھے جو شاید ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں بھی موجود نہ تھے۔ وہ گھنٹوں پکا گانا سن سکتا تھا۔ اس بحر ذخار سے نکلتا تو ریڈیو گرام پر فلمی گیت سنتا۔ لتا اور نورجہاں کے گیت، خورشید انور کی دھنیں، جھنڈے خاں کے گیت، یہ موسیقی چیتی دار پاپوں کی طرح ہلکی پھلکی اور دل کی فضا کو قائم کرنے کے لیئے ناگزیر تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ گراموفون نکال کر پلنگ

کے پاس رکھ لیتا۔ اور پرانی فلموں کے گیت بجاتا۔ دیوداس، چنڈی داس، زندگی
مکتی، ابھاگن، ودیاپتی، چترلیکھا کے گیت۔ ان گیتوں کی فضا سے وہ نا واقف تھا۔ ان
فلموں سے اس کی پود دور ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے ان گانوں سے دیوانہ کا سا
عشق تھا۔ سہگل، کانن بالا، خورشید، کے سی ڈے، وحیدن، اختری بائی کے گیت،
پہاڑی سانیال اور سریندر کے نغمے، رام دلاری کا لوچ۔ اسے ان گیتوں سے عشق تھا۔
وہ ان گیتوں کی فضا میں سانس لیتا تھا۔ وہ کنول کے پھول کی طرح ان گیتوں کی سروں پر
ڈولتا پھرتا۔

ایک طرح سے یہ عہد ظفر کا عالم عرفان تھا۔ اس وقفے میں وہ اپنے آپ سے آگاہ
ہوا۔ اسنے ہر طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنے آپ کو موسیقی کے قلعے میں محبوس کر لیا۔

اس قلعے میں سے اسے نکالنے والی فلم کی سوہنی تھی۔ موسیقی سے رشتہ ٹوٹا تو فلم
بینی سے ناطہ پیدا ہو گیا۔ یہ عہد ظفر کے لیے بڑا شورش انگیز تھا۔

گو اس دور کا قیام مختصر تھا لیکن اس عہد میں ظفر نے صرف دو کام کیے۔ ایک تو اپنے
لباس پر توجہ دی اور دوسرے دن میں تین تین شو دیکھے۔ فلمی رسالوں کی چالیس سیر ردی اس
کے کمرے میں جمع ہو گئی۔ جیسے یہ شوق ختم ہو جانے پر اس نے چھ آنے سیر کے حساب سے ردی
والے کو بیچ دیا۔ اس ردی میں انڈیا کا مشہور فلم فیئر، فلم کوارٹرلی، ہندوستان کا ہفتہ وار فلمی
اخبار جس کی ایڈیٹر غالباً ایک عورت تھی۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے رسالے جن کی چھپائی
لکھائی نادیدہ زیب، نیوز پرنٹ کا کاغذ، اور ٹرائی کلر کی تصویریں سبت ناقص ہوا کرتی تھیں،

ان دنوں اس کے پاس گیری کوپر، گرگیری پک سے لے کر صبیحہ، مسرت نذیر اور زرینہ ریشماں تک کے نام جعلی اور حقیقی حالات کی ذہنی ڈائری موجود تھی۔ وہ ہندوستان کی فلموں اور فلم انڈسٹری آف پاکستان پر سیر حاصل بحث کرسکتا تھا۔ سنسر اور پروڈکشن کی مشکلات خام فلم کی دستیابی۔ ان ڈور شوٹنگ کی خرابیاں، آؤٹ ڈور شوٹنگ میں ساؤنڈ اور لائٹ کی تمامات۔ کہانی میں جو الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں انہیں سلجھانے سسپنس پیدا کرنے اور نکتہ عروج بنانے کے کئی عمدہ طریقے، اسے معلوم تھے، اس میں انگمار، برگمن، الفرڈ ہچکاک ستیا جیت رے اور سسل بی ڈیمل کی روح کا ملغوبہ تڑپ رہا تھا۔ ان دنوں وہ ایک فلمساز تھا، کیمرہ مین تھا، صوتی اثرات کا ماہر تھا۔

یہ عہد بڑا جنون خیز اور دہشت انگیز تھا۔ شاید وہ فلمی دنیا میں ڈوب کر کبھی نہ ابھرتا اور بالآخر کسی سٹوڈیو میں لائٹ آن آف کرنے پر مامور ہو جاتا لیکن یہ دور بھی ختم ہوگیا۔۔۔ اور اس کے خاتمے کی ساری ذمہ داری غازی پر تھی۔۔۔

فلمی جنون ختم ہونے کے بعد ظفر پر قلمی دوستی کا بخار چڑھا۔ اخباروں، رسالوں میں سے ایڈریس لیکر یہ سلسلہ چلایا گیا۔ ظفر کے جنون میں ایک خوبی ضرور تھی۔ وہ اپنے سودائی پن کو شاہجہان کی طرح تاج محل صورت ضرور بنادیا کرتا تھا۔ قلمی دوستی کا حلقہ جب بہت بڑھا تو اس نے ایک سوسائٹی کی شکل اختیار کرلی۔ تیسری منزل پر ایک بورڈ نصب کیا گیا جس پر انگریزی میں فلورسنٹ رنگوں میں لکھا گیا۔۔۔

انٹرنیشنل فرینڈشپ ہاؤس۔ سیکریٹری۔۔۔ ظفر احمد ملک۔"

رفتہ رفتہ بیرونی ممالک سے ڈاک آنے لگی۔ نائجیریا، روڈیشیا، تنزانیہ، ہیٹی
لیبیا، مسقط، صومالیہ جیسی نامانوس جگہوں سے بدیسی زبانوں میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں
خط اور تصویریں ظفر تک پہنچنے لگیں۔ وہ نزانز، سنکیانگ، کاسٹاریکا، لیما، سان مارینو،
تنزانیہ اور روڈ ٹاؤن جیسے نام اپنی گفتگو میں آسانی سے استعمال کرنے لگا۔ ان دنوں
اس کے پاس عجیب و غریب خوش رنگ ٹکٹ اکٹھے ہو گئے۔

مختلف ممالک، ان کے عقاید، رسومات، نسلی امتیازات، مذہبی تنازعوں میں ظفر
کو بڑی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ رفتہ رفتہ ان علاقوں سے محبت کرنے لگا تھا جس
میں اس کے دور افتادہ دوست بستے تھے۔ یہ شوق اس کے ان خوابوں کا باعث بنا
جو وہ امن کے متعلق دیکھنے لگا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر دنیا کے تمام نوجوان عالمی امن کے
لئے ایسی سوسائٹیاں بنا کر اپنے اپنے گھر کی تیسری منزل پر اسی نام کے بورڈ ٹانگ لیں تو
کوئی وجہ نہیں کہ بقائے امن کی مشکل آسان نہ ہو جائے۔

اسی سلسلے میں وہ شہر کے گلی کوچوں میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو روک کر ان سے
اپنے ریزولیوشن پر دستخط کرنے کو کہتا۔ اس کے پاس اس طرح کے لاکھوں دستخط جمع ہو
گئے تھے۔ ایسا ہی دستخط حاصل کرنے کے لئے اس نے ایک دن رشیدہ کو بھی گیٹ
کے پاس روک لیا۔

"بس، ایک لمحہ رکیے ذرا . . ."

رشو نے اس وقت یوں محسوس کیا جیسے زمین اس کے پیروں تلے سے کھسک

گئی ہو۔۔۔

"جی"

"ہم نے ایک موومنٹ بنائی ہے۔۔۔ عالمی امن کی تحریک۔۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ۔۔۔۔۔"

"جی مجھے کسی تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔۔"

"اس تحریک کے لئے آپ کو کچھ نہیں کرنا ہوگا مس! مجھے صرف آپکے دستخط چاہییں اس جگہ۔۔۔"

ظفر نے وہیں فل سکیپ کاغذوں کا پلندہ رشو کو پیش کر دیا۔ اغراض و مقاصد پر غور کئے بغیر رشیدہ نے جلدی سے اپنے نام کو آخری دستخطوں کے نیچے لکھ دیا اور لسٹر کی چادر سنبھالتی آگے چلی گئی۔

نہ جانے اس لڑکی میں کیا بات تھی۔ نہ جانے اس میں کونسی ادا ایسی تھی جس نے یکدم عالمی امن کا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ بد دلی سے ظفر نے پلندے کو موٹر سائیکل کی ڈگی میں بند کیا اور دیر تک اس لڑکی کے متعلق سوچتا رہا جسے جاننے کے بعد عالمی امن کی بقا بے معنی سی ہو گئی۔ چونکہ ظفر پر مہینوں کی کیفیت پلوں میں گذر جاتی تھی۔ اس لئے جب اسے رشیدہ سے محبت ہوئی تو وہ فیس صورت گرا۔ محبت کی واردات اس پر وجدانی تھی۔ وہ چاہتا تو اسی وقت کپڑے جھاڑ کر بنوں کو نکل جاتا۔ اپنا نام دھیدو رکھواتا اور کانوں کو چروا کر ان میں مندرے ڈلوا لیتا۔ وہ اگر پسند کرتا تو بی آر بی نہر کا

رخ موڑ کر خالہ فیروزہ کی کوٹھی کے آگے سے گذار دیتا۔

اس کے دیوانے پن کی کوئی حد نہ تھی ۔ لیکن ان باتوں کا اسے خیال نہ آیا۔ اُسے تو بس یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے وجود پر پٹرول کی بوتل چھڑک بھک سے جلا دیا ہو۔ ۔ ۔ ظفر کہاں ہے ؟ ۔ ۔ کون ہے ؟ ۔ ۔ کیا کرتا ہے ؟ ۔ ۔ کیوں ہے ؟

۔ ۔ ۔ ان باتوں کا واہمہ بھی اس کے دماغ سے نکل گیا تھا۔ انا کے تمام سرخابی پر اتار پھینکنے کے بعد اندر سے وہ فاختئی رنگ کی کبوتری نکل آئی تھی جس کا سارا وجود ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

یہ رنگ تھا رشیدہ کی محبت کا رنگ ۔ پیروں میں روندا ہوا رنگ ۔ وہ کالج کے ہر واقف لڑکے سے رشو کی باتیں کرتا۔ فرصت کے لمحوں میں اسے خط لکھتا۔ بازاروں میں سے اس کے لیے تحفے خریدتا۔ اور پھر انہیں اپنے ٹرنک میں بند کر دیتا۔

رشو اس پر گھٹا ٹوپ بادل بن کر چھا گئی ۔ ۔ ۔ لیکن یہ باتیں بہت بعد کی ہیں۔

جس وقت عالی اس کے رزیلیوشن پر دستخط کرنے کے بعد رشیدہ لیڈیز روم میں پہنچی تو وہاں سے پولیٹیکل سائنس والی لڑکیوں کا گروہ باہر نکل رہا تھا۔ ان لڑکیوں کے ناموں سے تو رشو واقف نہ تھی ہاں علیک سلیک ضرور تھی۔ اونچی ایڑیوں کو ٹکٹکاتی ان خوبصورت بلاؤں کا غول بیابانی چلا گیا تو وہ لیڈیز روم میں پہنچی۔ طیبہ۔ ڈیسل اور طاہرہ جو آپس میں بہنیں ہی تھیں حسب عادت لمبی مہاگنی کی میز پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ چلغوزے کے چھلکے، چائے کے پیالے اور ان کے وجود سیاہ میز کی سطح پر منعکس ہو رہے تھے۔

"اللہ بھی تم کہاں تھیں رشو؟" ڈمپل نے لمبے لمبے ناخنوں کو لہرا کر پوچھا۔

"یہ نکلی تو تمہارے ہی ساتھ تھی۔ آگے خدا جانے کہاں غائب ہو گئی۔" طیبہ بولی

"اچھا بھئی تم بتاؤ رشو سائیکلوجی ڈیپارٹمنٹ کا سب سے اچھا لڑکا کونسا ہے؟"

طبلے کا دایاں بایاں کبھی کبھی بجنے لگا۔ رشیدہ کو اپنے ہاتھ ٹھنڈے پڑتے محسوس ہوئے۔

"زیادہ ووٹیں غازی کی ہیں۔" طیبہ نے جواب دیا۔

"غازی؟ کونسا غازی؟" رشو نے جی میں سوچا۔

"مجھے تو کسی کا نام نہیں آتا۔"

"بھئی سب سے پرامی ننٹ گروپ ہی غازی کا ہے۔ ظفر ہے، افتخار ہے۔ غازی ہے رشید ہے۔ کبھی کبھی عباس اور ذوالفقار بھی ان کے گروپ میں مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ دونوں دراصل ٹریٹر ہیں۔ ہیں ناں طیبہ . . . ؟"

"بتاؤ ناں کرن سب سے اچھا ہے۔ یہ ساجدہ اور راحت تو بالکل گھنی ہیں۔ بس کبھی کبھی پھنسی جاتی ہیں۔"

رشیدہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ میں جپ مالا پکڑا کر کہا ہو جا اپنے من مندر کے پجاری کو ڈھونڈ لے۔

مہابھارت کے بن پرب میں لکھا ہے کہ جب دمینتی نور کے سانچے میں ڈھلی راجہ مہاراجوں کو غلط انداز سے دیکھتی ہاتھ میں ورمالے سوئمبر میں آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ اندر اگنی جمراج اور برن چاروں نل کے ہم شکل بنے بیٹھے ہیں، اپنی محرومی قسمت پر برہا

دکھ ہوا۔ سوچنے لگی کہ اب راجہ نل کے گلے میں جے مالا کیسے ڈالوں گی۔ یہاں تو چھ راجہ
ہم شکل بیٹھے ہیں۔ پھر بہت سوچا کی۔ کبھی آگے نکل جاتی کبھی پیچھے کو بڑھتی۔ مستک پر پسینے
کے قطرے اکٹھے ہونے لگے۔ ہاتھوں میں جے مالا کانپنے لگی۔ آخر خیال آیا کہ پنڈت کہتے ہیں کہ
دیوتاؤں کا سایہ نہیں ہوتا۔ وہ پلک نہیں جھپکتے۔ اور ان کے پاؤں کبھی دھرتی کو نہیں چھوتے۔
اب جو غور سے دیکھا تو اندر اگنی جم راج اور برن میں وہی باتیں پائیں۔ جنکا پنڈتوں اور
ودوانوں نے انتر سمجھایا تھا۔ بے خوفی سے آگے بڑھی۔ دیوتاؤں کو پرنام کیا اور ور مالا کو
مہاراجہ نل کے گلے میں ڈال دیا۔ ۔ ۔

رشو جان کو تو کسی بدبختی ماں نے راجہ نل شناخت کرنے کا طریقہ نہ بتایا تھا۔ ہاں ثانی کے
ڈبے میں ایک خط ضرور تھا۔ اور عالمی امن کے ریزولیوشن پر دستخط کروانے اور کرنے کے
چند لمحے تھے۔ لیکن یہ ایسی کمزور نشانیاں تھیں کہ وہ گھبرا گئی۔

”اللہ یہ بھی گھنی ہے ساجدہ اور راحت کی طرح ۔ ۔ ۔ اچھا یہ بول غازی اچھا ہے کہ
ظفر کہ افتخار ۔ ۔ ۔ “

”مجھے کیا پتہ ۔ ۔ ۔ “ وہ زچ ہو کر بولی۔

”اچھا یہ تو پتہ ہے ناں کہ آج میری سالگرہ ہے اور تمہیں آنا ہے میری سالگرہ پر پورے
چار بجے ۔ ۔ “ طیبہ نے سوال کیا

”میں نے ابھی خالہ جان سے نہیں پوچھا۔“ رشو نے جواب دیا۔

”ہفتہ ہوا تمہیں دعوت نامہ بھیجا تھا، ابھی تک اجازت نہیں لی۔ نہیں لی تو لے لینا

اجازت ... " راحت بولی۔

" بھئی رشّو سب ساڑھی پہن کر آ رہی ہیں۔ تم بھی پلیز ساڑھی پہننا ... "

" ساڑھی؟ ... میں نے کبھی ساڑھی نہیں پہنی۔ " وہ آہستہ آہستہ اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

" تمہارے لئے ساڑھی میں لاؤں گی ... اچھا؟ " ڈمپل بولی۔

" سب وہیں تیار ہوں گی۔ خوب مزہ رہے گا۔ زاہدہ کہاں ہے اس وقت؟ "

" لائبریری میں ہوگی۔ اس کے ذہن پر تو فرسٹ آنے کا خبط سوار ہے ... "

خالہ فیروزہ سے اجازت لئے بغیر جب رشیدہ راجگڑھ روڈ پہنچی تو اسے معلوم نہ تھا کہ یہ شام اس کے لئے اتنی یادگار ہوگی۔ طیبہ کے والد ریٹائرڈ سول سرجن راجگڑھ میں اس جگہ رہتے تھے جہاں سے چوبرجی کے تینوں مینارے صاف نظر آتے ہیں۔ سامنے ریواز گارڈنز کی وہ کوٹھیاں تھیں جنہیں آہستہ آہستہ مسمار کیا جا رہا تھا۔ یہ کوٹھیاں مسکونہ صاحبان عالی شان کی اتنی پرانی تھیں اور اتنے سیلاب دیکھ چکی تھیں کہ ان میں بسنے والے والا تبار جنیٹس گیجز ہستم کے اعلیٰ حضرت افسران کو ان کوٹھیوں کو منہدم کرنے میں ہی عافیت نظر آتی تھی۔ یہ ان عمارتوں کی کھپریل سے بنی تھیں۔ سامنے محرابی برآمدے اور غسل خانوں میں کموڈ تھے۔

اس علاقے سے آگے بڑھ کر غرب رویہ سڑک پر جہاں سے ایک سڑک بہاولپور روڈ کو کہ ایک زمانے میں جہاں کوٹھی کمشنر بہادر کی ہوا کرتی تھی۔ ایک سڑک نواں کوٹ

کی جانب۔ ایک راستہ کہ سڑک جس کی عموماً شکست و ریخت کی عادی تھی سمن آباد کو، ایک کل نا سڑک جو آگے چل کر خاصی کشادہ تھی، چاہ پچھواڑے کو نکلتی تھی۔ اس جگہ جہاں سڑکوں کے اتنے ڈانڈے ملتے تھے، اب صرف تین مینار کی چوبرجی کھڑی ہے۔

یہ باغ پر بہار کہ از کوٹ سے لے کر تا مغرب رو یہ لاہور بکنارہ دریائے راوی تیار ہوا تھا۔ موسم برشگال اور دریائے راوی کے صدمے سے مسمار ہو گیا۔

حال اس عمارت کا یوں بیان کرتے ہیں کہ عالمگیر کی چہیتی بیٹی زیب النساء تخلص جس کا مخفی تھا۔ اور جو صاحب دیوان ہونے کے ساتھ ساتھ حسن و خوبی میں یکتا تھی۔ چوبرجی کو اسی شہزادی نے معرفت میاں بائی دایہ خود تعمیر کرایا تھا۔ میاں بائی نے کہ خواص نہیں قابلہ، منظور نظر محرم راز زیب النساء تھی۔ بڑی محنت اور لگن سے یہ باغ اپنی نگرانی میں مکمل کروایا۔ اسی لئے اس جگہ کا نام باغ میاں دایہ مشہور ہوا۔ جب ایک روز زیب النساء یہ باغ دیکھنے چلی تو راستے میں سنا کہ چند اشخاص آپس میں اس باغ کو میاں بائی کا باغ کہہ رہے ہیں۔ دل رنجیدہ ہوا کہ جس باغ کے توسط سے ناموری حاصل کرنے کی آرزو تھی سو پہلے ہی کسی کے لئے نامزد ہو چکا ہے۔ اب یہی مناسب سمجھ کر جو کوئی در باغ پر جھکر دعائے عافیت دے باغ اسی کو عطا کر دوں۔ جب شہزادی چوبرجی کے دروازہ کلاں پر پہنچی تو اتفاقاً میاں بائی نے کورنش بجا کر دعائے عافیت دی۔ شہزادی عالی وقار نے باغ مذکورہ میاں بائی کو عطا کیا اور باغ دیکھے بغیر قلعے

کو اس راہ سے روانہ ہو گئیں جہاں پہلے افسرانِ والا شان کی کوٹھیاں تھیں۔

کئی حکایاتِ عاشقانہ عاقل خان اور زیب النساء کی مشہور ہیں۔ لیکن اسی باغ کی تیاری سے متعلق ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ باغِ مذکورہ کی چنائی ہو رہی تھی شہزادی شہ نشین میں بیٹھی اپنی ایک ہمجولی کے ساتھ چوسر کا شغل کر رہی تھی۔ شہ نشینِ ثانی میں بارہ دریے تھے۔ استرکاری ہو رہی تھی۔ مزدور آجا رہے تھے۔ عاقل خاں بھی طالب دیدار ہوا اور مزدوروں کے زمرے میں شامل ہو کر سر پر تغاری چونے کی دھرے شہ نشینِ ثانی تک آیا۔۔ مزدوروں کا دستور ہے کہ معمار کے آگے تغاری ڈالتے وقت ایسے جملے کہتے ہیں "لے گارا لے یا چونا لے"۔۔۔

عاقل خاں نے بھی باین تمنا کہ زیب النساء میرے حال سے باخبر ہو یہ شعر پڑھا۔

من در طلبت گرد جہاں می گردم

گیر۔۔ استاد آہک!

چوسر بازوں کا بھی معمول ہے کہ کوڑی پھینکتے وقت پانسہ مطلوبہ کا نام لیتے ہیں۔ زیب النساء جو کہ خود ذکاوت کی پتلی تھی فوراً بولی

گر باد شوی بوی زلفم نرسی

شش پنج دو دو یک!

کہتے ہیں کہ یہی عاقل خان سوختہ جان شہزادی عالی وقار کی ناموس

پر مرمٹا۔ ایک روز بہانہ ملاقات کا یہ سوچا کہ تمام اشخاص سرکاری درباری کی ضیافت کی۔ بعد طعام شاہانہ عالمگیر کی خدمت میں امیدوار ہو کر عرض کی ماحضر کو محل سرائے سلطانی میں بھی پہنچانے کی اجازت مرحمت فرمائی جاوے۔

جب دیگیں پراز طعام ہائے لذیذہ روانہ ہوئیں تو خود بھی ایک دیگ میں دیدار کا دیوانہ پوشیدہ ہو بیٹھا۔ کسی بدفطرت غماز نے مخبری کی۔ بادشاہ سلامت بنفیس نفیس محلسرا میں آئے۔ ایک دیگ سے کچھ طعام نکال کر چکھا۔ اور فرمایا کہ دیگیں ابھی خام ہیں اس وقت تک آگ پر رکھو جب تک پختہ نہ ہو جائیں۔

شہزادی فرخندہ روبن آگ کی سیخ پر لوٹی کباب ہوئی۔ وہ ماہی بے آب ان کی ناموس پر قربان ہوا۔ جل کر راکھ ہوا۔ لیکن ایک بار بھی لب نہ کھولے۔ محبت کا پختہ راز سینے میں لئے اگلے جہاں کو کوچ کیا۔ شہزادی زیب النسا خاموش رہی۔ اسکے اندر جو کچھ جل چکا تھا اس کی کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بہت عرصہ بعد ایک دن اس نے شالا مار میں میانہ محل میں بیٹھ کر کہا:

اے آبشار نوحہ گراز بہر چیستی ؟
چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی ؟
آیا چہ درد بود کہ چوں من تمام شب
سر را بسنگ می زدی و می گریستی ؟

جب ڈاملیل رشو کے ہیٹی کورٹ میں ساڑھی کی سلوٹیں جھاڑ رہی تھی تو رشو کے جی

میں آئی کہ ڈمپل کو ظفر کے متعلق بتا دے۔ لیکن پھر دل میں سوچا کہ کسی کے کان میں کہی بات کبھی اسی کان تک نہیں رہتی۔ رسوائی کا پہلا زینہ کم ہمتی اور بے صبری کی دلیل ہے۔ اگر انسان کسی کو رازدار نہ بنائے تو افشائے رازِ محبت کا خوف نہیں رہتا۔ یہ عاقل خان کی طرح دیگ کے اندر ہی اندر کوئلہ بنتی ہے، راکھ بنتی ہے۔ اور پھر اس سے ققنس کا پرندہ جنم لیتا ہے۔ اور اس کے دیپک راگ سے آگ لگتی ہے۔۔ چاروں طرف۔۔۔ محبت کی آگ، ۔۔۔ لال پیلے نیلے شعلے، اور اس نئی آگ میں کئی عاقل خان جل مرنے کے لئے اترتے ہیں۔ کوئلہ اور راکھ ہونے کو آگے بڑھتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔۔ عاقل خان سے ققنس تک، اور ققنس سے عاقل خان تک محبت کا سلسلہ۔۔۔ رازداری کا طریقہ، بیعت!

ڈمپل نے رشو کی پلکوں کو ماسکارا سے گریٹا گاربو کی پلکوں میں بدل دیا۔ آج پہلی بار رشو کو محسوس ہو رہا تھا کہ پلکوں کا پپوٹوں پر بہت بوجھ ہے۔ اور پلکیں جب گالوں کو چھوتی ہیں تو ہلکی سی گدگدی ہوتی ہے۔ آب رواں جیسی آتشی گلابی ساڑھی اور بغلوں میں پھنسا ہوا بلاؤز، سر پر ملکہ نفرتیتی کی طرح چڑھے ہوئے بال اور گالوں پر نامعلوم غازہ! رشو کو رشیدہ جہان بنانے میں ڈمپل کو پورے چار گھنٹے لگے تھے۔ اب وہ ولایتی مینا کن کی طرح پالش شدہ اور آراستہ چیز لگ رہی تھی۔ لمبے کان کھلے ہوئے بالوں تلے چھپ گئے تھے۔ کئی بار رشیدہ نے ناولوں میں پڑھا تھا کہ دیہاتی لڑکیاں کپڑے بدلتے ہی پوری شہرن بن جاتی ہیں۔ ایسے کئی واقعے اس نے فلموں میں بھی دیکھے

تھے۔ لیکن خود اس کے وجود میں ایسی کایا پلٹ آجائے گی۔ اس کا اسے وہم وگمان بھی نہ تھا۔ چلتے میں اس کی جوتیوں کی ٹکٹکاہٹ ، چائے پیتے ہوئے قدآدم شیشوں میں ٹھہرا ہوا آتشی گلابی بگولہ، آواز میں ایک شرابی سی کھنک، قہقہوں میں مندر کی گھنٹیوں جیسا بلاوا، . . . رشو کے دل میں پہلی بار یہ تمنا جاگی کہ کاش اس طرح ڈمپل کی ساڑھی میں کوئی اسے دیکھ لے!

راجہ نل تم کہاں ہو؟

تمہاری کونسی نشانی ہے کہ میں تمہیں پہچان لوں؟

جب وہ راحت کی کار میں ڈمپل کی ساڑھی پہن کر گھر پہنچی تو گھر پر کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سارے فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے . . وہ اپنے کمرے میں جا کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ چھوٹے سے کنڈے والے آئینے میں اس نے اپنی شکل دیکھی۔ ساڑھی کی سلوٹیں درست کیں۔ دکھ سے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بڑی دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی، پھر اس نے کمرے کی کنڈی چڑھائی۔ لیٹے کی شلواروں تلے اور اخبار کے کاغذ پر ٹافیوں کا ڈبہ سپیرے کی ٹوکری بنا بیٹھا تھا۔ اس نے ڈبہ کھولا، اور خط نکال کر ہاتھوں میں لے لیا۔ . . اسے یوں محسوس ہوا جیسے خط کے ہر حرف میں ظفر کی آنکھیں لگی ہیں اور وہ اسے حیرانی سے تک رہا ہے۔ سورج مکھی کی طرح آنکھیں جمائے ایک ہی طرف کو تکے جا رہا ہے۔ اس آنکھ میں لاماؤں کے دیس کی تیسری آنکھ جیسی بصیرت تھی۔ اس نظر میں برمے کی طرح چھید ڈالنے کی قوت تھی۔

اس نے خط کو جلدی سے ڈبے میں بند کر دیا اور کپڑے تبدیل کئے بغیر اسی طرح لیٹ گئی

خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ جے مالا لئے کالج میں پھر رہی ہے... لانوں پر، کلاس روموں میں، گیلری میں ہر طرف نل روپی لڑکے کھڑے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتی کہ ان میں سے اصلی راجہ کون سا ہے... ؟

دوسرا دور

ٹائیپوں کا ڈبہ نیلے سفید خطوں سے بھر چکا تھا۔

خالہ فیروزہ کو ان خطوں کی آمد و رفت کے متعلق تو کچھ علم نہ تھا۔ لیکن اب تک وہ بھی رشیدہ کے وجود سے تھک چکی تھیں۔ سٹور کے ساتھ والے کمرے میں جہاں رشو رہتی تھی وہاں ان کا ارادہ تھا کہ وہ ایسا سامان رکھیں جو تنویر کی شادی میں کام آ سکے۔ فریج، ٹیپ ریکارڈر، اور خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل اور تپائیاں وہ جمع کر چکی تھیں۔ ان چیزوں کو سٹور میں رکھنے سے ان کی آب مرنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن رشو جان کو جواب دینے کی بھی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی تھی۔

خالو جہاں نے اخبار پر سے نظریں اٹھا کر کہا۔

"اب تو لڑکیوں کے ہوسٹل دھڑا دھڑ بن رہے ہیں۔ یہ آج ایک نیو ماڈرن ہوسٹل

کا اشتہار آیا ہے۔ لکھا ہے۔

"گلبرگ میں نیو ماڈرن ہوسٹل کا قیام۔ ڈورمیٹریز اور علیحدہ کمروں کا انتظام، استری اور ہیٹر استعمال کرنے کے لیے رعایتیں، ملاقاتیوں کے لیے کامن روم، مہمانوں کے لیے کھانا منگوانے کا حاضری سسٹم، بسوں کا اڈہ قریب، معقول کرایہ، چونکہ کمرے محدود ہیں اس لیے جلد اپنی درخواست بھیجیے۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔۔" خالہ فیروزہ نے کہا۔

"کیا کہتی ہیں آپ؟"

"رشو کے لیے درخواست بھیج دیجیے۔"

"رشو کے لیے؟ وہ کیوں۔۔۔؟"

"بھئی اسی کا بھلا ہوگا۔ اس گھر کا ماحول پڑھنے کے لیے تو سازگار ہے نہیں۔۔۔ بیچاری کو بڑی مشکل پیش آتی ہے پڑھنے میں۔ فرسٹ ایئر کی اور بات تھی۔ اب سکینڈ ایئر میں تو اسے خاموشی کی ضرورت ہے۔"

"کیوں تنویر یہاں نہیں پڑھتی کیا؟" خالو نے سوال کیا۔

"تنویر کی اور بات ہے۔ ابھی سکینڈ ایئر میں ہے۔ رشو کا تو فائنل ایئر ہے۔"

"نامناسب لگتا ہے اس طرح بھیجنا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔"

"خیر کچھ ایسا نامناسب بھی نہیں۔۔۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ تھوڑی لیا ہے لڑکی کو ایم اے کروانے کا۔۔"

خالو جمال کا ضمیر بڑا اُجلا اور نرم تھا۔ اس پر ابھی کچھوے کا کھپڑ نہ چڑھا تھا۔
"ایک سال کی کونسی بات ہے۔ بیچاری بیوہ کی بچّی ہے۔ خواہ مخواہ ہوسٹلوں میں بھیجنا ٹھیک نہیں"

خالو جمال تک تو اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ رشیدہ یہیں رہے گی لیکن خالہ فیروزہ کے دل میں پھانس سی کھٹکنے لگی۔ آنکھوں میں ہلکی سی مروّت تھی ورنہ وہ دو ٹوک رشو جان کو جواب دے دیتیں۔ البتہ اب وہ بہانے کی تلاش میں رہنے لگیں۔ اور اس بہانے کو تلاش کرتے انہیں کچھ ایسی دیر بھی نہ لگی۔

خالہ کا چھوٹا سا کنبہ تھا۔ لیکن امورِ خانہ داری بڑے وسیع و عریض قسم کے تھے۔ باورچیخانے کے کام۔ تنویر باجی کے چھوٹے موٹے امور، اور کپڑے دھونے کی ذمّہ داری انوری کی، اندر باہر کی صفائیاں، بھینسوں کی دیکھ ریکھ، مرغیوں کی غور و پرداخت کے لئے رمضان۔ چھ کنال کی کوٹھی میں قلمی اور تخمی آم کے بوٹے، انبے، کنو اور الیچی کے پیڑ اگانے، لان بچھانے، وقت پر ٹیوب لگا کر پانی سے کیاریاں سینچنے اور نلائی، بجائی کے لئے غفور مالی،

ان تینوں کے علاوہ غلام رسول کے ذمّے متفرق کام تھے۔

ہر تین ماہ کے بعد خالو جمال کی کار کا ٹوکن بنوانا۔ بجلی کا بل، ٹیلی فون کا بل، منی آرڈر کرانا، لفافوں پر ٹکٹیں لگانا۔ راشن خریدنا، بنک میں روپیہ جمع کروانا اور نکلوانا، وعرقی کار ڈوں کی وصولی، اور چپڑاسی کی ڈاک بک میں دستخط کرنا، اپنے

گھر کے دعوتی رقعوں کو منبر اور کوٹھی کے پتہ کے مطابق پہنچانا، کوئلہ اور چاول کے پرمٹ حاصل کرنا۔ ہاؤس ٹیکس ادا کرنا۔ مال کی دوکان کا کرایہ وصول کرنا اور کرایہ داروں سے نپٹنا، اور پھر ریاض میاں کی مخبری کرنا غلام رسول کی ڈیوٹیوں میں شامل تھا،

اِن کاموں کے علاوہ مہینے کے شروع میں اکبری منڈی کا چکر بھی اسی کی ذمہ داری تھا۔ بڑے بڑے زین کے تھیلے اور بوریاں لے کر وہ منڈی پہنچتا۔ دالوں کی پنج سیریاں، مفلوک کے بھاؤ، صابن، چینی، گرم مسالہ اور ہندوستان کی لمبی لمبی سرخ مرچیں، بادام، روح کیوڑہ، سوئیوں کے بنڈل، انار دانہ اور املی سب سودا سلف اکبری منڈی سے ہی آتا تھا۔ اکبری منڈی کے سودا سلف کا یہ بھی آرام تھا کہ غلام رسول اپنے گھر کا سودا بھی بیگم صاحبہ کے حساب میں سے خرید لیتا تھا۔ اس کا علم نہ تو بیگم صاحبہ کو ہوتا تھا۔ اور نہ ہی اس کا بوجھ غلام رسول پر پڑتا تھا۔ بہر کیف بیگم صاحبہ کو بازاری بھاؤ کی نسبت سب چیزیں بارعایت ہی مل جاتی تھیں۔

جس قدر غلام رسول کام میں پھرتیلا تھا۔ اسی قدر باتوں میں سست بھی تھا۔ اسی لئے انوری اور اس کی ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ انوری اسے باتوں میں یوں چھکاڑتی کہ بیچارہ کبھی ایک پاؤں پر، کبھی دوسرے پاؤں پر بھار تول تول کر کھڑا ہوتا۔

پہلے دن جب انوری اس گھر میں باورچن بن کر آئی تو غلام رسول ریڑھے پر سے سودا سلف اتار رہا تھا۔ گندم کی ڈھائی من کی بوری کندھے پر اٹھائے تھنڈر سامنے نکالے، جب غلام رسول گودام کے پاس پہنچا تو انوری نے پوچھا۔

"تو بھی نوکر ہے یہاں . . ."

غلام رسول تھا تو نوکر ہی لیکن اس گھر میں آج تک کسی نے اسے اس لفظ سے نوازا نہیں تھا۔ اس کی حیثیت منشی اور منیم جیسی تھی۔ وہ تو گنٹھیا کے درد کی مانند اس خاندان کے جسم کا ایک حصہ ہو چکا تھا۔

"ہاں . . ." اس نے بوری کو کندھے سے پھینک کر بمشکل جواب دیا

"کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا نام کچھ بھی ہو تجھے کیا؟"

انوری کھل کھل کر کے ہنسنے لگی۔ چپٹے لاکھ جیسے ہونٹ بڑی خطرناک صورت اختیار کر گئے۔

"ہنستی کیوں ہے؟"

"تو نام کیوں نہیں بتا دیتا اپنا۔ ابھی کوئی آواز دے گا تو بھی تو پتہ چل ہی جائیگا۔"

"غلام رسول ہے میرا نام . ." وہ جل کر بولا۔

"غلام رسول؟ اللہ غلام رسول"

اب انوری کا قہقہہ پہلے سے بھی زیادہ بلند تھا۔

غلام رسول دو بچوں کا باپ تھا۔ ظہر اور عشا کی نماز مسجد میں پڑھنے کا عادی تھا۔ اسے اس گھر میں نوکری کرتے پورے دس سال ہو گئے تھے۔ اس بیباک لڑکی کے قہقہے تو اسے ڈس ہی گئے۔

"ہنستی کیوں ہے کمبخت!"

انوری منہ میں دوپٹہ ٹھونس ٹھونس کر ہنستی رہی۔ غلام رسول ریڑھے پر سے سامان لاتا رہا۔ اور چپ چاپ گودام میں رکھتا رہا۔ جب انوری ہنستے ہوئے تھک گئی تو بولی۔

"میرے چاچے کا نام بھی غلام رسول ہے۔"

"اچھا اچھا کام کر۔۔۔ جا۔۔۔"

گھر میں جہاں غلام رسول کو سب بھاجی کہتے تھے صرف انوری ایسی تھی کہ پہلے دن سے اس نے غلام رسول کا نام لیا اور آخری دن تک اسی ضد پر قائم رہی کہ میں تو غلام رسول کا نام لوں گی۔ وہ بھی ملازم ہم بھی ملازم۔

غلام رسول کے بعد باہر کے نوکروں میں ڈیوڈ ڈرائیور بہت معتبر تھا۔ وہ گھر کی جمعدارنی کا بھانجا تھا لیکن اس کے لئے ہمیشہ باہر کرسی جاتی۔ گو اس کے برتن علیحدہ تھے۔ لیکن کھانا اس کا ہمیشہ ٹرے میں لگ کر جاتا۔ پکے رنگ کا خاموش سا لڑکا تھا، وردی پہن کر اس کی شخصیت منسٹر جیسی نکل آتی۔ ڈیوڈ خالو جان کو دفتر پہنچا کر تنویر باجی کو کالج چھوڑتا پھر فوراً گھر واپس آجاتا۔ ریاض میاں اپنی موٹر سائیکل پر آتے جاتے تھے۔ اس لئے ڈیوڈ کو صرف بیگم صاحبہ کو خوش کرنے کی مشکل تھی۔

صبح کے وقت خالہ فیروزہ عموماً شاپنگ کرنے نکل جاتی تھیں۔ یہ ان کی زندگی کے بڑے مشغول گھنٹے تھے۔ گھر پر کپڑوں کا انبار ہونے کے باوجود ہر نیا رنگ۔ ہر نیا کپڑا ان کی جان بن جاتا۔ اور اسے چاہے وہ کبھی نہ خریدتیں پھر بھی ان کی جان پر بنی رہتی۔

بزاز اور درزی کے بعد انہیں جیولرز سے بہت کام رہتے تھے۔ پرانے زیور کی توڑ پھوڑ، نئے زیور کے رتی ماشے تلوانے، موتیوں کو پرکھنے اور جدید زیورات کو پہن پہن کر آئینے میں دیکھنے کا انہیں بہت شوق تھا۔

خالہ چالیس اور پینتالیس کے درمیان کہیں تھیں۔ یہ عمر کا وہ حصہ تھا جہاں چہرہ عمر کی غمازی کرنے لگتا ہے۔ لیکن اتفاق سے ابھی تک خالہ کے سارے بال سیاہ تھے۔ ہاتھ اور پاؤں عموماً چہرے کی طرح بے رحم نہیں ہوتے۔ ان پر ابھی عمر کی چھاپ نہ لگی تھی۔ اسی لئے خالہ فیروزہ کو اپنے ہاتھ، پاؤں اور بال بہت پسند تھے۔

ایسی چپلیں جن پر میموں کے نقاب جیسی جالی مڑھی ہوتی ہے انہیں بہت پسند تھیں کیونکہ اس لگا سارا پیر ہر لمحہ سامنے رہتا تھا۔ ان پیروں کو خالہ بڑے اہتمام سے دھویا کرتی تھیں۔ اور پھر خشک کر کے پاؤڈر سے بسایا کرتی تھیں۔ ان پیروں کی لستی بساتے رکھنے کی خاطر انہیں بار بار پاپوش فروشوں کے ہاں چکر لگانے پڑتے۔ ہاتھوں کو بالائی کی طرح نرم رکھنے کے لوشن، اور بالوں کو دھونے کے ان گنت شیمپو ان کے پاس جمع ہو گئے تھے۔۔

دوپہر کو تھوڑی دیر استراحت کرنے کے بعد خالہ عموماً کسی نہ کسی سے ملنے جایا کرتی تھیں، اگر خالو جمال ساتھ ہوتے تو خالو کے دوستوں کے ہاں، ورنہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں محفل جمتی۔ اپنے بال ہاتھ اور پیر تو خالہ فیروزہ کی توجہ کا باعث تھے ہی لیکن ان کا ایک اور بھی مشغلہ تھا جس کی بدولت ان کی زندگی مرغزار بنی ہوئی تھی۔

شہر بغداد کے ایک بادشاہ کا دستور تھا کہ رات کے پچھلے پہر اپنے وزیر باتدبیر کو جلو میں لئے شہر میں گشت کیا کرتا تھا۔ گلی گلی قریہ قریہ کوبہ کو گھومتا اور ان مظلوموں کی دادرسی کرتا جن کی دسترس دن کے وقت شاہ تک نہ ہو سکتی۔

ایک شب کہ تارے خوب نکلے تھے۔ اور فضا میں نارنج کے پھولوں کی مہک اس طرح پیر رہی تھی جیسے پانی میں شراب کا رنگ۔ شاہ پرجلال نے بھیس بدلا، وزیر کو ساتھ لیا اور گشت کو نکلا۔

ابھی محل سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک حبشی کی صدا آئی... "آہ! اس شہر میں انصاف نہیں، اس شہر کا بادشاہ دیندار نہیں، ہم روتے ہیں وہ بستر کمخواب پر سوتا ہے۔ آہ!... کہ موت بس میں نہیں ورنہ اس شہر کو چھوڑ جاتا۔ اور ادھر مڑ کر کبھی نہ آتا!"

اس بخت سرگشتہ، حالت ناگفتہ، آبنوس صفت حبشی کے پاس شاہ آیا اور وجہ اس آہ وزاری کی پوچھی تو مراکش کا رہنے والا بولا "اے تاجر! تجھ سے اپنی داستان کیا کہوں کہ ایک ماہرو شعلہ جوالہ میری طالب تھی۔ میں بھی ہر وقت اسی کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اسی چھتی گلی میں کہ جہاں اس پیکر شرم وحیا کا باپ عطار تھا، ایک بدخصلت، پراگندہ حال کٹنی بھی کہیں سے آئی اور میری محبوبہ پر اپنی باتوں کا دام پھیلا کر اسے ساتھ لے گئی۔

احوال اس کٹنی کا کیا بیان کروں کہ سواد شہر سے کوئی ڈھائی کوس

دور اس نے ایک عشرت گاہ بنا رکھی ہے۔ یہاں صبح و شام خوشبو جلتی ہے۔ شراب نہروں میں چھلکتی ہے۔ کنواریاں دودھ میں نہاتی ہیں۔ اور شہد کا کاجل لگاتی ہیں۔ ان کا لباس بے حیائی ہے۔ اور ان کی خوراک عاشقوں جبیں سائی ہے۔ وہ کٹنی خود تو ماہ پارہ نہیں لیکن اتنے چاند اس کے گرد گھومتے ہیں کہ ان ماہ پاروں کی ضیا سے اس کا چہرہ کندن سا دمکتا ہے۔ وہ خود تو جوان نہیں لیکن اتنی جوانیاں لیے کندھوں پر اٹھائے پھرتی ہیں کہ وہ بہار کے اوّلیں شگوفے کی مانند نوآموز لگتی ہے، جب یہ کٹنی بیوا حسن و جوانی کو اپنے میں منعکس کر کے ٹہلتی ہے۔ تو ہر نوگرفتار اسی کا عاشق ہو جاتا ہے۔

اے تاجر ذی ہوش! تجھ سے اس عورت کا کیا ذکر کروں۔' میں خود اسے دیکھ آیا ہوں، اور اب سوچتا ہوں کہ اس تمکین و ہوش کی دشمن سے اپنی ماہ پارہ کو کیونکر چھڑاؤں؟ اسے دیکھنے کے بعد مجھ میں اسے قتل کرنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ تو ہی بتا کہ میں کیا کروں؟ آہ کہ موت بھی اس شہر سے روٹھ گئی ہے"

شاہ نے اس حبشی غلام کو کیونکر اس کی منظور نظر دلائی یہ قصہ دوسرا ہے۔ خالہ فیروزہ کی دوستی شہر کی دلربا مہ پارہ حسیناؤں سے تھی۔ کچھ ایسی افسران بالا حکّام کی بیگمات بھی ان کی دمساز تھیں جن کی بیٹیاں سنّ بلوغ کو پہنچ چکی تھیں۔ خالہ کو نوجوان عورتیں اور خاص کر کم گو اور خوش شکل لڑکیاں اس لئے بہت پسند کرتی تھیں کہ خالہ شہر بھر میں سب سے زیادہ جنسی لطیفے جانتی تھیں۔ ان لطیفوں میں جو جو

تجربات اور جیسی چٹکیاں بھری ہوتیں ان کی کشش لڑکیوں کو بلا تکلف خالہ کے قریب لے آتی۔

اس کے علاوہ خالہ نے اپنے ہاں جیسے شادی کا ایک بیورو کھول رکھا تھا۔ جوان لڑکے خالہ کے در پر جبیں رگڑتے۔ محبت کا دم بھرتے۔ خالہ کے ہاتھ پیر دبا، اور بالوں کی تعریف کرتے اور اپنی مہ پارہ تک پہنچتے۔

یہ ساری کاروائی بہت معصوم تھی۔ اس میں نہ تو شعوری جدوجہد تھی نہ ہی شعوری لذت آفرینی۔ صرف اتنی بات ضرور تھی کہ خالہ نے اپنے گرد اتنے سارے چاند اکٹھے کر لیے تھے کہ ان ہی ضوفشاں عورتوں کے جلو میں خالہ فیروزہ بہت نظر فریب معلوم ہوتی تھیں۔

جب پہلے پہل رشو لاہور آئی تو خالہ کو یہ معصوم الھڑ سی لڑکی بہت پسند آئی... خالہ کا خیال تھا کہ اگر رومن چپل پہن کر اور بیک لس بلاؤز زیب تن کر کے یہ ان کے ساتھ کسی پارٹی میں گئی تو کافی تہلکہ بپا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خالہ نے پہلی کوشش کی لیکن وار اوچھا پڑا۔ اگر پنگ پانگ کے بال کو زمین پر مارو تو وہ تملا کر اوپر کو اٹھتا ہے لیکن اگر ربڑ کا ٹھس گیند اسی شدومد کے ساتھ زمین پر مارا جائے تو اچھلنے کے بجائے پھسلتا لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ کسی شادی پر جانا تھا۔ سب تیار ہو چکے تھے۔ خالہ فیروزہ نے اپنی ایک پسندیدہ ساڑھی اور کھلے گلے کا بلاؤز لے کر رشیدہ کے کمرے میں آئیں۔

رشو نے ساڑھی بھی پہن لی، پاؤں میں رومن چپل بھی اڑس لی۔ لیکن جب بلاؤز پہن کر وہ غسلخانے میں گئی اور آئینے میں ہنسلی کی ہڈیاں صاف نظر آئیں تو اسے ٹھنڈا

پسینہ آگیا - یہ نظارہ نظر فریب بھی تھا اور گناہ آلود بھی - ابھی سیان پر چڑھے دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے جلدی سے یہ کپڑے بدل لئے اور سیدھی سادی شلوار قمیض پہن کر خالہ فیروزہ کے کمرے میں پہنچی۔ تنویر اور خالہ پوری آب و تاب سے پریزاد بنی کھڑی تھیں۔

"تم چلو تنویر میں ابھی آئی۔"

تنو ہولیس کی ساڑھی پھڑکاتی باہر چلی گئی تو خالہ بولیں۔

"دیکھو رشو! یہ لاہور ہے اور لاہور کی سوسائٹی کے کچھ تقاضے ہیں۔ میں تمہیں ہر جگہ اپنی پوور ریلیشن بنا کر لے جانا نہیں چاہتی۔"

"جی خالہ . . ."

"عورت نمائش کی چیز ہے۔ جب تک اس کا نمائشی پہلو زندہ رہتا ہے۔ وہ زندہ رہتی ہے۔ اگر تم جوانی میں اس قدر اس سے بے نیاز ہو تو ہماری عمر کو پہنچ کر کیا بنے گا؟"

گو اپنے نزدیک ان کی عمر ابھی تشویشناک نہ تھی۔

"جی خالہ . . ؟"

"عورت کے متعلق مشہور ہے کہ پندرہ بیس کے درمیان عورت براعظم افریقہ کی مانند ہے، پر اسرار، اور نادریافت۔ بیس اور پچیس کے درمیان عورت براعظم ایشیا کی طرح گرم مرطوب اور اپنی ہی آگ میں جلتی ہے۔ پچیس اور تیس کا قطعہ امریکہ کی مانند ہے کہ ہر سیاح ادھر جاتا ہے اور اسی کے گن گاتا ہے۔ چالیس کو پہنچتے پہنچتے اس کی حالت یورپ کی سی ہو جاتی ہے۔ پامال اور خستہ حال۔ ہر ایک کا نقش قدم سینے پر لئے ہوئے

اور جانتی ہو کہ چالیس کے بعد عورت کس براعظم سے مشابہت رکھتی ہے؟"

"نہیں خالہ"

"آسٹریلیا سے... سبھی جانتے ہیں کہ وہ خطِ استوا سے نیچے ہے لیکن کوئی بھی ادھر کا رُخ نہیں کرتا"

رشّو کے کان اُبلتی کیتلی کی طرح سوں سوں کرنے لگے۔

"جو ساڑھی میں نے دی تھی وہی پہنو... ہاں..."

رشّو خالہ کا حکم بجا لانے لگی اور خالہ رشّو جان کو اس سکھ کا لطیفہ سنانے لگیں جو اپنی نویلی سرداری کے ساتھ پہلی بار ٹرین میں سوار ہوا۔ جب خالہ اس مقام پر پہنچیں جب سردار جی نے ساتھی مسافر کو بورڈ دکھا کر کہا تھا کہ چلتی گاڑی میں اوپر چڑھنا منع ہے تو خالہ خود ہی بہت محظوظ ہوئیں۔ لیکن رشّو جان خالہ کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ اس احمق کو ساتھ لے جا کر خالہ کا جی اور بھی بکھرا۔ وہاں تو ہر جگہ خالہ کی مانگ تھی۔ خالہ سلام، آپا سلام کی صدائیں آ رہی تھیں۔ اور رشّو جان چھچھوندر کی طرح سمٹی جا رہی تھی۔ دیواروں سے لگ لگ کر کھڑی ہو جاتی۔ گھر کے نوجوان لڑکے کھانے کے طشت لا رہے تھے۔ سب کا پھیرا خالہ کی طرف ضرور ہوتا۔

"خالہ! یہ مرغ کی ٹانگ لیجئے۔"

"آپا! یہ گرم زردہ ہے۔"

"فرنی تو آپ نے کھائی نہیں۔"

"لیجئے یہ بریانی کا طشت . . . . خاص آپ کے لئے ."

خالہ مہ پاروں کے حلقے میں گلابی لیس کی ساڑھی پہنے ہر نوجوان سے مذاق کر رہی تھیں۔ جنسی لطیفوں پر قہقہوں کے پرنالے چھوٹ رہے تھے۔ نوجوان لڑکے خالہ کے گرد کا طواف لگا رہے تھے۔ سرگوشیوں میں خالہ کی تعریف ہو رہی تھی۔ اور لم گتی رشیدہ پر ساڑھی کا پلو لئے ایکٹریس سوفیا کی طرح بے وقت کی راگنی بنی بیٹھی تھی۔

خالہ کے پاس نم مٹی کے لئے تو بیج تھا لیکن ایسی بنجر زمین میں زعفران کا پودا اگانے کے لئے ان کے پاس وقت نہ تھا۔ چھوڑا اور بالکل چھوڑ دیا۔ بلکہ ایک طرح سے انہیں اس نیک پروین صورت لڑکی سے وحشت بھی ہونے لگی۔ انہیں یوں احساس ہونے لگا جیسے وہ جان بوجھ کر لاجونتی بن کر انہیں چڑھاتی ہے۔ اسے دیکھ کر خالہ کو خیال پیدا ہوتا جیسے یہ ڈھکوسلے باز سب کچھ محض دکھانے کو کرتی ہے۔ اس کا نیک نفسی سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل سے کوئی علاقہ نہیں۔

کالج کے ہوسٹل میں غازی کے کمرے میں ہر چوتھے دن وہی شل کھلتی۔ وہی مقدمہ حل نکلتا۔ غازی نے گتے پر اے بی سی ڈی لکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو ان دنوں تیرے بہادلپور کا کیا حال ہے؟"

ظفر خاموش رہا۔

"کسی خط کا جواب بھی اس نے دیا ہے کہ نہیں؟"

ظفر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"جواب وہ نہیں دیتی اور بول چال تو نے ہم سے بند کر دی ہے۔ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔ ۔ ۔"

"دیا ہے جواب اس نے۔ ۔"

"لے مار لیا میدان میرے یار۔ ۔ ۔ مبارک۔ ۔ ۔ مبارک!"

اور ساتھ ہی کانوں پر ہاتھ رکھ کر افتخار نزاکت علی کے انداز پر گانے لگا۔

"شبھ گھڑی، شبھ لگن صورت۔ حجرت اکبر آیو۔ ۔"

"بس خدا کے لئے۔ ۔ ۔ بس خاموش ہو جاؤ۔ یہ تو پوچھ لینے دو کہ لکھتی کیا ہے"

غازی نے کہا۔

"لکھتی ہے۔

"آپ مجھے یوں خط نہ لکھا کریں۔ اگر آپ کو میری رسوائی کا پاس نہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں آپ کی بربادی کا باعث ضرور بن سکتی ہوں۔

فقط دعا گو

رشیدہ"

"یعنی سارا خط حفظ ہے میاں کو۔ ۔ ۔ واہ وا۔ ۔ سبحان اللہ۔ کاش سائیکولوجی کبھی اسطرح یاد ہو جایا کرتی تھیں۔ ۔ !" افتخار نے کہا

"پھر؟" غازی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پھر کچھ نہیں"

"پھر بھی . . . " غازی نے میز پر انگریزی ابجد والا گتہ رکھا ۔ اس پر ایک چوکور شیشہ رکھا ۔ اور گلاس کو قمیص کے دامن سے صاف کرنے لگا ۔

"کچھ نہیں ۔ وہ اپنی وضع شوق سے نہ بدلیں ۔ ہمارے جذبات کو ان کے رویئے سے کوئی تعلق نہیں ۔"

"ہیئر ہیئر . . . " اوپر فضا میں ہاتھ اٹھا کر افتخار بولا ۔ "تمہارے گلینڈز خراب ہیں ایڈرنل کی کمی ہے ۔ آیوڈین کی کمی بھی ہو سکتی ہے ۔ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرو ۔ اگر یہ غدودیں درست کام نہ کریں تو تین صورتیں ہوا کرتی ہیں ۔ یا تو انسان بے تحاشا موٹا ہونے لگتا ہے ۔ بالکل ہاتھیوں کی مانند . . . ایسی بیماری کو ڈاکٹر ایلیفنٹس کہتے ہیں ۔ دوسری حالت میں عشق ہو جاتا ہے ۔ تیسری صورت خود کشی کی ہو سکتی ہے ۔"

ظفر نے یکدم اٹھتے ہوئے کہا ۔

"لیجئے صاحب . . . رخصت ۔"

"کہاں ، کہاں کہاں ! میں تو روحیں بلانے لگا ہوں ۔"

"بلایئے بلایئے ، بسم اللہ ۔ ہم تو چلے ۔"

گو ظفر کے اپنے دل میں کئی سوال پھن اٹھائے کھڑے تھے لیکن اس وقت اس کے پاس افتخار کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا ۔

"آؤ ، بیٹھو میاں ۔ آج ہمارا تیسرا ساتھی نہیں ہے ۔ آؤ ۔ انگلی رکھو گلاس پر ۔"

ظفر نے پہلے تو منہ بنایا اور پھر آہستہ سے بیٹھ کر گلاس پہ انگلی رکھ دی تب بجھا

ی گئی۔ دو موم بتیاں روشن کر کے میز کے کناروں پہ اس طرح رکھی گئیں کہ روشنی تو پورے طور پر آتے، اور حروف پڑھے جا سکیں لیکن گلاس کی چلت پھرت اور باہنوں کو آگے پیچھے کرنے میں کوئی دقت درپیش نہ ہو۔

غازی نے کہنا شروع کیا۔

"کوئی روح جو اس وقت یہاں سے گذر رہی ہو۔۔۔ ازراہِ کرم اس گلاس میں آئے اور اپنی آمد کا پتہ گلاس کو لفظ یس تک لے جا کر واضح کرے۔"

فضا خاموش تھی۔ اندھیرا باہر گہرا ہو چکا تھا۔

گلاس ہولے ہولے یس کی طرف بڑھنے لگا۔

"پیاری روح! یہ بتاؤ کیا واقعی ظفر کو رشیدہ سے محبت ہے؟"

"شٹ اپ!"

گلاس نے کئی بار نو کی طرف اشارہ کیا۔

پہلے ازراہِ مذاق سوال کئے گئے پھر سنجیدہ باتوں کی طرف توجہ کی گئی، اور آہستہ آہستہ وہ مجذوبوں کی طرح سر جوڑے کچھ خوف زدہ کچھ سحر زدہ چیں چیں گھومتے گلاس کی طرف دیکھنے لگے۔

ظفر کو اپنا پہلا عشق یاد آنے لگا۔ اس میں یہ کیفیت تو نہ تھی لیکن اس میں شدت کہیں زیادہ تھی۔ جیسے کسی دوائی کا ڈھکنا کھولتے ہی الکوحل کی بو دماغ کو چڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح یہ عشق یکبارگی بلاوجہ ہلہلا کر سارے وجود کو چڑھ گیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ گھر کا سارا کام ابھی کرنا باقی تھا اور کل بیس چھٹیاں رہ گئی تھیں جب ظفر کو ٹائیفائڈ بخار ہو گیا۔ ان دنوں تپ محرقہ کا یہ علاج نہ تھا جو ان دنوں کلورومائسین کی وجہ سے ممکن ہو گیا ہے۔ مریض کو فاقے مار دیتے تھے۔ اناج کا ایک دانہ نہیں۔ بوٹی شوربے تو در کنار دلیہ تک کھانے کو نہ دیا جاتا۔ یعنی ہر طرح کی غذا منع تھی۔ بس یا تو دودھ پینے کو ملتا یا دن میں ایک بار ایک چمچ ساگو دانہ۔ اماں اس پر سارا دن پہرا دیتیں کہ کہیں وہ کسی سے کچھ مانگ کر کھا نہ لے۔

ایک دن یہ پہرے دار بدل گیا اور اماں کی جگہ ایک دراز قد لڑکی اندر آئی جس کی ناک میں فیروزے کا کوکا تھا۔ نوبنے جیسے سرین اور بڑا چوڑا دہن تھا۔ اللہ جانے وہ لڑکی تھی کہ عورت . . . لیکن ظفر کو اس سے بے حد خوف آیا۔ کبھی دل میں سوچتا شاید بچوں کی ماں ہے۔ کبھی خیال آتا کہ نویں میں پڑھتی ہو گی اور رہتی ہے میری طرح۔

"رسالہ چھوڑ دو . . . اور لیٹ جاؤ خاموشی سے"

ظفر نے رسالہ رکھ دیا اور خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"بخار کب سے ہے . . . دے؟"

"دس دن سے جی . . ."

"اور تم رسالہ پڑھ رہے تھے۔"

"جی صرف تصویریں دیکھ رہا تھا۔"

"رسالہ مجھے دو ادھر۔"

اس نے چپ چاپ رسالہ پکڑا دیا۔ پہلے وہ کتنی دیر انگشت شہادت کو لب لگا لگا کر ورق الٹتی اور تصویریں دیکھتی رہی۔ پھر اسے کوئی اپنی پسند کی چیز مل گئی... ہتھیلی کی پیالی میں ٹھوڑی ٹکا کر پڑھنے میں مگن ہوئی تو پہلے گھنٹہ بھر ٹانگیں ہلاتی پڑھتی رہی۔ پھر ٹانگوں کو کرسی پر اپنے نیچے ایسے لے کر بیٹھ گئی جیسے بطخ تالاب میں تیرتے وقت پاؤں نیچے کر لیتی ہے۔ یوں بطخ بنی جب اس کی ٹانگیں سو گئیں تو وہ کرسی سے اٹھی اور ظفر سے بولی۔

"دے ایک تکیہ دینا۔"

ظفر نے تکیہ نکال کر پیش کیا۔

"ذرا ٹانگیں اوپر کو سمیٹ کر لو۔"

ظفر نے جنین (Foetus) کی مانند اپنی ٹھوڑی سے گھٹنے لگا لیے۔ اس کوکے والی نے دیوار سے تکیہ کی ٹیک لگائی اور ظفر کی پائنتی نیم لیٹی نیم بیٹھی پڑھنے لگی۔ تھک جاتی تو بڑے سے توبے کو ظفر کی جانب کر کے اونگھنے لگتی۔ کچھ دیر بعد اس کا ضمیر ملامت کرتا تو ظفر سے پوچھتی۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

اور جواب سنے بغیر پھر پڑھنے میں مشغول ہو جاتی۔

بقول آپا رشتے میں اس کی چچی کی نند تھی چچی اپنے کلیم کے سلسلے میں ان کے

ہاں ٹھہری تھیں، اور بتول آپا شہر دیکھنے ساتھ چلی آئی تھی۔

اس دن بتول آپا جو ظفر کے کمرے میں ٹھہری تو اماں کو بے فکری سی ہو گئی۔ دس بیس دن سے وہ بندھی گائے کی طرح گھبرا سی گئی تھیں۔ پھر بتول نے ظفر کو دودھ اور ساگودانہ بھی تین بار پلا دیا تھا۔ اور اس نے بلا حیل وحجت پی لیا تھا۔

اب تو بتول آپا کی ڈیوٹی ظفر پر مستقل ہو گئی۔ وہ یا تو کوئی اردو کا ناول یا رسالہ اپنے ساتھ لاتیں یا پھر ظفر سے مانگ لیتیں۔ اس قدر غیر ادبی شخصیت اور اس قدر ادب نوازی؛ اس بے جوڑ بے میل رابطے نے ظفر کے لئے بتول آپا کو اور بھی پُر کشش بنا دیا تھا۔ بتول آپا کی گفتگو لٹھ باز گنواروں کی طرح عموماً وے سے شروع ہوتی تھی اور رسالے وہ ایسے ادبی پسند کرتی تھیں کہ بڑے بڑے انٹیلکچیل کان پکڑیں نہ جانے وہ سارا علم کہاں جاتا تھا۔ کیونکہ اتنے سارے ادب کے باوجود وہ شکل عقل سے بالکل اجڈ اور بانگڑو نظر آتی تھیں۔

ظفر کا خیال تھا کہ شاید سارا ادب اس تونبے سی گنبد میں جا گھستا ہے جو ہر روز صبح سے زیادہ مدوّر ہوتا ہے۔

ظفر ان خاموشی کے گھنٹوں میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ دیوار سے پشت لگائے تونبے کا گنبد اس کی جانب کئے جب وہ پڑھ رہی ہوتیں تو ظفر دعائیں مانگتا کہ یا اللہ میاں میرا بخار کبھی نہ اترے اور یہ شیرنی اسی طرح میری پائنتی پر بیٹھی رہے۔ پھر موت آجائے اور ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے لے۔

موت سے تو دونوں کو نہ آئی ۔ البتہ ایک دن اچانک ظفر کا بخار اُتر گیا ۔ اور اسی روز خبر ملی کہ چچی اپنی پیاری نند کو لے کر لائلپور جا چکی ہیں ۔ ۔ ۔ یہ دن ظفر کے لیے عجیب سا دن تھا ۔ سارا دن نہ اس نے کچھ کھایا نہ کسی سے بولا اور نہ ہی آنکھیں کھولیں ۔ ۔ ۔ ایک ہی بات دل کو رہ رہ کر ستاتی تھی کہ بتول آپا سے اتنا بھی نہ ہوا کہ مجھ سے مل کر ہی چلی جاتیں ۔ سارا سارا دن میرے کمرے میں پڑی رہتی تھیں ۔ اب اتنی توفیق نہ ہوئی کہ جاتی بار یہ ہی پوچھ لیتیں " وے کیسی طبیعت ہے تمہاری "

مہینے بعد جب محبت کے جراثیم روز مرہ کی زندگی کے اینٹی بایوٹک نے مار دیئے تو ظفر کو ایک دن اماں نے کہا ۔

" ظفر تجھے بتول یاد ہے ؟ "

ظفر ان دنوں فسٹ ایئر میں تھا ۔ نہ جانے کیوں اسے بریک سی لگی ۔

" کونسی بتول ، ماں جی ؟ "

" تمہاری چچی طلعت کی نند ۔ لیکن تمہیں کہاں یاد ہوگی ۔ تم تو سارا سارا دن بے سدھ پڑے رہتے تھے ۔ "

ظفر کا دل پسلیوں سے ٹکرانے لگا ۔

" بڑی خدمت کی بے چاری نے تمہاری ۔ "

" کیا ہوا اسے ماں جی ؟ "

" بیچاری فوت ہو گئی پرسوں کار کے حادثے میں ۔ سال کی بچی چھوڑ گئی ہے پیچھے

"بچی ۔ ۔ ۔ موت ۔ ۔ ۔ اور بتول ۔"

اتنے سارے ادب کی قبر کتنی غیر رومانوی ہے ۔ کار کا حادثہ ۔ ۔ ۔ ایک دھماکہ

اور بس !

ظفر نے کتنی دیر آپا بتول کی شکل یاد کرنے میں صرف کی ۔ لیکن کوئی تصویر تشکیل

نہ پائی ۔ ۔ ۔ ۔ بس ایک فیروزی کوکا ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک گول گیند ساٹن کے فیروزی

غلاف میں لپٹا ہوا ۔ ۔ ۔ آپا بتول کے سارے وجود کا بس یہی کچھ رہ گیا تھا !

غازی نے ظفر کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا ۔

"دھیان کہاں ہے تمہارا ؟ بتیس سوال پوچھ چکے ہیں ہم ۔"

"ہاں ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ پوچھو ۔"

"یہ رشیدہ کی محبت میں اس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں پہنچ کر ہلیوسی نیشنز

ہونے لگتی ہیں ۔"

"شٹ اپ ۔"

غازی نے منہ کو گلاس سے ایک انچ پرے رکھ کر پوچھا ۔

"روح پیاری روح اب یہ بتا ۔ کیا ظفر محبت میں کامیاب ہو گا ۔ ؟"

گلاس درمیان میں گول گول چکر کاٹنے لگا ۔

"اے روح یہ بتا کیا ظفر کی شادی اس بہاولپورن سے ہو گی کہ نہیں ۔ ۔ ۔

کہ نہیں ؟"

ظفر کی آنکھیں حدقۂ چشم سے گرنے کو تھیں جب گلاس نے جلدی جلدی یہ جملہ بنایا۔

"بلکہ اس کے باپ سے"۔

غازی اور افتخار نے بلند قہقہہ لگایا۔ اور یکدم گلاس چھوڑ کر غازی بولا۔

"لے بیٹا! تجھ سے تو روحیں بھی مذاق کرنے لگی ہیں۔ تو تو ہم ہی سے چڑھتا تھا!"

جب ظفر ہوسٹل میں سے نکلا تو بڑی دیر تک یہ قہقہے اس کے ساتھ چلتے آئے جیسے کوئی ضدی فقیر صدائیں لگاتا، دعائیں دیتا ساتھ ساتھ بھاگا آ رہا ہو۔

رشیدہ نے اپنی ڈائری بکس کی تہہ میں سے نکالی۔ آنکھ کے کونے سے آنسو کا قطرہ پونچھا اور لکھنے لگی۔

۷ مئی

میں اماں کو کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں اور جو نہ لکھوں تو زندہ کیونکر رہوں۔ خالہ فیروزہ اب مجھے یہاں ایک پل نہیں رکھنا چاہتیں۔ ابھی کل جب میں کالج سے لوٹی تو انوری میرا کھانا لے کر گیلری میں آ رہی تھی۔ خالہ نے مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا ... وہ گرمی دانوں پر پیٹ پاؤڈر چھڑک رہی تھیں۔ خالہ کے بازوؤں پر یہ دانے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ اللہ جانے وہ انہیں ختم کرنے کی کیوں سوچتی ہیں؟

"کہاں جا رہا ہے کھانا؟"

"آپا رشو کے کمرے میں"۔

"وہ آپی کھائے گی۔ لے جا باورچی خانے میں۔"

انوری کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ لکڑی میں دھنسی ہوئی میخ کی طرح جم گئی۔

"جی؟"

"لے جا ناں باورچی خانے میں... ہم نے کوئی اس کے لیے نوکر نہیں رکھے ہوئے... لے جا۔"

جب انوری چلنے لگی تو اس نے اپنے چپڑا لاکھ جیسے ہونٹ کھولے اور بولی۔

"رشو آپا... آیئے باورچی خانے میں ہی کھانا کھا لیجیے۔"

اگر میں خالہ کی جگہ ہوتی تو پلٹ کر دیکھتی اور تیورا کر گرتی۔ لیکن خالہ نے مڑ کر دیکھا۔ میرے سلام کا سر کے اثباتی اشارے سے جواب دیا اور پیروں پر پاؤڈر ملنے میں منہمک ہو گئیں۔

۱۱ مئی

اللہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ پورب پچھم سے بادل اکٹھے ہو رہے ہیں۔ جو دن چڑھتا ہے ریگستان کی طرح تپا ہوا۔ جو رات آتی ہے افریقہ کے جنگلوں کی... خالہ کا گھر میرے لیے خارپشت کی طرح خار دار ہو رہا ہے... کالج میں وہ حضرت ظفر آنکھوں میں نوالہ بنا لینے کے قائل ہیں... بہاولپور وہاں در صورت اس سے بھی دور ہے۔ کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟"

۱۲ مئی

سچ لکھوں کہ جھوٹ؟

لیکن آخر جھوٹ لکھنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟ یہ ڈائری جب مکمل ہو جائے گی۔ میرے احمق پن کا جب آخری صفحہ قلمبند ہو چکے گا، تو میں ایک رات کو موم بتی جلا کر اس کا صفحہ صفحہ جلا دوں گی۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس ڈائری کا کاجل بناؤں اور اس کی ایک سلائی ہر روز صبح اپنی آنکھوں میں ڈالوں۔ کون جانے اس میں سلیمانی ٹوپی کی تاثیر ہو۔ سب کی نظروں سے چھپاک اوجھل . . .

بول پیاری دوست! . . میری ڈائری! تجھ میں سچ رقم کروں کہ جھوٹ؟ ظفر کو تو نے نہیں دیکھا؟ . . . تو گھر پر بکس میں محبوس رہتی ہے ناں! کسی عرب سردار کی حرم میں مقید پریزاد! . . تجھ تک تیرا محبوب زنانہ لباس پہن کر ڈولی میں آتا ہے۔ اور وہی عرب سردار جو تجھ پر ہر روز نئی سوت لاتا ہے۔ جب تیرے محبوب کو ایک دن تیرے پاس دیکھ لے گا۔ تو تیری بے وفائی کی پاداش میں اس کا اور تیرا سر قلم کر دے گا۔

پیاری ڈائری! . . . میری دوست! . . . یہ مرد کی دنیا ہے۔ یہاں سارے کام مرد کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ مرد نے اپنی سازش میں اللہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ تمام مذہب مرد اور اللہ کی باہمی رضامندی کا نتیجہ ہیں۔ ہائے میرے اللہ! . . . جو کسی نے یہ باتیں پڑھ لیں تو؟ . .

تو کسی سے کہے گی تو نہیں ؟ . . . پیاری ڈائری بول ! . . . اس مینا کی طرح بے وفائی تو نہیں کرے گی ؟ جو رات بھر ات سندر چندراوتی اور چندر کرن کو روشوں پہ ٹہلتے دیکھتی رہیں۔ جو اس وقت تو چپ رہی جب چندر کرن نے گلاب کی پتیاں مار مار کر چندراوتی کے گال لال کر دیئے۔ اور اس وقت بھی خاموش رہی جب چندراوتی نے چندر کرن کے کان کی لو کو بوسہ دے کر کہا۔ "تمہیں رکھوں چندراوتی ایسی نہیں ہے"

۔ ۔ ۔ سے صبح کی پہلی کرن نے اندھیرے کے ماتھے پر لب رکھے تو مینا نے راجہ کے کانوں میں ایک ایک بات اگل دی . . . ایک ایک . . .

بول . . ! کہے گی تو کسی سے نہیں ناں !

مرد اور اللہ میاں چکی کے دو پاٹ ہیں اور ان میں عورت گیہوں کا دانہ ہے جو اگر پسنے سے انکار کر دے تو اس کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ بیچاری جانتی ہے یہ گھن کیا ہے . . . یہ وہ دکھ ہے جو عورت کے دل میں اس کی برسوں کی غلامی نے پیدا کیا ہے۔ یہ وہ گھن ہے جو اندر ہی اندر عورت کے دل کو چاٹتا رہتا ہے۔ بالکل جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے آپ کو چاٹ چاٹ کر اپنے گرد ریشم کا گھر بنا لیتا ہے . . . . عورت کا گھن اس کے گرد ریشم کا وہ جال بن دیتا ہے کہ اصلی عورت کہیں نظر نہیں آتی۔

ساری سہولتیں مرد کے لئے ہیں۔

ساری اشرف المخلوقاتی مرد کے لئے ہے۔

وہ بے وفا ہے تو یہ اس کی فطرت ہے۔ اس کے رب نے اسے ایسا بنایا ہے"

مرد فطرتی طور پر وہ مرغا ہے جس کے ارد گرد مرغیوں کا سیمنار ہو رہا:
محبّت پر... وفا پر... مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ

ہر مرغی کو اسی سے وفا کرنی ہو گی۔ وہ چاہے کسی سے وفا نہ کرے

کیونکہ وہ مرد ہے...

اشرف المخلوقات ہے۔

اللہ اللہ! میں کیا بک رہی ہوں۔ نعوذ باللہ کیا کچھ لکھ گئی احمق پن سے۔
بات صرف اتنی ہے پیاری ڈائری!... جھوٹ کہوں کہ سچ؟ بول ناں!
بات صرف اتنی ہے کہ آج ظفر برآمدے میں کھڑا ڈمپل سے باتیں کر رہا تھا...
ڈمپل بغیر آستینوں کا سیک شرٹ پہنے ستون سے کولہے جمائے کھڑی تھی....
ظفر کی نگاہوں میں ستائش تھی...

بول ناں! اب کچھ کہتی کیوں نہیں...

میری تسلّی کے لئے ہی کہہ دے کہ سب جھوٹ ہے۔ یہ ستائش ویسی ہی بے
حقیقت ہے۔ جیسے تالاب کے ٹھہرے پانیوں میں بادلوں کا رنگ!

شاید انوری آ رہی ہے ادھر...؛

انوری اندر آئی تو رشّو جان نے جلدی سے ڈائری بند کر کے کتابوں تلے رکھ
دی۔ انوری گو رشّو کی اس گھر میں واحد دوست تھی۔ لیکن ناخنوں کو تراش دینے
والی اس احمق دوست سے رشّو کو بہت ڈر لگتا تھا۔

"آجاؤ ۔ رشّو آپا ؟"

"آجاؤ ۔"

انوری اندر آگئی۔ بالکل چپ چاپ ۔ نہ پیروں میں وہ اچپلاہٹ نہ آنکھوں میں زندگی نہ ہونٹوں پر ہنسی ۔ مردہ مردہ سی آکر میز کے پاس کھڑی ہوگئی۔

"کیا بات ہے انوری ؟"

وہ چپ رہی۔

"کیوں کیا ہوا ؟"

انوری نے منہ پرے کرلیا اور ایک پاؤں کے انگوٹھے سے دوسرے پاؤں کے انگوٹھے کو کریدنے لگی۔

"کسی نے کچھ کہا ہے ؟"

نفی میں کدّو سا سر ہلا۔

"پھر ؟ . . . ارے تم تو رو رہی ہو۔ بتاؤ ناں کیا بات ہے ؟"

اب انوری کے صندل سے گالوں پر مئی کی بارش ہو رہی تھی ۔

"یہاں بیٹھ جاؤ . . . بھئی بتاؤ تو . . . کیا بات ہے ؟"

بہت دیر رشّو انوری کا کندھا تھپتھپاتی رہی اور انوری روتی رہی۔ جب اس دخانی انجن سے کافی بھاپ نکل گئی ۔ تو انوری نے بالآخر کہا۔

"میں جا رہی ہوں جی ۔"

"گیا۔"

"ابا آیا ہے۔"

"کون؟"

"اباجی... محمد منیر... جیجا ہے۔"

"اچھا تو پھر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔"

انوری پر پھر رونے کا دورہ پڑ گیا۔ ایک ہی بار بجلی کڑکی اور بادل کھلا بھی تو تند ہواؤں نے وڑاپ سین کی طرح بادلوں کے پٹ میل دیئے۔

"اللہ! انوری کچھ بتاؤ بھی۔ آخر بات کیا ہے۔ کچھ تو کہو۔ آخر اس رونے سے فائدہ؟ حاصل؟ آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ ہائے اللہ! چپ بھی کرو۔ خدا کیلئے!"

انوری کے آنسو دیکھ کر رشو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ پھر ایک بار سوچنے لگی کہ یہ ساری دنیا مرد کی ہے۔ یہاں عورت ڈھور ڈنگر کی طرح ہے۔ ذرا پھن اٹھایا تو پتھر مار کر کچل دی جائے گی۔ ذرا خدمت گذاری سے کام نہ لیا، اطاعت نہ کی، نیک پروین بنکر نہ دکھایا تو متر ڈی ہو جائے گی۔ اسی میں عافیت ہے کہ کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پہ اندھیاریاں پہنے اسی ڈگر پر چکر لگاتے وقت گذر جائے۔ گاڑی والے کو علم نہ ہو کہ بیل اس گردش پیہم سے تھک گیا ہے۔ بیل کے اندر بھاگ جانے کا یارا نہیں۔ . . اس میں کھلی فضاؤں میں اکیلے پھرنے کی سکت نہیں ورنہ وہ اس رکوں رکوں کی زندگی کو کبھی کا چھوڑ جاتا۔

"میں جا رہی ہوں، آپا جی۔۔۔"

رشّو نے یکدم پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں؟"

"وہ جی۔۔۔۔"

"ہاں ہاں، کہو ناں۔۔ خدا قسم! میں تمہاری دوست ہوں۔۔"

"شادی ہے۔"

"شادی؟۔۔ کس کی؟"

"اس کی۔۔۔۔ ساجھے کی۔"

ساجھا کون؟۔۔" رشّو نے سوال کیا۔

"میری پھوپھی کا لڑکا ہے۔ کھیتوں پر کام کرتا ہے ابّے کے ساتھ۔۔"

رشّو جان نے انوری کے بے رونق چہرے پر نظر ڈالی اور پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہی ساجھا جو تمہارا منگیتر تھا۔"

انوری چھوٹے بچّوں کی طرح اثبات میں سر ہلانے لگی۔ لمحہ بھر توقّف کے بعد رشّو نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ شادی ہو رہی ہے اس کی؟"

جو آنسو کہ دِر سا بندھ باندھ کر روکے گئے تھے۔ ان میں تربینی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آنکھیں چھل چھلائیں اور گال بھر میّ کی بارش میں بھیگنے لگے۔

"خدا کے لیے انوری! مت روؤ... ایسے ہی ہوتا ہے ہمیشہ۔ ہر جگہ... ہر لمحے... یہ فیصلے ان کے ہاتھ میں ہیں جو تمہارا دل نہیں دیکھ سکتے۔ جنہیں تمہارا دل دکھایا نہیں جا سکتا... خدا کے لیے مت رو انوری... ہائے چپ کر جاؤ۔ پلیز انوری.."

گاؤں کی لڑکی لاہور سے واپس جا رہی تھی۔ اسے سنڈریلا کی طرح جو کانچ کی جوتیاں ملی تھیں وہ ایک مقررہ وقت کے لیے تھیں۔ اس کے بعد وہی کدو... وہی چوہے جو لمحہ بھر پہلے اس کی گاڑی بنے اسے اڑائے پھر رہے تھے۔ واپس اپنی اصلی ہیئت میں لوٹ آئے تھے۔

انوری واپس جا رہی تھی۔

واپڈا کی بجلی چھوڑ کر .... تیل کے دیئے کے پاس۔

ٹیڈی قمیص اتار کر .... پھلکاری پہنے۔

سرویٹ گلاسوں میں جمانے کے بعد.. سر پر ساگ اور مکئی کی روٹیاں اٹھائے چلی جا رہی تھی، چلی جا رہی تھی... اس کے نتھنوں میں نئی فصلوں کی خوشبو تھی.. اس کی آنکھوں میں حد نظر تک ہریالی تھی۔ اور اس کے دل میں وہ اکا چل رہا تھا جو دلدل میں دور تک اپنے پہیوں کا نشان چھوڑتا جاتا ہے۔

"رمضان بازار گیا ہے اسے میرا سلام کہہ دینا، آپا!" انوری نے آہستہ سے کہا۔

یاد سلام اس مشعل کی طرح روشن تھا جو اولمپک کی کھیلوں میں کھلاڑیوں کے ہاتھ میں جگمگاتا ہے۔ یہ تمہارا سلام میں رمضان تک کیسے پہنچا سکتی ہوں انوری!
رشوؔ نے جی میں سوچا۔

"تم خود سب سے مل کر کیوں نہیں جاتیں انوری ؟" رشوؔ نے پوچھا۔

"ابّا کو جلدی ہے بس نکل جائیگی ہماری۔"

"پھر بھی ابھی تنویر بھی کالج سے نہیں آئی۔"

"بیگم صاحبہ نے حساب کر دیا ہے۔ جی۔ ابّا تانگہ لے آیا ہے۔ میں تو... میں سلام کر نے آئی تھی آپ کو..." وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"خط لکھو گی مجھے جھبراں سے ؟"

"مجھے تو لکھنا نہیں آتا۔ آپا جی"

"کسی سے کہہ کر لکھوا دینا"

"اچھا جی..."

"ڈیوڈ کو بھی سلام کہنا آپا جی۔ اور رمضان کو بھی۔ میرا کہا سنا معاف کر دیں سب۔ بہت تنگ کیا ہے میں نے سب کو"

رشوؔ اور وہ دونوں قدم قدم پر پڑاؤ ڈالتی دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔

"تھوڑی دیر رک جاتیں۔ انوری! ڈیوڈ آ ہی رہا ہوگا تنویر کو لے کر۔"

"نہیں جی تانگہ آگیا ہے۔"

"اچھا سلام کہہ دینا میرا۔ بھائی غلام رسول . . . اور رمضان کو۔"

"غلام رسول بھی گھر پر نہیں ہے۔" رشّو نے پوچھا۔

"اکبری منڈی گیا ہے جی۔ چاولوں کا پتہ کرنے . . ."

رشّو نے لب کاٹ کر کہا۔

"اتنی جلدی کیوں تانگہ لے آیا تمہارا ابّا۔"

"بس جی جلدی ہے اسے . . . بیگم صاحبہ نے حساب کر دیا ہے۔"

وہ دروازے کے پاس لمحہ کو ٹھٹکی پھر اس نے یکبارگی رشّو کے گرد بانہیں ڈال دیں۔ اس کا سینہ سسکیوں سے یوں بھر گیا۔ جیسے پیراشوٹ ہوائی جہاز سے نکلتے ہی ہوا سے بھر جاتا ہے۔

سنڈریلا چلی گئی۔

لیکن اس شہر میں بڑے بڑوں کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی شیشے کی جوتی لے کر اس کی کھوج کو نکلتا۔ رمضان تو بیچارہ بیس روپے ماہوار پر ملازم تھا۔

. . . .

بہاولپور کی کال کلوٹی جب پہلی بار لاہور آئی تھی تو فتح شیر روڈ پر . . جہاں خالہ فیروزہ جنسی لطیفے سناتی تھیں۔ تنویر ہیلیٹیز سے عشق کرتی تھی۔ ریاض روبوٹ بنانے سے لے کر کیفے ڈی گھانس پھونس میں مغلیہ لباس کے بہروں کو ڈبل شفٹ

میں کام کرنے کے پلان بناتا تھا۔ اور ان سب کا سردار خالو جمال انڈر گریجویشن میں بڑے معتبر عہدے پر تھا۔ یوں سمجھیے کہ کسی نے ہانڈی کے منہ پر کیلے کے پتے باندھ اردگرد مٹی کا لیپ کرکے اسے اپلوں کی آگ میں کشتہ بنانے کو ڈال دیا۔ ایک ایک کرکے ہر نظریے کو قلعی کرنا پڑی۔

دراصل مفتح ایئر کی اور بات تھی۔ وہ سیدھ گھومنی تھی۔ اپنی ہاٹ لگا کر نہ بیٹھی تھی دیدے پھاڑے اِدھر اُدھر جھانکتی رہی۔ اب دن بدن ضمیر سست الوجود ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے کوئی ریگمال سی چیز دل کی کھردری سطح کو موزیک فرش جیسا چکنا بنا رہی تھی، پہلے وہ لمبی سی چوٹی کرتی تھی۔ اب ڈھیلے ڈھالے بال لمبے کانوں کو چھپا کر جوڑے کی شکل میں بندھنے لگے۔ ہر روز کالج سے واپسی پر قمیص میں فٹنگ تبدیل ہونے لگی ... نامعلوم سی لپ اسٹک بھی کہیں سے آگئی۔ اور پلکوں کے سرے بھی برش سے اوپر کی طرف موڑے جانے لگے .... یہ ساری تبدیلیاں ظاہری تھیں۔ ایک ایسی تبدیلی بھی تھی جو اندر ہی اندر سانپ کی کینچلی کی مانند اپنا وجود نئے سانچے میں ڈھال رہی تھی۔ اس تبدیلی کا خود رشیدہ کو بھی علم نہ تھا۔ اسے تو پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ بازار جانے لگی۔ کس دن اس نے انٹر کالج مباحثوں میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور کب سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے لگی۔ بالکل جس طرح چولہے پر چڑھنے والی کیتلی کے اندر ذرات کی تہ کھرنڈ کی طرح جم جاتی ہے اسی طرح آہستہ آہستہ رشیدہ کی انا نے اپنے گرد جواز وں، تاویلوں، اور منطقوں کی فصیل

تعمیر کر لی تھی۔

گھر سے پہلا قدم اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ ایک بار جب مہارانی سینتا باندری لائن الانگ گئیں۔ تو ننگل دیپ تک کا سفر پلک جھپکتے میں ختم ہو گیا۔

جب وہ نیو لائٹ سٹور میں داخل ہوئی تو ڈمپل اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں پرسس جھلاتی پروفیسر اعجاز کے لیکچر پر تبصرہ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

"جو مثال پروفیسر اعجاز آج دے رہے تھے وہ غلط تھی۔" ڈمپل ہولے سے بولی۔ "وہ تو ہمیں احمق سمجھتے ہیں۔ جو جی چاہتا ہے بولتے جاتے ہیں۔"

"مثال تو ٹھیک تھی لیکن انہیں ایکسپلین کرنا نہیں آیا۔" رشو نے از راہ مروّت کہا۔ . .

"شی زوفرینیا اور Dementia Precox کے تو بڑے ہی ماہر ہیں۔ ہر آدمی انہیں ان بیماریوں میں مبتلا نظر آتا ہے۔ سارے لاہور شہر میں ان کے نزدیک ایک بھی نارمل آدمی نارمل زندگی بسر کرتا نظر نہیں آتا۔ پھر مثال کیوں غلط دی انہوں نے۔"

رشو کی نظروں میں پروفیسر اعجاز گھوم گئے . . . لانبا قد، مدھم گندمی رنگ جو ناک اور دہن کے ارد گرد ذرا سنولایا ہوا تھا۔ اور گالوں اور ماتھے پر گھلتا نظر آتا تھا . . . کنپٹی پر سفید بال۔ باتوں میں ایک قسم کی رکاوٹ جو رشو کے نزدیک سقراطی ذہانت کی دلیل تھی۔

اباجی بھی اسی طرح رک رک کر بولتے تھے . . . اباجی کے کانوں کے اوپر بھی

چاولوں کا چھینٹا بالوں پر پڑ گیا تھا۔

"استری نہیں آٹو میٹک چاہیئے ناں . . ." ڈمپل نے سوال کیا۔

"ہاں . . . آں !"

وہ دونوں شیشے کی اس الماری پر جھک گئیں جو ان کی ناف تک اونچی تھی اور جس میں کافی پرکولیٹر، ٹوسٹر، ہیٹر، الیکٹرک روڈز، استریاں، بلنڈر، مکسر، ہوٹ پلیٹ، ربڑ کے چھوٹے پنکھے، مسالہ پیسنے والی چھوٹی چوکور مشینیں اور بجلی کا ان گنت سامان پڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر اظہر اس طرف سے چلا آیا جہاں وہ ایک امریکن کو فریج دکھا رہا تھا۔

"جی فرمایئے۔"

"بجلی کی استری چاہیئے جی ہمیں . ." رشو نے اظہر کی طرف لمحہ بھر کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

یہ چہرہ جانا پہچانا تھا۔ گو یہ آدمی موٹا تھا پر . . . میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے ؟ . . . کہاں ؟ کہاں . . . کہاں ؟"

"استری آٹو میٹک ہو . ."

"جی میں سمجھ گیا۔ پانی چھڑکنے والی چاہیئے کہ سادہ ؟" کوڑیاں تار والی استری نکالتے ہوئے اظہر نے پوچھا۔

"کیوں رشو ؟"

"پالی بے شک نہ پھڑکے بی۔ لیکن ریگولیٹر لگا ہو کاٹن، ریپان، نائیلون وغیرہ کے لیے۔"

"بہت خوب! زحمت نہ ہو تو ادھر آجائیے ذرا۔"

وہ اظہر کے پیچھے اس طرف چلی گئیں جہاں کاؤنٹر نما تختے پر تولیے کے بنے ہوئے پلنگ پوشش پڑے تھے۔ اظہر اپنی دوکان میں سیلزمین نہیں تھا پھر بھی اس نے خود دو چار بدیسی استریاں نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیں۔

"یہ آٹومیٹک ہے اور سستی بھی ہے۔ پانچ سال کی گارنٹی ہے اس کی۔"

"گارنٹی تو خیر کسی بات کی بھی نہیں لی جا سکتی۔"

رشو کو کب معلوم تھا کہ مال روڈ کی اس دوکان میں اس وقت اندر والا دروازہ کھول کر ظفر آجائے گا؟ ظفر کی شکل دیکھتے ہی لوٹتی ہوئی نظر نے اظہر کو پہچان لیا۔ دونوں میں اس چھپی ہوئی مشابہت کو بھانپ کر رشو کو بڑی عجیب سی خوشی ہوتی۔

ظفر کالج سے لوٹتے ہوئے پتہ نہیں کیوں دوکان پر آگیا تھا۔ ایک بے چینی اسے سارے لاہور میں اڑائے پھرتی تھی۔ اتنے سارے خط جو اس نے رشو کو لکھے ان کے جواب میں اسے ایک ہی چیز نصیب ہوئی۔ . . بے چینی . . .

کبھی وہ تین منزلہ مکان کی چھت سے کود جانے کا پروگرام بناتا کبھی خواب آور گولیاں کھا کر سو رہنے کی تمنا کرتا۔ . یہ عشق نہیں تھا بلکہ اسے یوں احساس ہوتا

تھا جیسے اس کے گلینڈز بگڑ گئے ہیں۔ تھائرائیڈ اور ایڈرنل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ پیٹیوٹری اپنا فنکشن کرنا بھول گئی ہے۔ سائیکولوجی کے ایم اے میں پڑھنے کی رعایت سے وہ یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ رشو کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ گھٹیا بات تھی۔ ... بالکل معمولی، افسانوی فلمی۔ ایم اے میں پڑھنے والے انٹلیکچول قسم کے لڑکوں کو عشق وِشق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی لیے تو اس کے سارے خط نفسیات کے نوٹس کی مانند دقیق، گنجلک اور سائیکولوجی کی ٹرمز سے بھرے ہوئے تھے۔

"وہ اظہر سے پھر رکھیں گے جی کسی روز ایک اچھی سی افطار پارٹی... آپ کے پروفیسر صاحب کو بھی بلائیں گے جی... کیا نام ہے ان کا... اعجاز حسین کو بھی ہو جائے جی اسی خوشی میں ایک آئس کریم پارٹی... ضرور رکھیں گے جی کسی دن۔ آپ دوکان پر آئیں جی کسی دن... وہاں رکھیں گے جی..." اسی "رکھیں گے" کے سلسلے میں دوکان پر پہنچا تھا۔ اور پون گھنٹے سے اندر گودام میں کھڑا سامان دیکھے جا رہا تھا۔ اور اظہر ایک کام سے دوسرے کام تک ٹڈے کی طرح پھدک رہا تھا۔ اب جو اندرونی بے چینی نے ظفر کو باہر نکالا تو رشیدہ میز کاؤنٹر پہ کہنی ٹکائے کھڑی تھی۔

"وہ میری نگاہ سے اس طرح کانپتی ہے جیسے صحرا کی اونٹنی تنگ پہنتے وقت لرزتی ہے۔ جب میں اپنی نظروں کے تیر سے اسے چھوتا ہوں تو وہ اس طرح سمٹ جاتی ہے جیسے گوری عورت بازوبند کی ٹھنڈک سے۔ اس [illegible] وہ پابند ہے جو دور دراز کے سفر پہ میری گردن سے اکیلا چپٹا ہے۔ اس کی محبت میں میں جنگل جنگل پھرتا

ہوں۔ گویا میں اور سبزیاں ہم نسب ہیں کہ آپس داری کرتے ہیں۔ اسی رعایت سے
وہ بھی میری رشتہ دار ہے۔ کیونکہ جاسم کے سرخوں نے اسے اپنی آنکھیں دے دی ہیں۔ آنکھوں
میں اونگھ سی بھری رہتی ہے نیند تو آتی ہے مگر وہ سوتی نہیں۔

ظفر نے لمحہ بھر کچھ سوچکر سر جھٹکا۔ اپنے خیالات کو Aberrations کا خطاب دے
کر آگے بڑھا۔ اور ڈمپل کے پاس آکر رک گیا۔ اس سے آگے بڑھنے کی اس میں ہمت
نہ تھی۔

"گڈ ایوننگ مس۔"

"گڈ ایوننگ ۔۔" ڈمپل نے خوش خلقی سے جواب دیا۔

رشو نے سر کے اثباتی جھٹکے سے سلام کا جواب دیا اور استری کے پلنگ کی
پچگی دیکھنے لگی۔

"بھائی جان! یہ میری کلاس فیلوز ہیں۔ ڈمپل ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔
رشیدہ میر مس۔"

"میرا نام شکیلہ ہے ظفر۔" ڈمپل نے مسکرا کر کہا۔

"یہ میرے بھائیجان ہیں ۔۔ اظہر صاحب۔"

رسمی تعارف کے جملہ کوائف پورے ہو گئے۔ تو ایک بار پھر استری کی پسند پر چھان
بین ہونے لگی۔

"پیلی بتی کی جگہ اگر سبز بتی ہوتی تو زیادہ Attractive لگتی استری ہے نا رشو؟"

"خیر سنز بھی کچھ ایسی بری نہیں۔"

اظہر انہیں استریوں کے پاس چھوڑ کر جا چکا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد چائے ضرور آگئی تھی۔ رشو تو استری لیکر کبھی کی بھاگ گئی ہوتی لیکن ظفر چائے بنانے میں کچھ اس طرح مشغول تھا جیسے دودھ کی نہر کاٹ رہا ہو۔ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

چائے کی پیالیاں دونوں لڑکیوں کو پکڑا کر ظفر بھائی جان کی طرف چلا۔ وہ کیشیئر کے پاس کھڑے ایک صاحب کو ایئر کنڈیشنر دکھا رہے تھے۔

"بھائی جان! کچھ رعایت کر دیجئے گا۔"

"بالکل بالکل تم فکر نہ کرو۔ چائے پہنچ گئی۔"

"جی ہاں۔۔ پہنچ گئی۔۔ شکریہ۔۔"

"تو پھر جی وہ رکھیں گے کسی دن تمہارے پروفیسر صاحب کے ساتھ۔ ان دونوں کو بھی بلا لینا۔ ہونی چاہیے ایک محفل کہیں جہانگیر کے تومب وغیرہ پر۔۔ سن سٹ کے قریب۔۔"

ظفر ہاں جی ہاں جی کہتا ہوا لڑکیوں کی طرف لوٹنے لگا۔ اگر اس وقت اس کی جیب میں اتنے پیسے ہوتے اور رشو کے انکار کا دھڑکا نہ ہوتا تو وہ ضرور استری کے دام خود ادا کرتا۔

عام بازاری بھاؤ سے تین روپے ساٹھ پیسے زائد ادا کرنے کے بعد جب ڈمپل رشو اور ظفر سیڑھیاں اتر رہے تھے تو ظفر کے اباجی سے ملاقات ہو گئی۔

ظفر کے باپ کی پرسنیلٹی کسی امریکن سیاست دان کی سی تھی۔ دبنچا لمبا سہ دفعہ کھرا کھرا سوٹ جیسے کسی ملٹری شاپ کے درزی سے سلوایا گیا تھا۔ دو رنگے سابر اور پیٹینٹ لیدر کے جوتے، منہ میں پائپ۔ وہ معمّر فلمی ایکٹروں کی طرح بڑی علیحدہ سی زندگی بسر کرتے تھے۔ سمندر میں رہ کر جہاز جیسی علیحدہ زندگی۔

ظفر کے پیروں سے سیڑھیاں پھسل کر آگے فٹ پاتھ پر جا گریں۔

"سلام علیکم۔ اباجی۔۔۔"

"وعلیکم السلام"

لوٹ کبوتروں کے ساتھ ظفر کو اترتا دیکھ کر پہلی بار اباجی کو احساس ہوا کہ ظفر جوان ہو چکا ہے۔

"یہ۔۔۔ یہ اباجی میری کلاس فیلو ہیں مس ڈمپل اور رشیدہ میر۔۔۔ یہ میرے اباجی ہیں۔"

تعارف کے بعد مؤدب سلاموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ رشو کے ہاتھوں میں نہ جانے کیوں ہلکا ہلکا پسینہ آنے لگا۔

اف توبہ! کیا پرسنلٹی ہے۔۔۔ کیا شاہِ بلوط جیسا قد ہے۔ باپ کے سامنے تو بیٹا بالکل ہی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔۔۔

"کچھ خریدا ہے آپ نے اظہر کی دوکان سے؟"

"جی اباجی! میں یہاں اظہر بھائی سے ملنے آیا تھا۔ یہ اتفاقاً استری خریدنے

آگئیں . . . . استری خرید کر جا رہی تھیں ۔ آٹومیٹک استری ہے ۔ ریگولیٹر بھی لگا ہے نائیلون وغیرہ استری کرنے کے لیے۔" وہ کبھی ایک پیر پر کبھی دوسرے پیر پر کھڑا انجانے کیا کیا بکے جا رہا تھا۔

"بل کہاں ہے آپ کا؟"

رشو نے بیاسی روپے ترانوے پیسے کا بل اباجی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"پہلی مرتبہ آپ آئی ہیں دکان پر؟"

"جی۔"

چند لمحے جیبوں کو ٹٹولنے کے بعد اباجی نے جیب سے بیاسی روپے نکالے اور انہیں رشو کی طرف بڑھا کر بولے۔

"لو بیٹیا۔"

"جی؟"

ظفو نے یکدم ریلنگ پکڑ کر اپنے آپ کو مستحکم کیا۔

"آپ ظفر کے ساتھ پڑھتی ہیں۔ ہم آپ سے کیسے پیسے لے سکتے ہیں۔ افسوس ترانوے پیسے میرے پاس نہیں ہیں۔ ورنہ وہ بھی میں تمہیں ضرور دیتا۔"

"لیکن جی . . . جی یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ یہ تو بڑی رقم ہے جی؟"

"بڑوں سے اس طرح بحث نہیں کیا کرتے ۔ میں ظفر کا باپ ہوں ۔ ظفر تمہاری کلاس میں پڑھتا ہے۔"

ڈمپل نے رشو کو نامعلوم سی کہنی ماری۔

"لیکن جی ... یہ ضرورت کی چیز ہے۔ میں .. مجھے اس کے پیسے امّی نے بھجوائے ہیں جی خاص ... میں یہ ..."

"دوبارہ آؤ گی اس دوکان پر تو جو کچھ خریدو گی اس کے پیسے خود ادا کرنا۔ پہلی بار اس طرح نہیں کرتے۔ یہ ہمارا رواج ہے۔ بچیوں کا حق ہوتا ہے اپنی دوکان پر۔"

رشو نے چپ چاپ پیسے پکڑ لیے۔

ظفر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ گیس غبارہ ہے اور آپ ہی آپ اوپر کی طرف چڑھتا جا رہا ہے۔ صرف ملک صاحب نے کنکھیوں سے رشو کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ سوچے بوجھے دوکان کی طرف چل دیئے۔

ان کے پاس لڑکیوں کے متعلق سوچنے کو وقت نہ تھا۔ وہ بڑے پیمانے پر سوڈا ایش کی فیکٹری بنانے کے پلان بنا رہے تھے۔ اور ان کی آئس فیکٹری میں ان دنوں جو لیبر کی ہڑتال ہو گئی تھی۔ اس کے سبب وہ سارا دن دماغی الجھنوں میں مبتلا رہتے تھے۔ نہ انہیں برٹرنڈ رسل پڑھنے کا موقع ملتا تھا نہ جولین ہکسلے پر تنقید کرنے کی فرصت ملتی تھی۔ جیمز جوائس، ٹی ایس ایلیٹ کا مطالعہ بند۔ ڈیوما اور کافکا کی ورق گردانی ختم۔ زندگی چرخے کی مال بنی بے مصرف گھومے جا رہی تھی۔

ظفر نے لمحہ بھر اپنے والد کی طرف دیکھا اور پھر رشو اور ڈمپل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ...

"آپ کل شام الحمرا میں آئی تھیں شاید . . "

"جی ؟" رشو جان نے آہستہ سے پوچھا۔

"جی اور غالباً تیسری قطار میں بیٹھی تھیں"

"نہیں تو . ." رشو نے جھوٹ بولا۔

"پھر آپ کی ہمزاد تھی یا توام بہن تھی آپ کی"

"کیا ڈرامہ تھا ؟" ڈمپل نے سوال کیا۔

"اڈاپٹیشن تھی . . . ڈرامہ نہیں تھا"

"خدا جانے یہ ادیب لوگ ڈرامے کیوں نہیں لکھتے۔ بس ہر وقت اڈاپٹیشنز . . .
توبہ . . . توبہ . . . توبہ . . ." ڈمپل ہاتھوں پر پیس کے دستانے چڑھاتی ہوئی بولی
"دیکھئے ایک کپ کافی میرے ساتھ پیئیں تو نوازش ہوگی۔"

رشو کا دل آبشار کے پانیوں کی طرح بیقرار ہو گیا۔

"خدا کے لئے انکار نہ کیجئے۔ یہ دیکھئے سامنے ہارس شو میں بڑا ہی ڈیسنٹ ہوٹل
ہے۔ تھوڑی دیر گپ رہے گی۔ سائیکلوجی پر تبادلہ خیال کریں گے"

"اگر وہاں بھی لبیڈو اور مورٹیڈو کی باتیں کرنا ہیں آپ کو تو جناب میں تو چلتی ہوں
میں ایسی تفریح سے ڈرائی کلینر کی دوکان میں کھڑا ہونا پسند کرتی ہوں"

"بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ڈمپل"

"خدا کے لئے مس میرا"

ظفر کی آنکھوں میں التجا تھی اور الفاظ اس کے لبوں پہ سے اس طرح گذر رہے
تھے جیسے چھوٹا سا بچہ دوست کے کھیلنے کو چھوڑ کر کہتا ہے . . . "یہ تیرا ... سارے کا
سارا . . "

دکن میں مہلا روپیہ شہر کے پاس ہی سنیاسیوں کا مٹھ تھا اور اس
مٹھ کے پاس ہی ایک پوکھر تھا کہ جس پر گھن دار کائی جمی تھی ۔ اور کنول کے سفید سفید
پھول ہر رت میں کھلے رہتے تھے ۔ اس تالاب کے کنارے ایک برگد کا ایسا گھنیرا
درخت بھی تھا کہ دن کے وقت کرنوں کا گذر بھی ادھر نہ ہوتا تھا ۔ اس درخت پر نکھری نامی ایک
بندر رہتا تھا ۔ برگد کی گھنیری چھاؤں سے نکلتا تو رس بھری جامنوں کے درخت پر چڑھ
جاتا ۔ ادھر سے طبیعت بھر جاتی تو آم کی ڈالیوں سے جھولنے لگتا

ایک دن وہ میٹھا تن سے جو رس نکال رہا تھا کہ ایک کچھوا ... نامی تالاب
سے نکلا اور ساحل پر آ کر لمبی لمبی جمائیاں لینے لگا ۔ بندر کو کچھوے کی یہ بات بہت پسند
آئی اور ہاتھ دوستی کا بڑھایا ۔ پکے پکے جامن کھلائے ۔ رس بھرے آم توڑ کر لایا ۔ اب
کچھوا تھا آبی جانور ۔ گدلے پانیوں میں رہنے والا ۔ جامن اور آم جو منہ میں گئے تو رس
ہو گیا ۔ گھر گیا اور پتنی کے لئے بھی تھوڑی سی سوغات دونے میں لیتا گیا ۔ پتنی نے جو آم
اور جامن کھائے تو بولی سی بولی . . . "ہائے رے رجنا پر تو ان میں تو گٹھلیاں ہیں!"
رجنا بولا . . . "اور جو گٹھلیاں نہ ہوویں تو اور پودے کہاں سے لگیں؟" استری چھوٹے
بچوں سے بولی . . . "دیکھو بیٹیا! جو پہلی بھینٹ میں ایسی سوغات دکھاوے وے

مترّ نہیں ہوتا۔

دوجے دن پھر کچھوا بندر سے ملنے گیا۔ خوب خوب آم جامنیں کھائیں اور بیوی کے لئے بھی دونا بھر کر لے گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بندر اور کچھوا پیر کے اوپر اور نیچے جڑے کی طرح ملنے لگے۔ اور ایک کشن کو بھی جو ایک دوسرے کو چھوڑتے تو پھر آپ لگتے۔ رجنا کی دھرم پتنی کو یہ بات بہت بری لگی۔ ایک روز جب کچھوا جامنوں کا دونا لے کر آیا تو اس کرم جلی نے منہ میں دو جامنیں ڈال کر اونچے اونچے رونا شروع کردیا "مرگئی۔ دہائی ہے! کوئی بید بلا ہم جلی کو بچائے۔۔۔۔ ہائے بھگوان کس جنم کا پاپ سامنے آیا۔" کچھ دیر تو کچھوا اس کا منہ دیکھتا رہا پھر گھبرا کر پوچھا "کیوں بھاگوان کیا ہوا؟" "ہونا کیا ہے مرگئی۔ تیرے اس مرن جوگے نے اپکار کیا۔ مجھے سمایت کیا اب تو ہوگا اور دے۔ مرتو میں گئی۔ کوکھ میں جھاڑو تو میری ماں کے پھیری۔" بڑی منت سماجت کے بعد پتہ چلا کہ حلق میں جامن کی گٹھلی پھنس گئی ہے۔ "میں تو سدا کی کہتی تھی کہ وہ گٹھلی دار پھل ہی اس کو ان بھیجتا ہے ورنہ کہاں ہماری جاتی کہاں بن مانس۔۔۔ ان کی گانٹھ تو ہنومان جی سے ملتی ہے۔ وہ ہم سے کب ملتے ہیں بن کھوٹے کے۔"

تھوڑی دیر بھر والی اٹواٹی کھٹواٹی لیے پڑی روتی رہی تو کچھوے کا من پانی کی طرح پگھل کر ٹھنڈا ہو گیا۔ جب رجنا کو یوں مرم ہوتے دیکھا تو دھرم پتنی ایڑیاں رگڑنے لگی۔ اور بولی۔۔ "اگر اس شودر کا ہردے مجھے لا کر نہ دیا تو میں تیرے گھر نہ بسوں گی۔ لے اپنے دوار کی راکھی کر۔۔ میں تو چلی۔" پیچھے مچھ کرم جلی

کوروئیں گے۔ ۔ ۔ روئے دے کلپنے دے۔ مرگئی تو میری چتا پر نہ آئیو۔ میرے کیاں کریا پرنہ پہنچیو۔"

بیوی کی باتیں سن کر رجنا کے پیروں تلے سے دھرتی نکل گئی۔ پتنی کو دلاسہ دیا اور بندر کا دل نکالنے کے لئے پوکھر کے باہر چلا۔

"رشو" جان میز پر کہنی ٹکائے بیٹھی تھی۔ ڈسپل دو موہے کانٹے کے ساتھ چار تہہ والا سموسہ کھانے میں مشغول تھی۔ اور ظفر سوچ رہا تھا۔ کاش رشو مجھ سے کہے" جا۔ اپنے باپ کا کلیجہ نکال کر سٹین لس سٹیل کے طشت میں دھر کر لے آ۔ کاش یہ کہے کہ دیکھ میں سوالی ہوں اور جب تک تیرے باپ کا کلیجہ لہو اور انگوری شراب میں رڑ رہا ہوا میرے سامنے نہ آئے گا میں تجھ سے کبھی نہ بولوں گی۔"

اس مکروہ خیال سے اس نے گردن جھٹک کر چھٹکارا تو پالیا۔ پر ضمیر کا تیر دل میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔

ظفر کی طبیعت میں بلا کی شدت تھی۔ اسے جب رشو جان سے محبت ہوئی تو اس میں میدانی علاقوں کے دریا کی سست رفتاری نہ تھی بلکہ قطب شمالی کے برف پر چلنے والی برق رفتار برف گاڑیوں کی سی تیزی تھی۔ وہ رشو جان کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ مہیب ۔ ۔ ۔ خطرناک ۔ ۔ ۔ اچھوتا ۔ ۔ ۔ ان ہونا ۔ ۔ ۔

وہ کسی طرح رشو جان پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ نسل انسانی میں وشت وفا کی تمام رموز صرف اسی کو سمجھ آتے ہیں۔ صرف وہی محبت کے پانیوں کا پیراک ہے۔

"اب چلیں ناں ڈمپل۔ بڑی دیر ہوگئی ہے پیچ!" رشو نے کہا۔

"ابھی سے . . . ابھی سے؟" ظفر نے سوال کیا۔

"بڑی دیر ہوگئی ہے پیچ . . ."

میز پر فارمیکا کی آئینہ سی سطح میں رشّو کا چہرہ منعکس تھا۔ ظفر اسی عکس پہ نظریں جمائے بیٹھا سوچ رہا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟ اور مجھے کیوں عزیز ہے؟ یہ کہاں سے آئی ہے؟ اور کیوں آئی ہے؟ اگر اس وقت میں اس کا حلق اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دوں تو کیا ہے؟"

ہر بات اس کے سوچ میں بگولے کی طرح اٹھتی اور بیٹھ جاتی۔ ساحل کی ریت کی مانند . . .

میں نے اپنے ابّاجی کے متعلق ایسی بھیانک بات کیوں سوچی بھلا؟

میرے جی میں یہ خیال کیوں ابھرا؟

یہ لمبے کانوں والی جادوگرنی کیسی ہے جو دریا کے پانی کو ایک ہی لاٹھی مار کر دو حصوں میں منقسم کردیتی ہے؟ پھر ان پانیوں میں خشک راستہ اتنا بڑا ہوجاتا ہے کہ اس پر بنی اسرائیل کے گدھے زیتون کے تیل سے بھرے مشک اٹھائے اور عورتیں کندھوں پر جو کی روٹیاں لٹکائے اور مرد لاٹھیوں سے جانوروں کو ہانکتے، کندھوں پر یہودی بچوں کو اٹھائے چلے جا رہے تھے . . . . . یہ بیچ دریا کے درمیان کیسا قافلہ جا رہا تھا . . . . . یہ لوگ کون تھے؟ کہاں جا رہے تھے؟

ظفر پر ان گوناگوں غیر مربوط خیالات کی یورش ہو رہی تھی۔ اور وہ خود حیران تھا کہ ایسی باتیں اس کے ذہن کے کس گوشے میں چھپی ہوئی تھیں کہ ذرا سا پتھر اچھلتے ہی ذہن کی کالی غار ان گمبیں بتیوں سے منوّر ہو گئی۔

جب ڈمپل تھوڑی دیر کے لئے ٹائلٹ میں گئی تو ظفر نے آہستہ سے پوچھا۔

"آپ کو میرے خط مل گئے تھے؟"

رشو نے گھبرا کر ادھر اُدھر کلک کے لئے نظریں دوڑائیں لیکن ہر طرف بادر دی بیرے پھر رہے تھے۔ میزوں پر نگاہ ڈالی تو رشو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

چار میز چھوڑ کر ادھر سرخ ٹائی اور چہرے پر سیاہ چشمے لگائے ریاض بیٹھا تھا۔

"آپ میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں!"

"پلیز! خاموش رہیں۔"

"میں ریت کی گھڑی نہیں ہوں رشیدہ! کہ ذرّوں کی پتلی دھار بن کر وقت میں ڈھلتا رہوں... میں... میں... تو وہ زمستانی ہواؤں ہوں جو ہڈیوں کے آر پار ہو جاتی ہے۔ جو دروازے کھڑکیوں کی درزوں میں سے نکل کر لحافوں کو چیر جاتی ہے... میں بہت ضدی ہوں... بے حد... آپ نے اگر میرے اس خط کا جواب نہ دیا تو... تو میں کچھ شرمناک حرکت کر بیٹھوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک نیلا لفافہ نکالا۔ اور رشو کی پیالی کے پاس رکھ دیا...

"آپ کو مجھ سے بالآخر محبت کرنا ہوگی۔ کرنا ہوگی اور ضرور کرنا ہوگی...... میں
پہلے گڑگڑاؤں گا پھر جھنجھوڑوں گا اور بالآخر تمہیں زبردستی اغوا کروں گا۔"
سیاہ چشمے والے ریاض نے چہرے سے عینک اتار کر رشو کی جانب دیکھا۔
ابھی کچھ دیر پہلے وہ ظفر کے سے بڑی انجانی سی کشش محسوس کر رہی تھی۔ اور اب
وہ سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔ جیسے اس پر بیک وقت پیار سے یک وقت حملہ ہوا ہو۔ ادھر ظفر کی
التجائیں وحشتناک لہجہ اختیار کر گئیں۔ ادھر ریاض برے جیسی نگاہوں سے اسے بھنبھوڑنے لگا۔
"میں اس خط کا انتظار کروں گا جو تمہیں اب تک مجھے لکھ دینا چاہیے تھا۔"
رشو نے ڈمپل کو دیکھ کر مارے گھبراہٹ کے نیلا خط اٹھایا اور اسے جلدی سے
پرس میں ڈال لیا۔
"اب ہمیں اجازت دو ظفر!...... مجھے واقعی دیر ہو رہی ہے۔"
"پھر؟"
"پھر کیا؟"
"تمہاری خاطر ہم نے اپنا اصول توڑ لیا۔ ہم کسی کالج کے لڑکے کے ساتھ آج تک
کسی ریسٹورنٹ میں نہیں گئیں۔
"میں کالج کا لڑکا نہیں ہوں۔" وہ منہ تھتھا کر بولا۔
"پھر کیا ہو تم؟"
"کولرج کا اینشنٹ میرینر۔"

"واقعی تم بہت فنی ہو۔" ڈمپل اٹھتے ہوئے بولی "سنو رنشو! ایسے آدمی بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ تم بیچاری سیدھی ہو بچ کے رہنا۔"

"یہ کاش تمہیں اپنے آپ کو بھی دینا چاہیے تھا ڈمپل" رنشو نے ہنس کر کہا۔

وہ تینوں جب سیڑھیوں تک پہنچے تو ریاض اپنی سیٹ خالی کر کے جا چکا تھا...!

انوری کے جانے کے بعد خالہ فیروزہ پر اتنی بات بہت جلد کھل گئی کہ اب گھر کا بہت سارا کام ان کے کندھوں پر آپڑا ہے۔ پہلے چاہے لاکھ ہونٹ لٹکائے کھولنڈرے گھسیٹتی تو پھر انوری ہی وہ سنڈریلا گھر کا تمام کام کاج کرتی تھی۔ اب صفائیاں، کپڑوں کی استری، مہمانوں کی دیکھ ریکھ، بہت سارے غیر ضروری کام خالہ کو خود کرنے پڑتے۔ لیکن ایک خوبی خالہ فیروزہ میں ضرور تھی۔ جب کوئی بہت بڑا سہارا زندگی سے نکل جاتا تو اس بیساکھی کے لئے آٹھ آٹھ آنسو رونے کی بجائے وہ زمین پر رینگتی ٹھوکریں کھاتی اس سہارے کو نوکروڑ صلواتیں سناتیں۔

انوری کے ہر کام میں اب کام چوری، بددیانتی، اور پھوہڑپن صاف ظاہر تھا۔ نہ غسل خانوں کی بالٹیاں لوٹے صاف تھے نہ سائیڈ بورڈ کے شیشے چمکتے تھے۔ چائے کی پتی انوری کے زمانے میں زیادہ لگتی تھی۔ چینی کا خرچ بھی زیادہ تھا۔ دریوں کے نیچے سے جو مٹی کی باریک تہہ برآمد ہوئی وہ بھی انوری کے کام چور ہونے کی پکی دلیل تھی۔

گودام میں گندم کی بوریاں چوہے کتر گئے... انوری کا قصور۔

تیل کے چولہے کا دوسرا پیچ ڈھیلا تھا... انوری مرتد۔

باورچی خانے کی نالی کے سامنے سے جالی غائب تھی . . . . وہی قصوروار۔

برآمدے کے گملے تلے مری ہوئی چھپکلی نکلی . . . . مردار مری ہوگی۔

ڈریسنگ ٹیبل پر لپ سٹک اور کیوٹکس کے داغ . . . . سوائے اس کے اور کسے کچھ کہیں۔

خالو میاں کی عینک کا شیشہ ٹوٹا . . . . اسی کے ہاتھ سے تو گری تھی . . .

غرضیکہ انوری کے خلاف ہر لمحہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات شکایتاً کہی ضرور جاتی . . . . گو خالہ فیروزہ بظاہر نازاں تھیں لیکن ہر لمحہ اسے یوں یاد کرنے کی رعایت سے عیاں تھا کہ خالہ فیروزہ کی زندگی انوری کے جانے سے بہت دوبھر ہو گئی ہے۔

جب سے انوری گئی تھی خالہ پر صفائی کا بھوت سوار تھا۔ وہ گھر والوں پر ظاہر کرنا چاہتی تھیں کہ انوری اس گھر میں اس قدر اہم نہیں تھی جس قدر سب لوگ سمجھے بیٹھے ہیں۔ . . . وہ اپنے آپ کو بھی یقین دلانا چاہتی تھیں کہ انوری کے بغیر بھی اس گھر کا نظام اسی طرح چل سکتا ہے جیسے چلا کرتا تھا۔

انوری کے جانے کے پون ہی گھنٹے بعد پلنگوں کی نواڑیں ادھیڑی گئیں اور غلام رسول کے ہاتھ ون ڈے سروس کے لیے قریبی ڈرائی کلینر کو بھیجی گئیں۔ پھر قالین دریوں کی باری آئی۔ گھر کو آئینہ خانہ بنانے میں غلام رسول اور رمضان خالہ فیروزہ کے ساتھ گھرک گئے حتیٰ کہ ڈیوڈ کو بھی اندر بلا کر اس کی ڈیوٹیوں میں اضافہ کیا۔ پہلے انوری سارے گھر

کے بوٹ صاف کرتی تھی۔ اب صبح سویرے ڈیوڈ گر برپائی سے گھر والوں کے بوٹ
نکال کر کرسی پر بیٹھ کر پالش کرنے لگا۔ رمضان ایک تو زخم خوردہ تھا۔ دوسرے زیادہ
شامت اسی کی آئی۔ گھر بھر کے فرنیچر کو اٹھانے دھرنے میں وہ بیدم ہوگیا۔ بھبنیں کے کمرے
سے لے کر اگلی لان میں لگے ہوئے نلکے کے چپہ چپہ تک کونا کونا صفائی کے نرغے میں آگیا۔
کچھ تو خالہ کو رشو جان کا کمرہ درکار تھا۔ وہ گودام میں سے کچھ چیزیں نکال کر ادھر رکھنا چاہتی
تھیں کچھ ان پر صفائی کا بھوت بری طرح سوار تھا۔ غسلخانے کی سنک صاف کر کے باہر نکلیں
تو سیدھی رشو کے کمرے میں پہنچیں۔ دیوار پر جالے دیکھ کر پہلے انہوں نے رمضان کو بلایا۔
"رمضان! بڑا سا ڈنڈا لے کر آؤ۔ جلدی! سامنے برش لگا دینا دیواریں صاف
کرنے والا۔"

رمضان کے آنے تک انہوں نے کرسی پر چڑھ کر دیوار سے کانسی اور پیتل کے
بھاری برتن اتارنے شروع کر دیئے۔ یہ سارے برتن ان کے جہیز کی یاد دلاتے تھے۔
جب یہ برتن ان کے لیے بہت قیمتی تھے۔ اب تو یہ گرد سے اٹے ہوئے ماضی کے ساتھ
جوڑنے والی ایک کڑی کی حیثیت سے باقی تھے۔ ورنہ ان کا نہ کوئی کام باقی تھا نہ ہی
ان کو بیچ ڈالنے کی ہمت تھی۔

رمضان نے جب آیا تو انہوں نے سارے کمرے کا سامان جو الماری میز کرسی اور
بک شیلف کے علاوہ برتنوں پر مشتمل تھا۔ کمرے کے وسط میں اکٹھا کر رکھا تھا۔
چارپائی گھسیٹ کر کھڑکی کے سامنے کھڑی کی گئی تو درمیانے سائز کا سیاہ

ٹرنک جس پر گجرلت کا تالا پڑا تھا، پلیٹ فارم کے سامان کی طرح یکدم ننگا ہو گیا۔

"یہ چابیاں سنبھال لیجئے بیگم صاحبہ۔ تکئے تلے سے نکلی ہیں۔"

"کونسی چابیاں؟" خالہ نے ٹرنک پر نظریں جما کر پوچھا۔

"بی بی رشیدہ کے تکیے تلے سے۔ جی . . ."

"اچھا اچھا . . . لاؤ مجھے دو . . ."

رشیدہ بس میں سوار ہوئی تو بس کا انجن گونجنے لگا۔

"آپ کو مجھ سے بالآخر محبت کرنا ہو گی۔ کرنا ہو گی اور ضرور کرنا ہو گی۔ میں پہلے گڑگڑاؤں گا

پھر جھنجھوڑوں گا اور بالآخر تمہیں اغوا کر لوں گا۔"

آواز جلدی جلدی گیئر بدل رہی تھی۔ بریک لگا رہی تھی۔ کبھی بائیں موڑ کاٹ جاتی

کبھی دائیں رخ پر مڑ جاتی۔ سرخ بتی پا کر چپ سادھ لیتی۔ اور سبز بتی دیکھ کر دھمکی دیتی

ہوئی چل دیتی۔ یہ آواز پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے درختوں کے ساتھ، دوکان کی لمبی لمبی

شفاف کھڑکیوں میں بس سٹاپ پر کھڑے ہر مرد عورت میں چھپ گئی تھی۔ اور ہر اوٹ

سے جھانک کر اسے دیکھ رہی تھی . . . "میں تمہیں جھنجھوڑوں گا . . . جھنجھوڑوں گا

. . . گڑگڑاؤں گا . . . اغوا کر لوں گا . . ."

سپاہی ہاتھ دے دے کر ان انتجاؤں کو گزر جانے کی اجازت دے رہے

تھے۔ کنڈکٹر نے جب روپے میں سے ساڑھے تیرہ آنے اسے واپس کئے تو ان

پیسوں میں وہی کھنک تھی۔ اس پر جھک آنے والی عورت اور اسے اپنی گھڑی سے ٹھوکر

لگانے والی بڑھیا سب ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔ گڑگڑانے کی آواز، جھنجھوڑنے کا فعل گرڈ کے تواتر کی طرح لمبی تاریں بدلتا جا رہا تھا۔ اور اس تاریں وہ بندھی جا رہی تھی

جب خالہ نے رمضان سے چابیاں لے کر رشو کے ٹرنک کا تالا کھولا تو محض تفریحاً کھولا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسے رنگین اور جان کے دیوان کی طرح دلچسپی سے الٹنے پلٹنے لگیں۔ جنسی لطیفوں کی طرح کسی کے ٹرنک کو اس کی غیر موجودگی میں جھنجھوڑنے کا بھی ایک خاص لطف تھا۔

پہلے ان کے ہاتھ رشیدہ کی ڈائری لگی۔ سبز جلد والی ڈائری جس نے اس سے کچھ نہ کہنے کا عہد کیا تھا۔ اور جو حرف بحرف سب کچھ اگلے جا رہی تھی۔ ... بدعہد مینا کی طرح ... چندرا وتی کا ایک ایک راز سمندر کی تہہ سے نکل کر سفید پیٹ والی مردار مچھلی کی طرح پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔

خالہ فیروزہ نے ڈائری کے اوراق محض اس لئے الٹ پلٹ کئے تھے کہ ان سے وہ بہاولپوری اجڈ گنوار لڑکی کے خیالات پڑھنا چاہتی تھیں۔ اور یہاں بھان متی کا پٹارہ کھلا تھا۔

"یہ برتن واپس رکھ دوں جی ... ؟" رمضان نے کانسی کے مجھولے صاف کر کے پوچھا ...

"ہاں رکھ دو دیوار گیر پر۔"

جوں جوں صفحے کھلتے جاتے تھے۔ ان پر اپنی حقیقت، اسنر گرگی نفسیات

اور اس مکّار عیّار لڑکی کی تمام گھنّی باتیں کھلتی جاتی تھیں۔ خالہ کبھی کرسی، کبھی میز اور کبھی کھڑکی کی سل پر بیٹھ کر ڈائری پڑھتی رہیں۔ اور جب ڈائری پڑھ چکیں تو پیرا دڑا نے آدم بو آدم بو پکارتے ہوئے جن کی طرح سارے ٹرنک کی کنسوئی لی۔

مالِ غنیمت میں سب سے کار آمد چیز ٹامیوں کا وہ ڈبّہ تھا جس میں نیلے خط اوپر تلے ٹھنسے ہوئے تھے۔ اس ڈبے کو رومال کے طور پر اپنے ساتھ لیکر خالہ فیروزہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نہ انہوں نے سیاہ بکس کو بند کرنے کی زحمت کی نہ کمرے کی چیزیں واپس رکھوائیں۔ رمضان نے بہت پوچھا کہ چارپائی کس رُخ بچھاؤں۔ بستر بچھاؤں کہ رہنے دوں لیکن خالہ بس اتنا کہہ کر چلی گئیں۔

"بس اب چارپائی بچھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھڑی رہنے دو کھڑکی کے پاس۔"

> سلسلہ جلالیہ کا اصل چہل تنوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ وہ اصل یوں ہے کہ ایک صحابی روز بے اولادی کی شکایت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کرتے تھے۔ ایک روز حضورؐ نے جناب علی مرتضیٰؑ علیہ السّلام کو ارشاد فرمایا کہ تم ان کے سوال پر تنوبر ہو۔ چنانچہ علی مرتضیٰؑ نے ایک تعویز لکھ کر ان کو دیا کہ اپنی اہلیہ کو گھول کر پلادو۔ دحیہ کلبیؓ یہ تعویز لے کر گھر گئے اور اپنی بی بی کو تعویز دیکر حسب ارشاد کہا کہ لے اور گھول کر پی جا۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ بعد چندے کہ امیدواری نہ ہوئی تو دحیہ کلبی دوبارہ شکایت اس امر کی لیکر حضرت کی خدمت میں گئے۔ آپ نے پھر تعویز عنایت کیا۔ بی بی نے یہ تعویز بھی معطّل رکھ چھوڑا۔ غرضیکہ اس طرح چالیس دفعہ چالیس

تعویز علی مرتضیٰ علیہ السّلام نے مرحمت فرمائے اور حیران ہوئے کہ اسمائے الٰہی کی برکت
کہاں گئی۔ بالآخر انہوں نے دہیہ کلبی سے کہا کہ گھر میں جاکر بی بی سے پوچھو۔ ممکن ہے انہوں نے
یہ تعویز استعمال نہ کئے ہوں۔ جب ان کو حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے گھر والی کو برا بھلا کہا۔
اس نے غصّے میں آکر ایک ہی دفعہ میں وہ تمام تعویز گھول کر پی لئے۔ قدرت الٰہی سے جب حمل کا
وقت پورا ہوا تو بچے کی جگہ ایک گٹھڑی سی نکلی۔ جب وہ کھولی گئی تو انتالیس فرزند خرد خرد نکلے
دہیہ کلبی یہ ماجرا دیکھ کر از بسکہ پریشان ہوئے۔ ایک فرزند نکال لیا اور باقی چالیس تنوں کو ٹوکرا
میں ڈال کر جنگل میں چھوڑ آئے۔ قدرت الٰہی سے ان کی حفاظت کے لئے ایک گنبد بے در وہاں
آپ سے آپ بن گیا۔ اور یہ چالیس فقیر قبا و عبا سے آزاد یہاں پلنے لگے۔ اور بعد کو جب مدینہ
میں وبا پھیلی تو وہ آنحضرتؐ کے ساتھ مدینے آئے۔ اور وحشیانہ اور مستانہ وار شہر میں رہنے لگے
بعد مدت خلقت شہر تنگ ہوئی، اور بخدمتِ رسول اللہؐ نالش کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس میں تمہاری
بہتری ہے لیکن لوگ نہ مانے۔ اور ان کے چلے جانے پر مصر ہوئے۔ وہ حسب الحکم نکل تو گئے
لیکن مدینے میں پھر وبا پھوٹی۔ اب پھر لوگ حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور ملتجی ہوئے کہ ان چالیس
درویشوں کو بلا دیجیے اور اس مصیبت سے نجات دلا دیجیے۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ سے
فرمایا کہ تم جاکر ان کو لے آؤ۔ جب شیرِ خداؑ ان کے ساتھ شہر کو لوٹ رہے تھے تو ایک بکری
صدر دروازے سے باہر جاتی نظر آئی۔ انہوں نے فرمایا یہی وبا ہے اسی کو پکڑ لو۔۔۔۔۔
انہوں نے پکڑ لی۔ اور ذبح کر کے کھا گئے۔ لیکن دم ایک کے ہاتھ میں رہ گئی۔
یہی وہ بقیہ مرض ہے جو ساری دنیا کو ستاتا ہے۔ اور اسی سے گھبرا کر اہل

اعتقاد چیل تنوں کی پناہ مانگتے ہیں۔ ہشت گوشہ دنیا میں ہر روز ایک گوشے میں ان کا پھیرا ہوتا ہے۔ فقرائے جلالیہ کو اصل میں چیل تنوں کے پیروکاروں کا فرقہ ہے۔ ان لوگوں میں دستور ہے کہ بوقت بیعت طالب کے داہنے بازو پر مہر لگاتے ہیں۔ اور طریق مہر لگانے کا یہ ہے کہ ایک ٹکڑا کپڑے کا لیکر مرشد بدست خود پیچیدہ کرتا ہے۔ اور پھر اس کو مدور کرکے ایک طرف آگ لگا بازو راست مرید پر رکھ دیتا ہے جب وہ پارچہ اسی جگہ پر رکھا ہوا جل کر خاکستر ہو جاتا ہے تو اوپر سے دبا کر اس کے اوپر برگ بیر رکھ دیتا ہے۔ پھر ہر روز تا اکیس یوم بطور مہر بازو پر لگا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔

جب رشو بان، ہولا، ٹرنک، ٹانیوں کا ڈبہ، زرق ورق چھپی ہوئی ڈائری اور پرانا بستر لیکر ٹیکسی میں بیٹھی تو اس کے دل پر کپڑا جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ اب وہ برگ بیر کی تلاش میں ڈمپل کے گھر پہنچی۔ کیونکہ یہی ایک لڑکی ایسی تھی جس کے گھر اسے اکیس دن پناہ ملنے کی امید تھی۔ اپنا سامان ڈمپل کے برآمدے میں اتروا کر اس نے نیلا ڈبہ تھیلے میں ڈالا اور مال روڈ کی اس دوکان پر پہنچی جہاں بجلی کا سامان بکتا تھا۔

بیعت کرنے کی آخری رسم ابھی باقی تھی۔

غصّے میں وہ سیڑھیاں پار کرکے اندر پہنچی تو اس کی نگاہ اظہر پر پڑگئی۔ وہ کاونٹر کے پاس کھڑا کسی سیلزمین کو ہدایات دے رہا تھا۔

"جی... معاف کیجئے... مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے"

"مجھ سے؟... میں نے آپ کو پہچانا نہیں..."

"پہچاننے کی کوئی ضرورت نہیں . . . آپ ظفر کے بھائی ہیں ناں؟"

"جی . . فرمائیے۔"

"مجھے آپ کے اباجی سے ملنا ہے۔ ابھی اسی وقت . . . اسی لیے . ."

"اباجی سے . . . ؟"

اظہر کے لب پر "رکھیں گے جی اباجی سے ملاقات کسی دن نیو ایئر کے قریب" آیا اور رک گیا۔ لڑکی بہت طیش میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں چیتے کی تیزی اور انگاروں کی دہک تھی۔

"اباجی کا پتہ تو دے دیجئے . . . . میرا منہ کیا دیکھ رہے ہیں آپ۔"

"شیور، شیور . . . ضرور لیجئے پتہ . . ."

لڑکی پر کوئی آفتِ ناگہانی پڑی تھی۔ ورنہ وہ اتنی خوبصورت کیوں لگ رہی تھی . .

نتھنے گلابی ہو کر بری طرح پھٹپھٹا رہے تھے۔

"لیجئے! یہ ہے ہمارے گھر کا ایڈریس . . . . ڈیوس روڈ پر . . . اگر آپ میرا انتظار کریں تو میں آپ کو ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ اپنے گھر . . دوکان بند ہونے پر . ."

"کب ہو گی بند آپ کی دوکان . . ."

گھڑی پر نگاہ دوڑا کر اظہر بولا۔

"یہی کوئی سوا آٹھ بجے . . ."

"جی نہیں شکریہ . . . . میں چلی جاؤں گی . ."

"اباجی دیر سے آتے ہیں . ." اظہر منمنایا . .

"کوئی ہرج نہیں . . . میں انتظار کروں گی "

تیسری منزل پر آپاجی کے انتظار کا دوسرا گھنٹہ شروع تھا - اور وہ فی الحال یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ جن کو وہ بیر کا پتہ سمجھ کر اپنے زخم پر رکھنے آئی ہے ان کا نام کیا ہے ؟

اس کمرے میں ہر طرف کتابوں کی الماریاں تھیں . . کمرے سے بند لائبریری کی بو آتی تھی . . . یہ ایک ایسے شادی شدہ مرد کا کمرہ تھا جو ایک بار پھر مجرد زندگی گذار رہا ہو . . پلنگ کی چادریں قیمتی لیکن گندی تھیں ۔ تکئے پر تیل کا داغ تھا - اور کمرے میں جابجا سگرٹیں بکھر ہوئی تھیں . . . کتابیں جابجا تھیں . . . کچھ آراستہ کچھ بکھری ہوئی - کوئی اوندھی پڑی تھی اور کسی میں نشانی کے طور پر کاغذ پڑا تھا . . . یہ ایک ایسے آدمی کا کمرہ تھا جو اپنے فرصت کے لمحات تمامتر کتابوں کی نذر کر دیتے ہیں . . مہاگنی کی لمبی میز پر چمڑے میں مڑھی کتابیں تھیں تکیے تلے پیپر بیک رنگین ٹائیٹلوں والی کتابیں تھیں . . . الماریوں میں کلاسیکی کتابیں تھیں جن کا کاغذ پیلا اور پرنٹ بہت چھوٹا ہوتا ہے ۔ کھڑکی کی سل پر وہ کتابیں تھیں جن میں جابجا آرٹ ورک تھا - اور بڑے حروف کی کتابت تھی . . غرضنکہ یہ ایک سونے کا کمرہ کم اور مردہ کتابوں کا دفن زیادہ تھا . .

رشیدہ بید کی کرسی پر بیٹھ گئی . .

- سامنے کی دیوار پر ظفر کے والد کی تصویر ٹنگی تھی ۔ یہ تصویر قریباً تیس برس پہلے کھینچی گئی ہو گی . . ظفر کی والدہ کرسی پر بیٹھی تھیں ۔ یہ کرسی وارن ہیسٹنگز کے زمانے کی یادگار لگتی تھی اونچی پشت اور سیٹ دونوں بازوں پر مخمل سے کھنچی تھی ۔ کرسی پر بیٹھنے والی ہندو عورتوں

کی طرح ساڑھی پہنے ہوتے تھی۔ بکل والی گرگابی پنجے پر پنجہ جمائے ہوئی تھی۔ جرابوں کا رنگ جوتی سے گہرا تھا۔ اور پھولدار ساڑھی اتنی اونچی تھی کہ بائیں پیر کا ٹخنہ صاف نظر آتا تھا۔ ساڑھی میں نہ سجاوٹ تھی نہ بانکپن۔ بس لپیٹا لپیٹی کی ہوئی تھی۔ بلاؤز پوری آستینوں کا اور ڈھیلا ڈھالا تھا۔ دائیں کندھے پر ساڑھی کے پلّو سنبھالنے کے لئے ایک لمبا سا بروچ لگا ہوا تھا۔ ساڑھی کا پلّو سر پر بھی تھا۔ اور سر کے بال مس مادھوری کی طرح کانوں کو چھپائے ہوئے تھے۔

لمحہ بھر کے لئے اس تصویر کو دیکھ کر رشیدہ نے سوچا ... اللہ جانے یہ عورت زندہ ہے کہ مر گئی؟ ... اللہ جانے ظفر کی ماں زندہ ہے کہ وہ بن ماں کا اکیلا سارے جہاں میں پھر رہا ہے؟

تصویر کا نوجوان کھلے پائنچوں کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اور اس کے عقب میں ایک بڑا شاداب پام کا پودا نظر آتا تھا۔ بالوں کو تیل سے جما کر دائیں ہاتھ کی مانگ نکال رکھی تھی ... چہرے پر احمق پن، ناکردہ کاری اور تھوڑا تھوڑا خوف طاری تھا جسے مسکراہٹ تلے چھپانے کی کوشش میں اس دولہے نے وارن ہیسٹنگز کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا تھا

کیا یہی ظفر کا باپ ہے؟

کیا اس کی بیوی مر چکی ہے؟

کیا اس گھر میں بھی ویسا ہی خلا ہے جیسا ان کے بہادر پوری مکان میں تھا؟

کیا یہ آدمی بھی اماں کی طرح اداس اور پریشان رہتا ہے؟ سوچتا ہے سوچتا ہے۔

اور جب آنسوؤں کے بہت قریب جا پہنچتا ہے تو پھر کتابوں میں پناہ لیتا ہے بالکل جس طرح اماں پاؤں والی مشین چلانے لگتی ہیں؟

اماں کا چہرہ رشیدہ کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

کیا سادہ سادہ نقشہ تھا اماں کا حسن، بدصورتی کے درمیان بہنے والا ایک بے نام سا ما ئع کہ کبھی تو اس چہرے پر ملکوتی حسن کی پرچھائی پڑنے لگتی۔ اور کسی سی دن گالوں پر لیپٹی ہوئی چھپکلی جیسی چھائیاں بہت زیادہ نمایاں ہو جاتیں۔ چہرہ سنولایا سنولایا لگتا اور ناک کی بانسی ٹیڑھی نظر آتی۔

دراصل اماں کا حسن ان کے موڈ میں پنہاں تھا۔ اماں ہنستی کھیلتی، مکئی کے دانے چباتی، مدھانی پھیرتی، مشین چلاتی، تولئے دھوتی، بستر بچھاتی خوبصورت لگتی تھیں... نماز پڑھتی، ستون کے ساتھ کھڑی ہو کر سوچتی، لوٹا ہاتھ میں لئے زینے سے اترتی اماں بدصورت تھی.. ایسے میں اماں کے چہرے پر وہ تمام فکر وہ تمام سوچیں ابھر آتیں جنہیں وہ اپنے آپ سے بھی چھپاتی تھیں۔

جب اباجی فوت ہوئے اور اماں اندر اکیلی جا کر گندم کی بوریوں پر بیٹھ گئیں تو رشیدہ کو زندگی سے بڑے خوف آنے لگے۔ اماں نہ تو روتی تھیں نہ کسی سے بولتی تھیں۔ بس گندم کی بوری پر کھڑے زانو کئے بیٹھے پاؤں کے انگوٹھے سے بوری کریدے جاتی تھیں۔ جس جگہ اماں نے دائیں پیر کا انگوٹھا اس کریدنے کے لئے پھنسا رکھا تھا۔ وہاں سے بوری کچھ گھس گھس کر نرم ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر اس جگہ نے مزاحمت کی اور پھر یہاں سے دو دو چار چار

دانے گندم کے نکل نکل کر فرش پر گرنے لگے لیکن اماں تو کھڑے زانوؤں کے گرد دونوں
بازو حمائل کیے چپ چپ گرم چادر اوڑھے بیٹھی تھیں

بڑی خالہ گئیں۔ اباّ میاں کی بہت باتیں کی لیکن ایک آنسو ان کی آنکھ میں نہ آیا شیخوں
کی بہو نے بہت زور مارا لیکن اماں کھنکائے ہوتے اباجی کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ سارے گھر
میں کافور، گیندے اور گلاب کے پھولوں کی مہک تھی۔ سارا آنگن عورتوں سے بھرا پڑا تھا،
رہ رہ کر جب کوئی نئی عورت برقعہ اتارتی صحن میں داخل ہوتی تو ایک کہرام مچ جاتا۔

جنازہ اٹھنے سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے کی بات ہے کہ دروازے میں سے ایک عورت
داخل ہوئی۔ . . . نہ وہ لڑکی تھی نہ ہی اسے عورت کہا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کیفیتوں
کے درمیان الجھی ہوئی وہ دیوانہ وار اندر آئی . . . سارے صحن میں کوئی بھی اس کا واقف
نہ تھا . . . سوائے اباجی کے . . . اس نے سرخ شنیل کی شلوار پہن رکھی تھی،
چہرے پر چیچک کے ایسے مدھم داغ تھے جو اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا حسن پیدا کر
رہے تھے۔ سارا میک اپ آنسوؤں میں ڈھل چکا تھا۔ اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر
آہ بھر چکی . ہر سسکی میں اپنی جان کو گنڈا سے سے گنڈیریاں بنا بنا کر پھینک رہی ہے،
اس نے اپنا زرد برقعے کا نقاب الٹا اور آتے ہی چیخ کر بولی۔

"چلا گیا . . . چلا گیا . . . بے وفا؟"

ساری عورتوں میں سے صرف خالہ بی نے اٹھ کر رسماً اسے اپنے دائیں بائیں کندھے
سے لگایا۔ لیکن اسے ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟

اس نے جھک کر کانوز کے سلیٹی چہرے پر آنسوؤں کی وہ بارش کی کہ ابا جی کے پپوٹے، گالیں اور نتھنے بھیگ گئے ۔ . .

"ہمارا کون ہے ؟ . . . ہمارا کون ہے ؟ . . . ہمیں کس کے سپرد کئے جاتے ہو بابوجی ! . . . بابوجی ! ہمارا کون ہے ؟ . . ."

وہ جنگلے سے ماتھا رگڑتے ہوئے بولی۔

"تمہاری بیوی کے تو بچے ہیں . . . کہاں ہیں ہمارے بابوجی کے بچے ؟ . . . . . ارے کوئی مجھے ان کے بچے دکھلا دو . . . کوئی مجھے ان کے جگر گوشے تو ایک نظر دکھلا دو . . ."

رشیدہ، راشدہ، خالدہ اور زری کو خالہ نے اس کے قریب جانے کا اشارہ کیا . . .

تو اس نے خالدہ کا چہرہ اپنے کھردرے ہاتھوں میں لے کر اونچے اونچے کہا۔

"وہی آنکھیں ہیں . . . وہی . . . ارے بے درد اس کو کس کے حوالے کر کے چلا ؟ کون ان آنکھوں پر ترس کھائے گا . . . کون کون کون ؟ تو تو بڑی محبت کرنے والا تھا . . . پھر تجھے کسی کی دعا بھی نہ لگی . . . کسی کی دعا نہ لگی تجھے، . . . ہم نے تو ساری ساری رات تیرے لئے دعائیں مانگی تھیں . . . اتنی بے اثر تھیں ہماری دعائیں . . میں تو گناہ گار تھی - تیری سعیدہ کی دعائیں بھی نہ لگیں تجھے۔ کہاں ہے وہ سعیدہ جس کے گن گاتا تو تھکتا نہ تھا . . . کہاں ہے وہ جس کے لئے تو دن بھر سوچتا تھا . . . اسے بھی چھوڑ دیا ظالم . . . بے وفا ! "

ساری عورتیں سکتے کے عالم میں اسکا چہرہ تکے جا رہی تھیں اور وہ اونچے اونچے بین کر رہی تھی۔۔۔ چھاتی پیٹ رہی تھی۔ جنگلے سے سر مار رہی تھی۔ عورتوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی۔ سب اس کا حدود اربعہ پوچھ رہی تھیں۔

خالہ جمالی کہہ رہی تھیں۔

"تائب طوائف ہے۔۔۔ سنا ہے شہر سے باہر رہتی ہے۔"

پڑوسن بولی۔

"ہائے اللہ!۔۔۔ اس قدر بے شرمی! ٹھگیائی چاہے تائب ہو چاہے پیشہ کرائے رہتی بے شرم ہے۔"

"سندھن ہے۔۔۔ سنا ہے میاں نے چھوڑ دیا ہے۔ چھوٹا سا بچہ ہے۔ بازار میں حلوائی کی دوکان کے اوپر چوبارہ لے رکھا ہے۔"

"نہیں جی۔ کراچی سے آئی ہے۔ خاندان کا اتہ پتہ نہیں۔ آوارہ عورت ہے۔"

جب عورت پر آوارگی کے تابڑ توڑ الزامات لگ چکے تو باورچی کی باری آئی۔۔۔

سنا ہے اگر گوبر میں خمیری روٹیاں ڈالکر پورے چالیس دن کورے برتن میں رکھکر اوپر سے باندھ دو تو ٹھیک اکتالیسویں دن اس میں بچھو پیدا ہو جائیں گے۔۔۔ کورا برتن ٹوٹ چکا تھا اور سارے صحن میں بچھو ڈنک اٹھاتے پھر رہے تھے۔۔۔

لیکن وہ عورت اِن باتوں سے بے نیاز اپنی روح کی گنڈیریاں بنا بنا کر صحن میں پھینک رہی تھی۔۔۔ کبھی جنگلے پر جھک جاتی کبھی خلا کو چومنے لگتی۔۔۔ اس کے چہرے کا

ایک ایک پچھڑا کرب اور تشنج کی کیفیت ظاہر کر رہا تھا۔

"تیری ماں کہاں گئی؟ ... کیا وہ بھی مر گئی ...؟ مر گئی ہو گی ... ہم سی سخت جان تو نہیں ہو گی کہ بابوجی سامنے پڑے ہیں اور ہم زندہ ہیں۔ اس کی سانس کی ڈوری تو سعیدہ سے بندھی تھی ... کہو بابوجی! بندھی تھی ناں! ... کہاں ہے وہ ارے کوئی بتاوے تو کہاں ہے ان کی لاڈلی؟ کہاں ہے ان کی آنکھوں کا نور؟ ... بجھ گیا ہو گا ... آنکھیں نہ رہیں تو نور کہاں ہو گا ... کس کے حوالے کر گیا اُسے بے وفا ...؟ تو تو کہتا تھا ... میں سعیدہ سے قول ہار چکا ہوں ورنہ ... اب کیا کیا یاد دلاؤں تجھے؟ ... اس قول کا تجھے بڑا پاس تھا۔ کہاں گیا تیرا قول؟ ... کہاں گئی تیری سعیدہ؟"

گندم کے دانے ہولے ہولے گر رہے تھے ... آنسوؤں کی طرح بوجھل۔ پھر آماں جی اس آواز کو سن کر اٹھیں۔ لکڑی کی چوگاٹ کے ساتھ ان کے سوتے ہوئے پیر نے ٹھوکر جو کھائی تو انہوں نے دروازہ کا سہارا لیا۔ اور پھر باہر آگئیں۔

بابوجی جنگلے پر خاموش لیٹے تھے۔ وہ فریقین میں سے کسی کی جانب بھی نہ تھے۔ سرخ شنیل کی شلوار آگے بڑھی۔

سفید مرینہ کی چادر میں لپٹی ماسی سعیدہ نے بازو آگے بڑھائے۔ اور آماں اونچی آواز میں اسقدر دھاڑیں مار مار کر روئیں کہ چیچک کے داغوں والی سہم گئی ... اور جنگلے سے ہٹ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ماتم کی جگہ قرض مانگنے آگئی ہو۔

رشیدہ تصویر پر نظریں جمائے بیٹھی سوچ رہی تھی ۔ ۔ ۔ اس دن کے متعلق جب اباجی کی چارپائی گھر سے رخصت ہوئی تھی ۔ پھر وہ چیچک رُو نہ کبھی ان کے گھر آئی نہ ہی اس نے کبھی اُسے دیکھا ۔ ۔ ۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی اس روز کے بعد اماں نے اباجی کی بات کبھی نہ کی ۔ ۔ ۔ لوگ ان سے اباجی کی بات کرتے تو وہ خاموش آنسو بہائے جاتیں اور جب اکیلی ہوتیں اور ان کا گلا آنسوؤں سے بھر جاتا تو وہ مشین پر بیٹھ جاتیں اور ہولے ہولے پیڈل چلنے لگتے ۔ ۔ ۔ رشیدہ نے کئی بار اماں سے اباجی کا ذکر کرنا چاہا یا اس عورت کے متعلق پوچھنا چاہا ۔ جو اس قدر دیوانہ وار آئی اور بن صدا کے چلی گئی لیکن اماں نے کبھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا ۔

ایک رات جب اماں تہجد کی نماز پڑھکر آ رہی تھیں اور صحن میں بلا کا حبس تھا تو رشیدہ نے ہاتھ بڑھا کر اماں کا پلہ پکڑ لیا تھا ۔

"اماں پانی پلا دیجئے ذرا ۔ ۔ ۔"

جب اماں سور کے چمکتے کٹورے میں اس کے لئے پانی لائیں تو رشیدہ نے انہیں پاس بٹھا لیا تھا ۔ ۔ ۔

"اماں جی ! آپ ۔ ۔ ۔ آپ اباجی کی کوئی بات نہیں کرتیں ۔ ۔ ۔ آپ کو اچھے نہیں لگتے تھے اباجی ؟"

اماں کی آنکھوں میں چھلا چھل آنسو آ گئے لیکن وہ خاموش رہیں ۔ ۔ ۔

"پھر اماں ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ ہم سے اباجی کی باتیں کیوں نہیں کرتیں ۔ ۔ ۔"

"کیا کریں ان کی باتیں؟ . . . اللہ جو کچھ کرتا ہے سمجھ سوچ کر کرتا ہے ۔ اس میں بہتری ہوتی ہے انسان کی . ."

رشیدہ کا زخم بہت تازہ تھا ۔ ایسی باتوں سے اس کی تشفی نہ ہو سکتی تھی ۔

"کیا بہتری ہے اس میں کہ ابا جی . . . چلے گئے ہمارے بھلا ؟ ۔ کیا بہتری ہے اس میں . . ؟"

اماں نے خالی کٹورہ اٹھایا اور آہستہ سے بولیں ۔

"بھرم رہ گیا سب کا . . . یہ کچھ کم بہتری نہیں ہے ۔"

رشیدہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آگئی ۔ اس نے تصویر پر سے نظریں اٹھائیں اور چق کی جانب دیکھنے لگی . . معاً چق اٹھا کر ملک صاحب اندر داخل ہوئے ۔ وہ گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی . . .

"بیٹھئے ۔ بیٹھئے ۔ بیٹھئے . . . . مجھے اظہر نے بتایا تھا کہ کوئی مجھ سے ملنے گیا ہے گھر . . زیادہ دیر انتظار تو نہیں کرنا پڑا آپ کو . . . بیٹھئے ۔ تشریف رکھئے ۔"

"جی نہیں ۔"

"فرمائیے ۔ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں . . . اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو شاید . . . میں نے آپ کو چند دن ہوئے اظہر کی دوکان پر دیکھا تھا ۔"

ٹافیوں والا ڈبہ اب ان کے سامنے پیش کرنے کی ہمت اور بھی کم ہو گئی ۔

"فرمائیے . . بلا تکلف کہئے ۔"

وہ آنسو جو چند لمحے پہلے آنکھوں کے کونوں میں چھپے ہوتے تھے۔ گالوں پر رینگ آئے،
"ہیں ہیں۔ آپ تو رو رہی ہیں۔ ۔ کیا ہوا۔ ۔ ؟ کیا ہوا؟
اس نے ٹافیوں کا ڈبہ میز پر پٹک کر بڑی رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ۔ ۔
"یہ۔ ۔ ۔ یہ خط ہیں۔ ۔ ۔ خدا قسم میں نے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ ۔ ۔ اور ان ہی خطوں کی وجہ سے مجھے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ ۔ ۔ بے قصور۔ ۔ ۔ بلا وجہ۔ ۔ ۔"
لولی پاپ چوس لینے پر جیسے اکیلا ٹنڈ منڈ تنکا بیچ میں سے نکل آتا ہے۔ بالکل اسی طرح خالہ کے غصّے نے وہ ساری محبت چوس لی تھی جو ان خطوں نے قطرہ قطرہ ٹپکائی تھی۔ ۔ ۔
اور اب فقط اکیلے تنکے کی طرح آوارگی کا وہ الزام باقی رہ گیا تھا جو خالہ نے اس پر لگایا تھا۔
ملک صاحب کی کار میں جب وہ واپس ڈمپل کے گھر لوٹی تو اسے پورا یقین تھا کہ اب ظفر اس کی زندگی سے مکمّل طور پر نکل چکا ہے۔
ڈمپل کی دو منزلہ کوٹھی مین روڈ پر ذرا اندر کی طرف تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں ڈمپل کے ابّا اور اس کی تین چھوٹی بہنیں رہتی تھیں۔ اوپر کا حصّہ کرائے پر تھا۔ اور وہ سب اسی کرائے پر گذر بسر کرتے تھے۔ ۔ ۔

چھ کنال کی اس کوٹھی میں جب عرفان صاحب آئے تو اس کوٹھی کے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں۔ محلّہ والے کہتے تھے کہ رات کے وقت کمروں میں سے رام نام ست کی صدائیں اٹھتی ہیں۔ اوپر والے ٹاور نما کمرے میں کوئی رہ رہ کر سنکھ پھونکتا ہے۔ اور پچھواڑے ٹیوب ویل کے پاس چٹخ پٹخ آگ جلتی ہے۔ اور کسی کی ارتھی اس بھڑکی ہوئی آگ میں گھی کی

طرح جلتی ہے۔ عرفانی صاحب کو ان باتوں سے خوف تو لاحق ہوا لیکن کیا کرتے بیوی پورے دنوں سے تھیں اور سارے شہر میں کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ناچار تالا کھول کر گیلری ہی میں بیٹھ گئے وڈمبل اس وقت چھ سال کی تھی۔ سمیلا اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ اور مہ پارہ کی آمد تھی۔ اباجی کا کوئی کاروبار نہ تھا۔

امی کی چارپائی ڈرتے ڈرتے گیلری میں ڈال دی گئی۔ اور ساری رات آیتہ الکرسی پڑھتے نکلی۔ کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ کسی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانک بھی لیتا۔ لمبی گیلری میں زمستانی ہوائیں چلتی رہیں کیونکہ گیلری کے دونوں جانب دروازوں کے شیشے شکستہ رو تھے۔ امی دردِ زہ سے کراہ رہی تھیں۔ اور سردیوں کی ہوائیں اس کوٹھی کے دروازے کھڑکیوں پر انگلیاں بجا بجا کر کہہ رہی تھیں ... رام نام ست ہے ... رام نام ست ہے ... جب بھی بجلی کڑکتی یوں لگتا جیسے اوپر والی منزل سے کسی نے زور سے سنکھ پھونکا ہو ... کمروں میں دھوپ اور سامگری کی خوشبو اڑتی پھرتی تھی۔

اسی رات موم بتی کی روشنی میں مہ پارہ ان کے گھر آئی ... اور اباجی نے اس کا ناڑو پھل کترنے والے گجراتی چاقو سے کاٹ کر باندھا۔ آنول باہر کے نلکے کے پاس چھوٹا سا گڑھا کھود کر جلدی جلدی دبائی ... ان پر اس نئے ماحول کی کچھ ایسی وحشت طاری تھی کہ کفگیر سے اچھا سا گڑھا بھی نہ کھودا جا سکا ... اور صبح سویرے ایک کالا کتا اس آنول کو نکال کر ٹیوب ویل کے پاس لے جا کر بھنبھوڑنے لگا۔

سردیوں کا دن بڑے آرام سے کروٹیں بدل بدل کر طلوع ہوا تو گھر کی صورت نظر آنے

لگی۔ پہلے منی نے ایک کمرے کا دروازہ اندر دھکیلا، آہستہ آہستہ اندر جھانکا اور پھر دبے
پاؤں قالین پر چلنے لگی۔ یہ کوٹھی کسی تونگر کی تھی اور کمروں میں قالین، فرنیچر، قیمتی سازوسامان
بافراط تھا۔ ایک لوہے کی پیٹی میں سے ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کے روپے بھی نکلے۔ لمبی الماریوں
میں شنیل اور جارجیٹ کے تھان، اور بستروں کی پیٹی میں سے، مجنوں کھیس اور موتی چور کی
رضائیاں نئی جگ مگ جگ مگ کرتی نکلیں۔۔ ہر کمرے میں سیلنگ فین اور قد آدم آئینہ تھا۔
ڈرائینگ روم میں باقی سازوسامان کے علاوہ ایک بڑا سا پیانو بھی تھا جو عرفانی صاحب
کی منی کو سب سے زیادہ پسند آیا۔۔ اتنے سارے سازوسامان کے سامنے وہ لاش جو
غسل خانے کے ٹب میں پڑی تھی کچھ زیادہ ہیبت ناک نہ لگی۔ لاش کا حلیہ اتنا مسخ ہو چکا تھا
کہ آپا جی اندازہ نہ لگا سکے کہ اسے ٹب میں ڈالنے سے پہلے بازو اور ٹانگیں علیحدہ کی گئی
تھیں کہ اتنا عرصہ ٹب میں پڑے رہنے کے باعث آپی تن سے جدا ہو گئیں۔۔ اس متعفن
لاش کو آپا جی نے بالکل تن تنہا رات کے وقت اسی گھر کے پچھواڑے اور کسی سے ٹیوب
ویل کے پچھواڑے دفن کر دیا۔ سارے گھر میں وہ اذانیں دیتے پھرے۔ غسل خانے میں
اگربتیاں جلائی گئیں ۔۔۔ اور منی اور بجو کو حکم ہوا کہ وہ اکیلی کسی کمرے میں نہ جائیں۔۔۔

بٹالے میں آپا جی کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی جس پر سریا پتیل، بر بجیاں کو کے وغیرہ
بکتے تھے۔ اس دوکان کی دیکھ ریکھ کچھ ایسی تھی کہ بدنصیبی سے وہ ہی تجارت کے اصولوں
سے واقف نہ تھے۔۔ گذارہ تو ہوتا تھا لیکن پس انداز ایک دھیلا بھر کی رقم نہ ہوتی۔۔
پاکستان پہنچ کر یہ چھ کنال کی کوٹھی تو جیسے کھل سم سم کے مترادف تھی۔ غار کا منہ کھلا اور

دولت اور افراط کے انبار لگ گئے۔۔

شاید اگر ڈمپل کی ماں کو اس رات سردی نہ لگ جاتی تو وہ اتنے بہت کچھ میں سے تینوں لڑکیوں کے جہیز چھپا کر رکھ لیتیں۔ لیکن اُن کے پھیپھڑوں میں سے تو پھٹے بانس کی سی صدائیں آنے لگیں۔۔ مہ پارہ کے ساتھ پلنگ پر لیٹی سارا سامان تکا کرتیں۔ اس گھر میں داخل ہونے کے ایک ہفتہ بعد منی کو سکول میں ڈال دیا گیا۔ وہ تانگہ پر باقی لڑکیوں کے ساتھ جانے لگی۔ چھوٹا سا بستہ کندھے پر لٹکائے جب وہ اپنی سہیلی کے ساتھ گھر واپس آتی تو ابّا جی بہت خوش ہوتے۔ منی کے گالوں پر دونوں جانب ہر وقت گڑھے دیکھ کر پڑوسیوں نے اس کا نام ڈمپل رکھ دیا تھا۔

ساتھ والے مکان میں ایک عیسائی گھرانہ رہتا تھا۔ ان کی میم صاحب رنگدار ہاؤس کوٹ پہنے لان کو پانی کی نالی سے سینچا کرتی تھی۔۔ پاپا جو مال روڈ پر سازوں کی ایک دوکان کے مینجر تھے بوسیدہ سوٹ اور سر پر فلٹ ہیٹ پہنتے تھے۔ ان کا کھانا دیسی اور زبان بدیسی تھی۔ تین لڑکے تھے اور تینوں مکینک تھے۔ ابّا جی کے خاندان سے ان کی صاحب سلامت باڑھ کے پاس آ کر ایک دوسرے سے چند رسمی باتیں کرنے تک محدود تھی۔ ان ہی ملاقاتوں کے دوران پاپا نے ایک دن منی کو ڈمپل کہہ کر پکارا تھا۔ اور یہ نام ابّا جی کو اسقدر اچھا لگا تھا کہ شکیلہ جو اب تک منی تھی مستقل طور پر ڈمپل ہو گئی۔

یہ گھر آسیب زدہ تھا کہ نہیں۔ اتنی بات ضرور ہوئی کہ ابھی مہ پارہ چھ ماہ کی ہوئی تھی کہ امی کا انتقال ہو گیا۔ جس رات امی فوت ہوئیں اس روز دن کے وقت خونی آندھی

چلی ۔ کمروں میں مٹی گھس آئی ۔ روشندان کھڑکیوں پر گلابی مائل زرد مٹی ہوا ۔ کے دوش پر چڑھی آ آ کر ٹکرانے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ سارا دن آندھی چلتی رہی اور شام کو اندر باہر فرشوں پر مٹی یوں پھیل گئی جیسے سمندر کے کنارے موج در موج ریت پڑی ہو ۔ گرمیوں کی اس رات کو کہتے ہیں کہ ٹیوب ویل کے عقب میں پھر محلہ والوں نے آگ جلتی دیکھی ۔ ۔ ۔
پاپا نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر صبح آپاجی کو بتایا کہ رات ٹیوب ویل کے پاس آگ جلتی رہی اور کسی کی ارتھی گھی سے تر لکڑیوں میں چٹختی رہی ۔

امی کے مرنے کے بعد آپاجی کے ذمے دو کام آن پڑے ۔ برانڈرتھ روڈ پر جو چھوٹی سی دوکان انہوں نے لوہے کے سامان کی بنا رکھی تھی اس کی دیکھ بھال اور تینوں لڑکیوں کی دیکھ بھال ۔ ان ہی دنوں گھر کے تمام قالین بک گئے ۔ اور کوٹھی کے اوپر والا حصہ کرایہ پر چڑھ گیا ۔ ان دونوں کاموں میں سے ایک بھی بھلے طور پر انجام نہ پا سکا ۔ گھر کا سارا قیمتی، سامان بھی بک گیا ۔ اور لڑکیاں بھی اپنے اپنے زنگ کی نکل آئیں ۔

ڈمپل نے بڑے قیمتی سامان میں آنکھ کھولی تھی ۔ وہ ایک ایسے چھ کنال کے بنگلے میں پلی تھی جس میں ایک پاؤ گوشت دو وقت چلتا تھا ۔ لیکن جو پروفیسر اعجاز حسین اس کی گھریلو زندگی دیکھ لیتے تو کہتے کہ وہ "سپلٹ پرسنلٹی" ہے ۔ جہاں تک اس کے ایڈریس اور لباس کا تعلق تھا یہ دونوں بہت شاندار تھے ۔

لیکن گھر پہنچتے ہی وہ اپنے گلوز کے ساتھ کالج کی ڈمپل کو بھی اتار کر الماری میں رکھ دیتی جو منک اور ربل ایئر کی باتیں کرتی تھیں ۔ جو لاہور میں فیشن کا سمبل سمجھی جاتی تھی اور

جس سے لڑکے اس لئے بات نہیں کرتے تھے کہ اس کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو نہایت کمتر اور ذلیل سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ٹیپ ٹاپ کو چمک بخشنے میں وہ تعلیم بھی بہت کام آئی جو اس نے پورے پانچ سال کونونٹ میں حاصل کی تھی۔۔ اس کا انگریزی کا تلفظ بے داغ اور انگریزی بولنے کی استعداد بے پایاں تھی۔۔

ڈمپل گھر میں سیدھی سادھی شکیلہ تھی۔ چابیوں کا گچھا اٹھاتے چھوٹے چھوٹے نقصانات کا گہرا جائزہ لیتی ہوئی منی۔۔ اسے اپنے باپ کی مشکلات کا پورا احساس تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ برانڈرتھ روڈ کی دوکان سے اتنی آمدن کبھی نہیں ہو سکتی کہ تین بہنوں کے جہیز بن سکیں۔۔ اور سامنے کی لان میں شامیانے اور بجلیاں فٹ ہو سکیں اور دولہا لمبی سی کار میں آسکے۔۔ ان باتوں کے احساس نے اس کے اندر ایک عجیب قسم کی قلندری پیدا کر دی تھی۔۔ جو ہو سو ہو قسم کی بے پرواہی۔۔۔ وہ کالج والی ڈمپل بن کر بھی بے پرواہ رہتی اور گھر کی منی ہو کر بھی ایک طرح کی شانِ استغنا رکھتی۔۔۔ یہی اس کا سب سے بڑا حسن بھی تھا۔

ایک روز ارشاد ہوا :

کراچی میں ایک امیر کے مکان پر کوئی کیمیاگر آئے۔ وہ انہیں فقیر سمجھ کر اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ چھ مہینے خوب جی توڑ کر خدمت کی۔ دریں اثنا فقیر نے جانے کا قصد کیا۔ پہلے تو امیر رضامند نہ ہوا۔ بارے اجازت دی تو فقیر بولا۔۔ کہ ہم کو ایک اکسیر یاد ہے تو نے جیسی ہماری خدمت کی ہے۔ اس کا نعم البدل تو ہو نہیں سکتا لیکن

اگر چاہو تو وہ سکھا دوں ۔ امیر بولا . . اللہ کا دیا سب کچھ ہے ۔ مجھ کو چاہ نہیں ۔ پھر اس کیمیاگر نے کہا خیر تم کیمیا نہیں سیکھتے نہ سہی ۔ میرے ہاتھ کی پکی ہوئی ایک چیز چالیس دن کھاؤ ۔ امیر اس بات پر رضامند ہوا ۔ یہ انہیں چالیس دن تک حسب وعدہ کھلا کر رخصت ہوا . . . جاتے ہوئے کہنے لگا ۔ دیکھو ! ہم نے تمہیں اکسیر بنا دیا ہے ۔

اتفاقات زمانہ کے ہاتھوں امیر پر بُرے دن آئے ۔ یہاں تک محتاج ہوا کہ سب ساز و سامان بک گیا ۔ اصطبل میں گھوڑے نہ رہے ۔ تھانوں سے بندھی گائے بھینسیں فروخت ہو گئیں ۔ چپہ چپہ زمین رہن ہوئی ۔ حویلی ، محل دو منزلے سب اسی راہ گئے جدھر آرائش کا سامان گیا تھا ۔ استعمال کے چند برتن ، ایک دو جوڑے گاڑھے کے بوری میں بند کر کے شہر سے باہر جا کر رہنے لگا . . کہ اکابرین شہر کی طعن آمیز نظروں سے بچ رہے ۔

ایک روز اپنے حال پر کفِ افسوس ملتا درخت تلے بیٹھا تھا کہ دل میں خیال آیا اس فقیر نے کہا تھا کہ ہم تم کو اکسیر بنا چلے ہیں . . فوراً اپنا پسینہ ایک کانسی کی پتیلی پر مل دیا ۔ دیگچی کندن ہو گئی . . .

درشیدہ نے جو وقفہ ڈمپل کے گھر گذارا تو گویا اسے ڈمپل اکسیر بناتی رہی . . . اتنے تھوڑے عرصے میں اپنی مکمل جون بدل لینا نہ نورشیدہ کے اختیارات کی بات تھی نہ ڈمپل کے استعداد کی . . یہ تو سیدھی سادی کیمیاگری تھی اور اس کا نسخہ لاہور میں ڈمپل سے بہتر کسی کو نہ آتا تھا ۔

تیسرا دور

ڈمپل کے گھر آکر سب سے پہلے رشو جان نے امّاں کو خط لکھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں خالہ پیش بندی کے طور پر امّاں کو خط نہ لکھ دیں۔ خط پر جابجا آنسوؤں نے حروف مٹا دیئے تھے اور اِن ہی مِٹے ہوئے حروف پر رشو کو اعتماد تھا کہ وہ اس کی وکالت کریں گے... لکھا تھا...

پیاری امّاں جان!

السّلام علیکم۔

میں آج خالہ جان کا گھر چھوڑ کر اپنی ایک سہیلی شکیلہ کے پاس آگئی ہوں۔ وجہ اتنی تکلیف دہ ہے کہ میں خطوں میں اس کا ذکر نہیں کر سکتی۔ خالہ نے مجھ پر آوارگی کا الزام لگایا بلکہ میرے منہ پر چانٹا بھی مارا۔ مجھے مرحوم ابّاجی کی قسم! امّاں میں بے قصور

ہوں ۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ۔۔ میں جیسی آپ کے پاس سے آئی تھی ویسی ہی ہوں
میں نے یہاں کے ایک ہوسٹل میں کمرے کے لئے درخواست دے دی ہے جونہی منظور ہو
گئی میں نیو ماڈرن ہوسٹل لاہور میں چلی جاؤں گی ۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں ۔ میری دوست
بہت شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے ۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں ہیں ۔ ماں مر چکی ہے
ابا جی ان کے دمے کے مریض ہیں ۔ یہ لوگ بھی بیچارے ہماری طرح ہیں ۔ سوائے دولت
کے کسی چیز کی کمی نہیں ۔۔ میں یہاں صرف چند دن ٹھہرونگی اور بعد ازاں ہوسٹل میں چلی
جاؤں گی ۔۔ صرف پانچ ماہ کی تو بات ہے ۔ امتحان سر پر ہیں ۔ ایک لمحہ کی فرصت نہیں
ہوتی ۔۔ آپ میرے لئے دعا کریں ۔ کاش میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں !
نزری تو مجھے یاد ہی نہیں کرتی ۔۔ نہ خط کبھی لکھتی ہے ۔ نہ کبھی آپ کے خط میں سلام
لکھواتی ہے ۔ خالد اور راشدہ کیسے ہیں ۔ انہیں میرا پیار دیں ۔ کبھی کبھی تو دل اس قدر
اچاٹ ہو جاتا ہے کہ جی چاہتا ہے پر لگ جائیں اور میں بہاولپور جا پہنچوں ۔۔ اچھا اب
منزل کچھ ایسی دھندلی نہیں ۔ اللہ نے چاہا تو پھر ملیں گے ۔ جلد بہت جلد ۔ میرے حق میں
ضرور دعا کریں ۔

ہمیشہ آپ کی تابعدار

"درشو"

یہ خط پوسٹ کرنے کے لئے اس نے اپنے پرس میں ڈال لیا ۔۔ وہ ہمیشہ
کالج کے پھاٹک کے سامنے جو لال دھونو نصب تھا اس میں اپنے خط پوسٹ کیا کرتی تھی

دوسرے دن جب وہ ڈمپل کے ساتھ سائیکلوجی ڈپارٹمنٹ سے نکلی اور سڑک پار کرکے لال ڈبے تک پہنچی تو معاً ایک سیاہ کار پیچھے سے آکر رُکی۔ بریکوں کی آواز سے باقی ٹریفک میں بھی کھلبلی مچ گئی . . ایک رکشا گرتے گرتے بچا . . رشو اور ڈمپل کلا پنچ بھر کرمنٹ پاتھ پر ہو گئیں۔ مڑکر دیکھا یہ کار ملک صاحب کی تھی۔ اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے پائپ پی رہے تھے۔

ڈرائیور نے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا تو ملک صاحب نیچے اترے۔ بڑی شائستہ سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر تھی۔

"سلام علیکم"

لڑکیوں نے جھٹ سروں پر دوپٹے لے لئے۔

"آپ لوگ کہاں جا رہی ہیں۔ میں آپ کو پہنچا آؤں"

"جی نہیں، شکریہ"

ڈمپل نے رشو کے بازو میں ہلکی سی چٹکی لی۔

"ابھی تک آپ کے دل میں غصّہ ہے"

"جی نہیں! یہ بات تو نہیں ہے" رشو جلدی سے بولی۔

"پھر آیئے ناں! بیٹھیے . . ." عقبی دروازہ کھول کر ملک صاحب بولے۔

"جی ہم تو بازار جا رہی ہیں"

"عجب اتفاق ہے! میں بھی بازار جا رہا ہوں۔ کچھ کتابیں خریدنا ہیں مجھے۔ آپ

لوگ اپنی خرید و فروخت کیجئے گا اور میں کتابیں خرید لوں گا۔"

بڑی جائز سی بات تھی۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر اکڑوں بیٹھ گئیں۔

انار کلی میں وہاں جہاں ڈھائی ڈھائی آنے میں ہر مال والی ریڑھیاں اور آٹھ آٹھ آنے میں ہر مال والے ترپال پر اپنا پلاسٹک کا سامان، آئینے، چمچ، قینچیاں، شیونگ ریزر، چابیوں کے چھلے وغیرہ لگائے بیٹھے تھے۔ بالکل ان کے سامنے ملک صاحب باوردی ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کر دی۔ اور مودب طریق سے پچھلی سیٹ کا در کھولا۔

"یوں کار کا دروازہ جب باوردی ڈرائیور کھولتا ہے تو پیروں تلے آپی آپ راج ہنس آجاتے ہیں۔ انسان سڑک پر نہیں چلتا۔ کنول کے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تالاب میں بجرے پر سیر کرتا ہے۔

ملک صاحب رشو اور ڈمپل کے ساتھ اس طرح چلنے لگے جیسے ملکہ کا باڈی گارڈ چلتا ہے۔ انہیں لاہوری دروازے کے پاس کسی تکیے پر جانا تھا۔ لیکن راہ میں ساری انار کلی پڑتی تھی۔ ڈمپل نے جوتا خریدا تو ملک صاحب اپنا پن ٹھیک کرواتے رہے لیکن جب رشو نے نائلون کی ساڑھی خریدی تو ملک صاحب نے جلدی سے اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں سے ہوائی لفافے کے مشابہ وہ بٹوہ نکالا جو وہ فابرہ سے لائے تھے۔

"جی نہیں شکریہ! میں خود ادا کروں گی پیسے۔ میرے پاس ہیں جی۔"

"آپ مجھے کار میں پہنچ کر لوٹا دیجئے گا ... "

یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر کی طرف چلے گئے۔ اور ساڑھی کی قیمت جلدی سے ادا کر دی ..

جب ڈمپل اور رشّو بازار کے اندر داخل ہوئیں تو ملک صاحب ان سے رخصت ہو کر لاہوری دروازے کی جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن جب وہ دونوں اس اندھیری بند گلی سے باہر نکلیں جہاں ہر پوشیدہ شے کو عیاں طور پر ٹانگا گیا تھا تو ملک صاحب عین گلی کے باہر اس جگہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں پلاسٹک اور ربڑ کے ہوائی چپل بکتے ہیں۔

"میں نے سوچا واپسی پر آپ کو ساتھ ہی لے چلوں .."

"جی ... ابھی تو ہمیں بہت کچھ خریدنا ہے۔ ہم خود گھر چلی جائیں گی .." رشّو نے جلدی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں مجھے بھی کوئی کام نہیں، آپ کے ساتھ چلتا ہوں .."

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بشرطیکہ آپ مجھ بڈھے کی کمپنی برداشت کریں"

"نا ہے جی .. کیسی باتیں کرتے ہیں آپ .. ؟ ہم تو آپ کے لیے کہہ رہے تھے یعنی آپ کو دیر نہ ہو جائے کہیں .."

"تو پھر چلیں۔ مجھے تو ایسا کوئی کام نہیں ہے۔"

بازار میں بہت رش تھا۔ جگہ جگہ ملک صاحب کو راہ بنانا پڑتی۔ اور رشّو اور ڈمپل کو اس طرح گذرنا پڑتا تاکہ باقی لوگوں سے تو وہ مَس نہ کریں لیکن ملک صاحب کو چھو کر یا

ان سے رگڑ کریا ان کا سہارا لے کر آگے بڑھنا پڑتا۔ ایک بار جب پیچھے سے ایک کار آ گئی اور موڑ سے ایک رکشا نے گذرنا چاہا تو رشو مرتے مرتے بچی۔ اگر ملک صاحب جلدی سے اس کا ہاتھ گھسیٹ کر آگے نہ نکال لیتے تو رشو جانِ اس جہانِ فانی سے عین انارکلی میں رخصت ہو جاتی۔ ایسے میں ملک صاحب کے ہاتھ کی فولادی گرفت کو رشو نے بڑا محسوس کیا۔ لمحہ بھر کے لئے وہ ملک صاحب کی آغوش میں آ رہی۔ یہ واقعہ ملک صاحب کے لئے بڑا اہم تھا۔ اس نے ان پر ایسی برقی لہر دوڑا دی تھی جس کے اب وہ اپنے آپ کو اہل نہ سمجھتے تھے۔

جب رشو ان کی مہاگنی کی میز پر ظفر کے خط رکھ کر گئی تو ان کے دل میں میں اپنے بیٹے کے خلاف بڑا غصہ بھرا تھا۔ انہوں نے اسی رات کو جب ظفر سیکنڈ شو سے لوٹا تو اسے آواز دی۔ اس وقت خط الماری میں مقفّل تھے۔ ظفر نے دل میں سوچا کہ شاید وہ اس کتاب کے متعلق استفسار کرنا چاہتے تھے جو انہوں نے کچھ عرصہ پہلے اسے مستعار دی تھی۔۔ وہ سگرٹ پیتا اندر داخل ہوا۔

"سگریٹ بجھا دو۔۔۔"

آواز میں تنبیہہ تھی۔

ظفر نے زمین پر سگریٹ پھینک کر بوٹ سے مسَل دی۔

"بیٹھ جاؤ۔۔"

ظفر بیٹھ گیا۔۔

"مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"جی، پوچھیے۔"

"پہلے تمہیں اس بات کا یقین دلانا ہوگا کہ تم سچ بول رہے ہو۔"

ظفر نے پہلو بدل کر آہستہ سے کہا۔

"اب یہ کیونکر یقین دلایا جا سکتا ہے۔"

"میں تم سے Gentlemans words چاہتا ہوں۔"

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں آپ سے جھوٹ بولنا بے معنی سمجھتا ہوں۔ جب آپ نے آج تک سچ بولنے پر کوئی سزا نہیں دی تو میں جھوٹ کیونکر کہہ سکتا ہوں۔"

"لیکن اِس بار میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ سزا نہیں ملے گی۔"

ظفر نے لمحہ بھر کے لئے باپ پر نظر ڈالی۔ اس طرح ملک صاحب کا چہرہ اُس وقت تابناک ہوا تھا جب ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ان کو دل کا عارضہ ہے۔ اور خوراک کے معاملے میں انہیں بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ جنسی زندگی ختم ... خوراک کم اور سادہ ... آرام زیادہ ... چنانچہ ان کی زندگی کو ڈاکٹر صاحب کے ارشادات نے تیسری منزل پر منتقل کر دیا تھا۔

"اگر آپ مجھے سزا کا مستحق سمجھیں گے تو میرا سر تسلیم خم پائیں گے ..."

اسے معلوم نہ تھا کہ نوبت خطوں تک آسکتی ہے۔ پچھلے دنوں اس نے امّی سے لڑ جھگڑ کر سو روپیہ زائد لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ امّی ساری بات ابّا سے کہہ چکی

ہیں . . .

ملک صاحب نے نمبروں والا تالا کھولا ۔ اِس تالے کا نمبر صرف وہی جانتے تھے ۔ اور اِس الماری میں جائیداد کے انتقال نامے ، دفتر کی ضروری فائلیں ، اپنے پرانے دوستوں کے مخصوص خط اور ان کے قیمتی پن اور چاروں گھڑیاں بند تھیں . . .
انہوں نے درمیانی شیلف میں سے ٹافیوں کا ڈبہ نکالا ۔

" اسے پہچانتے ہو ؟ "

ظفر نے نفی میں سر ہلایا ۔

" تمہارا کیا خیال ہے اِس میں کیا ہے ؟ "

" ٹافیاں . . . "

ملک صاحب نے ڈھکنا کھول کر ڈبہ میز پر رکھ دیا ۔ اور ایک لفافہ نکال کر بولے ۔

" یہ لکھائی پہچانتے ہو ؟ "

ظفر لفافوں کو پہچانتا تھا ۔ ان ٹکٹوں کو پہچانتا تھا جو لفافوں پر لگی تھیں ۔ سارا تین منزلہ مکان اس کے پیروں تلے سے نکل گیا ۔

" پہچانتے ہو اِن خطوں کو . . . "

ٹھنڈے پسینے کی ایک باریک سی دھار اس کی ریڑھ کی ہڈی پر رینگنے لگی ۔

" جی ۔ "

"پھر؟"

"یہ خط میں نے لکھے ہیں۔۔"

"کیا ان خطوں کا جواب بھی ملا ہے تم کو؟"

"جی۔" آہستہ سے ظفر بولا

ملک صاحب کو رشتو پر طیش آگیا۔ وہ تو کہتی تھی کہ جواب نہیں دیا گیا خطوں کا۔۔

"لاؤ وہ خط میرے پاس۔۔۔ کتنے ہیں کُل۔۔"

"ایک ہے جی۔۔۔ کُل۔۔۔"

"اور کیا لکھا ہے اس اکلوتے خط میں؟"

"کہ میں اسے خط نہ لکھا کروں۔۔"

"جانتے ہو تمہارے خطوں کی اسے کیا سزا بھگتنا پڑی ہے۔"

"سزا؟۔۔۔ اسے سزا کیسی؟ اس کا کیا قصور ہے؟"

"اس کا قصور یہ ہے کہ بغیر قصور کے اسے خط آتے ہیں۔۔۔ اس بے قصوری کی پاداش میں اسے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔۔"

ظفر دل ہی دل میں یہ سوال دیر تک دہراتا رہا۔

"اب بتاؤ جس لڑکی کا کوئی قصور نہ ہو۔۔ جس نے تم سے راہ و رسم ہی نہ رکھی ہو، اس کی شرافت کا یہ اجر ہونا چاہیے۔"

"میری نیت نیک ہے آپا جی۔۔۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔"

"... آپ ... اگر ... اجازت دیں تو میں کل اس سے نکاح ..."

"جس نے تمہارے خطوں کا جواب نہیں دیا کیا وہ اتنی جلدی تم سے نکاح پر رضامند ہو جائے گی۔"

مشکل یہ تھی کہ شدتِ جذبات نے ظفر کو کبھی رشو کے مسائل، اس کا عندیہ، اس کا نکتہ نظر سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔

"میری تمنا ہے کہ اب تم اس بے قصور کو تنگ کرنا چھوڑ دو۔ اور اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ اگر امتحانوں کے بعد بھی تمہاری جنون خیزیاں بدستور رہیں تو ہم خود تمہارا نکاح وہاں کر دیں گے۔"

"ابا جی۔"

"تمہاری سزا یہی ہے کہ اب تم پھر اسے کبھی خط لکھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"جی ..."

"اب تم جا سکتے ہو ... اور وعدہ ایفا کرنا اپنا ..."

ظفر اپنے کمرے پہنچا تو سڑک والی کھڑکی سے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور سگریٹ سلگا لی۔ یہ انسان بھی کیا احمق چیز ہے! چاند پر کمند پھینکنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور اتنا معلوم نہیں کہ ساتھ والے کے دل میں کیا ہے؟ ٹیلیفون ایجاد کر کے الاسکا میں بیٹھا ہوائی جزیرے میں چھٹیاں منانے والی لڑکی سے بات کر لیتا ہے۔ اور یہ تک نہیں جانتا کہ ساتھ والی کرسی پر جو دستانے

پہنے مفلر لپیٹے بیٹھی ہے وہ کیا کہنا چاہتی ہے ؟'

ظفر کے سارے قیاسے غلط نکلے ؟ اس کے سارے اندازے بے بنیاد تھے ؟
چہرہ شناسی اور عندیے کی کھوج میں وہ سراسر فیل ہو گیا تھا۔

وہ جو رشو نے مجھ سے پن مانگ کر نوٹس لکھے تھے۔ پہلے پن دینے اور اس کے بعد لینے میں جو ان کی آنکھیں اور انگلیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتی تھیں تو کیا وہ ایک حادثہ تھا ؟

ہر مرتبہ ظفر اس کی کتاب میں جب اپنا خط رکھتا اور وہ چور نظروں سے اسے دیکھ کر مسکراتی ۔ اس لمحے جب ظفر کا دل بلّیوں اچھلنے لگتا اس کی کچھ بھی ذمہ داری رشو پر نہ تھی ۔ ۔ ۔ ؟

اردو مباحثے کے روز جب وہ ظفر کے عین سامنے والی قطار میں بیٹھی طیبہ اور گلنار کی باتیں کرتی تھی اور اس کا آدھا چہرہ ظفر کی جانب ہو جاتا تھا ۔ تب ان کنکھیوں کی باتیں کیا جھوٹ تھیں ؟

یہ ضرور ہے کہ رشو نے اس کے خطوں کا جواب نہیں دیا اور کہیں اس سے باتیں کرنے کو نہیں ٹھٹکی لیکن سوئمنگ گالا کے دن جب بیک سٹروک ریس میں ظفر تیرتا ہوا لڑکیوں کی سیٹوں کے پاس پہنچا تو رشو نے سوئی میں دھاگا پرونے والی ریس میں اسی کا ساتھی بننا قبول کیا تھا ۔ وہ چھوٹی چھوٹی ادائیں ۔ ان کہی محبت کی باتیں قلبی تعلق کا چھپا چھپا اظہار ۔ ۔ ۔ کیا اتنی ساری لگاوٹیں جھوٹ تھیں ؟ ۔ ۔ ۔ سب

عادتاً یا مروتاً اس سے حسنِ سلوک کیا جا رہا تھا۔

چاندنی سرنج کی طرح اس کے جسم میں پیوست ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں اُن آنسوؤں کی چبھن تھی جو اس کی پلکوں تک نہ آ سکے تھے۔ کھڑکی میں سارے خط اور ٹافیوں کا ڈبّہ پڑا تھا۔ محبت کا اظہار، سیپ کے موتی کے بجائے وہ لاش بنا ہوا تھا جسے بجّو قبر سے نکال کر چوراہے میں چھوڑ جائیں۔

کہتے ہیں کہ تین شہزادے کہ ایک ایک سے بڑھ کر گوہرِ نایاب تھا کہتے جنگل میں ہرِیال کا شکار کھیلتے تھے۔ پہر دوپہر شکار کھیلا، پھر سستانے کو کنارِ دریا پر آ بیٹھے۔ اور کمر سے ترکش کھول کر رکھ دیئے۔ وہیں آ نِیا ایک سوداگر بچہ پریشان حال اور دزدیدہ نگاہ ادھر آیا اور کہنے لگا "صاحبو! تم نے کہیں میرا اونٹ تو ادھر جاتے نہیں دیکھا"۔ پہلا شہزادہ کہ حسن و جوانی میں بے مثل تھا بولا "تیرا اونٹ کانا تھا کیا؟" سوداگر بچہ نے اس کا گریباں کھینچا اور بلبلایا کہ بتا میرا اونٹ تو نے کہاں چھپایا ہے؟ کیونکہ درحقیقت وہ کانا ہی تھا۔ دوسرے شہزادے نے کہ گفتارِ شیریں رکھتا تھا اور فصاحت کے زیوروں سے مجلّا تھا۔ ہولے سے پوچھا کہ قاعدہ شائستہ لوگوں کا ہے۔ بتا تو سہی تیرے اونٹ پر کہیں سرکہ تو نہیں لدا ہوا تھا۔ اب تو سوداگر بچہ کو پختہ یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہی اونٹ کو چرانے والا ہے۔ اب کڑک کر بولا کہ نابکار بتا میرا اونٹ کہاں ہے۔ شیریں گفتار نے کہا یہ تو خیر میں نہیں جانتا۔ سوداگر بچہ کہ نہایت اکھڑ باز اور رستہ گیر تھا اب

دوسرے شہزادے کے درپے ہوا تو تیسرے شہزادے نے کہ فہم و فراست میں یگانہ وقت تھا آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور پوچھا کہ بول تو سہی تیرے اونٹ کے دم تھی کہ نہیں۔ میرا تو خیال ہے نہیں تھی۔ اب تو بیوپاری نے ماتھا پیٹ لیا اور کہنے لگا کہ "بہتر ہے کہ تم اونٹ کو مع اسباب لوٹا دو ورنہ میں تمہیں قاضی کے پاس لے چلوں گا۔"۔ شہزادے بولے بسم اللہ ہم تو خود قاضی کے پاس جاتے ہیں۔۔ جب یہ چاروں قاضی کے پاس پہنچے تو سارا ماجرا سوداگر بچے نے اس کے روبرو بیان کیا۔ تینوں شہزادوں نے دعویٰ کیا کہ اس کا شک بے بنیاد ہے اور ہم نے اونٹ کو دیکھا تک نہیں۔۔ قاضی نے پوچھا تو پھر تم کو اس اونٹ کے متعلق اتنی معلومات کیسے حاصل ہو گئیں؟۔۔ بڑے شہزادے نے کہ صاحب حسن تھا جواب دیا کہ اے قاضی مجھے اس امر سے دریافت ہوا کہ اونٹ کانا ہے کہ راستے میں تمام درختوں کے پتے ایک طرف سے چرے تھے۔ جو اونٹ کے دونوں دیدے سلامت ہوتے تو دوسری طرف سے بھی پتے کھاتا۔۔۔۔

دوسرا شہزادہ کہ جس کے منہ سے دم گفتار پھول جھڑتے تھے گویا ہوا۔ اے قاضی قاعدہ ہے کہ جس جگہ زمین پر سر کہ گرتا ہے۔ وہاں کی زمین اُبل اٹھتی ہے۔ میں نے جا بجا اس حقیقت کا معائنہ کیا اور اسی لئے جانا کہ اونٹ پر سرکہ لدا تھا۔ تیسرا شہزادہ کہ فہم و فراست میں یکتائے زمانہ تھا کہنے لگا اے قاضی راہ میں جا بجا اونٹ کے بیٹھنے کی علامتیں موجود تھیں۔۔ وہ نشان کہ اونٹ کی دم سے

زمین پر پڑتا ہے کہیں بھی نہ دیکھا - اس نے اندازہ لگایا کہ اونٹ کی دم کٹی ہوئی تھی . . . . سوداگر یہ سن کر اونٹ کی تلاش میں سرگرداں ہوا - اور قاضی شہر ان ذی فہموں کو لے کر گھر چلا کہ جانتا تھا ایسے ذکی لوگ عام انسان نہیں ہوتے ظفر کے قیافے تمام درست تھے اور پھر بھی وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ اونٹ مع مال و اسباب قیمتی کہاں گیا؟ . . . . . سی فکر میں غلطاں وہ صبح تک بیٹھا رہا - اردگرد سگرٹوں کے جلے ، ادھ جلے ادھر بیدردی سے بجھائے گئے سگریٹ پڑے تھے . . . بہت سالوں کے بعد اس نے پہلی بار صبح کاذب کو دیکھا - پہلے شہر کا آسمان کاسنی ہوا ، پھر خاکستری اور بعد میں انڈے کی سفیدی کی مانند دودھیا سفید ہو گیا - اس کے منہ کا مزہ اس طرح تھا جیسے روزوں میں سحری کھا کر بہت دیر سونے کے بعد جاگا ہو . . شہر خاموش تھا اور موذن کی آواز اندھیرے اجالے کو چیرتی آ رہی تھی - اس نے ٹھنڈی سل پر سر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا . . .

"اے رب العالمین ! یہ تیری نگری میں کیا دستور ہے کہ قیافے غلط نکلتے ہیں . . . ایسا کیوں نہیں کہ تو ہی انصاف کر دیا کرے ؟ تو راہ کیوں نہیں سجھا دیتا ؟ . تو آزمائشوں میں کیوں ڈالتا ہے ؟ تو سیدھی راہ کیوں نہیں دکھا دیتا ؟ تیری اس نگری میں انصاف کیوں نہیں ہے ؟ . . . "

یکبارگی دم وہ سارے آنسو جو رات بھر اس کے لاشعور میں اکٹھے ہو رہے تھے سل کی ٹھنڈی لاش پر پڑنے لگے . . . آہستہ آہستہ تواتر کے ساتھ پہلے وہ

رشتو پر خفا ہو کر روتا رہا۔ پھر اسے ابا جی کے رویئے پر رونا آنے لگا . . . رفتہ رفتہ وہ اللہ کے خلاف ہو گیا۔ ساری نگری میں ہی اندھیر مچا ہے۔ اللہ اگر ایسا ہی انصاف پسند ایسا ہی حق شناس ہوتا تو ایک کو حبشی اور ایک کو سفید فام کیوں بناتا؟ ایک کی ذہانت ایسی کہ لوگ جینیئس سمجھنے پر مجبور ہوں اور ایک کا دماغ اس قدر خالی کہ گجرات میں مزار پر شاہ دولے کا چوہا بنا بیٹھا ہے . . . . آہستہ آہستہ اسے انسان کی مجبوری پر رونا آنے لگا . . . اللہ میاں نے اپنی تفنن طبع کے لئے یہ کھلونا بنایا اور پھر اسے نیک و بد کی تمیز میں محبوس کر کے اپنے انصاف کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب کچھ دیر اپنی اور کل مخلوق اللہ پر آنسو بہاتے ہو گئی تو آنسو رک رک کر آنے لگے . . . اب آنسو ایک بے کیف سے دکھ کا نتیجہ تھے . . . اس دکھ کا کوئی نام نہ تھا۔ جیسے کرسی میز، ٹلیہ، ٹرانزسٹر سب دکھ کے سمبل تھے . . . باہر سڑکوں پر پھیلی ہوئی دھند آہوں کے مرغولے تھے . . . اونچی اونچی عمارتیں منجمد آنسو تھے . . . ساری فضا میں دکھ ہی دکھ پھیلا تھا . . . اپنے بازو سے جب اس نے سر اٹھایا تو کھڑکی سے دھوپ کا پورا تختہ پلنگ پر اتر رہا تھا . . .

ظفر کو یہ دھوپ دیکھ کر نہ جانے غازی کیوں یاد آ گیا۔ آنکھوں کو بازو سے پونچھتا وہ نیچے کی طرف چل دیا۔

ہفتہ بھر ایرک کا سارا سال پڑھائی کے معاملے میں غیر خاطر خواہ رہا تھا۔ پہلے پروفیسر ضیا چلے گئے۔ پھر پروفیسر انجم پورے تین ماہ بیماری کی چھٹی پر رہے۔ پروفیسر اعجاز

حسین جو سائیکلوجی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ بھی تھے... ان کے لیکچر طالب علموں کے لئے ایسے نہ تھے کہ وہ ان کی پرستش کرنے لگتے... ساری کلاس میں اگر کوئی ان کا مدّاح تھا تو وہ بے چاری رشیدہ تھی... اور اس کی وجہ بھی محض یہ تھی کہ اس نے سب سے پہلے جس کے سامنے سپس نوایا وہ پروفیسر اعجاز حسین ہی تھے...

سکستھ ایئر میں پہنچتے ہی ساری کلاس میں گڑ کے قوام جیسے بلبلے پیدا ہونے لگے... لڑکوں کی ٹکڑی جہاں اکٹھی ہوتی، پروفیسروں کے خلاف شکایات کا طومار کھل جاتا... لیڈیز روم میں پروفیسروں کی شکایات کے علاوہ اور بہت سے گلے شکوے موجود تھے۔ طالبات آپس میں پھٹ چکی تھیں... کہاں تو دوپٹہ بدل بہنوں کی طرح ہر وقت گل بتیاں ڈالے منقاریں ملاتے پھرتی تھیں۔ کہاں اب یہ عالم تھا کہ ایک کی بات پر دوسری کے ابرو کتھک ناچنے والیوں کی طرح اوپر ہی اوپر کو چڑھتے، ہر لحظہ، ہر لمحہ دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھاتے جاتیں۔ طیبہ اور گلنار میں پہلے رقابت کارشتہ تھا۔ اور یہ دونوں فرسٹ آنے کی کوشش میں عینکیں لگوا بیٹھی تھیں۔ لیکن اب نہ جانے کیا وجہ تھی کہ دونوں بہت قریب قریب کرسیاں جوڑ کر غٹرغوں غٹرغوں کرتی رہتیں۔ الگ تھلگ بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے وہ کچھ جنسی قسم کی گفتگو پر آمادہ ہو جاتیں۔ طیبہ گلنار کو اپنے گھر کے رومانس اور گلنار طیبہ کو اپنے علم کے زور پر بہت سی من گھڑت کہانیاں سناتی... اس گفتگو میں جابجا قہقہوں کی پھلجھڑیاں لگائی جاتیں اور جولیس سیزر کے قتل کی سازش کی طرح اس

دوستی کو سب کے سامنے اور سب سے چھپا کر بڑھایا جاتا۔ زاہدہ مکمل طور پر خارپشت بن چکی تھی۔ جو پاس آتا اسے اپنے ریڈ انڈین جیسے تیکھے تیروں سے چھید دیتی۔

سوئر جیسی نرم شخصیت کی زاہدہ دنوں میں یوں خارپشت بن گئی۔ اس کی اصلی وجہ وہ مکمل دھچکے تھے۔ جو بیک وقت اس کو لگے۔ اگر صرف ایک رُخا زلزلہ آتا تو وہ دھڑام سے گرتی اور پھر نہ اٹھتی۔ لیکن ہوا یہ کہ چند ثانیے دھرتی دائیں سے بائیں کو ڈولی اور اس کے بعد کچھ لمحے زمین نے بائیں سے دائیں کو جھکور لیا۔ اس زلزلے سے جانی اور مالی نقصان تو نہ ہوا زاہدہ جھول جھال کر اپنی جگہ قائم ساکت ہو گئی۔ لیکن دل پر اس دورخے زلزلے کی ہیبت ایسی طاری تھی کہ ساری شخصیت میں راتوں رات خارپشت کے سے کانٹے نکل آئے۔ جو بھی قریب آتا ادتی ماں۔ ہائے اللہ کہہ کر لوٹتا۔

سکستھ ایئر میں داخل ہوتے ابھی پورے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک رات اچانک زاہدہ کے اباجی فوت ہو گئے۔ سان نہ گمان یونہی اس جہان سے گذر گئے جیسے گیسی غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ زاہدہ کے اباجی شہر کے ایک مشہور دندان ساز تھے اور ان کی دوکان سبزی منڈی کے عین سامنے جہاں سبزیوں سے لدے ٹرک آکر بریکیں لگا کر اور کلچ دبا دبا کر محرابی دروازے سے گذرتے ہیں۔ عین اس جگہ سڑک کے بائیں طرف تھی۔ انستھیسیا لگائے بغیر پچھلی ڈاڑھوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں وہ بے مثل تھے۔ ان کے بنائے ہوئے نقلی دانتوں کا سیٹ جس کے منہ میں ہوتا ہے اس کے منہ سے ایسی آوازیں آتیں جیسے گھسے ہوئے دانتوں والی بکری خالی منہ جگالی کر

رہی ہو۔ وہ دندان سازی سائنٹفک طریقے پر کم اور بانہہ بل پر زیادہ کرتے تھے لیکن سنا ہے کہ محنت کرنے والے کو اللہ میاں ہمیشہ اپنی جناب سے اجر دیتا ہے۔ دانتوں کے اس ڈاکٹر کی آمدنی بقدر ہمت اوست تھی۔ خود ڈاکٹر صاحب گیسز کا شکار تھے۔ کہتے ہیں کہ سبزیوں میں کچھ ایسا عنصر ہوتا ہے کہ معدے میں خود بخود تخمیر پیدا ہوتی رہتی ہے گو ڈاکٹر صاحب بکرے کی سالم ران کھانے والی آسامی تھے۔ اور ان کے گھر میں سری پائے، کلیجی، اوجھڑی مغز کی باتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ لیکن ہمسائگی کا بڑا اثر ہوتا ہے... سبزی منڈی میں رہ کر گیسز کا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔

عجیب سی بات ہے کہ زنبور سے اوزار لئے جو شخص سارا دن جبڑوں پر کھڑا رہے اسے گیس کی شکایت ہو۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جب ان پر اس بیماری کا دورہ پڑتا تو چھ فٹ لمبے لحیم شحیم ڈاکٹر کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے۔ ماتھے پر موتی چور جیسے پسینے کے قطرے آجاتے۔ اور وہ گھر والی کو پاس بلا کر نصیحتیں وصیتیں کرنے لگتے۔ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں سوڈا بائیکارب کا خرچ اس قدر تھا کہ انہیں بوری پر بوری دو بوری اپنے استعمال کے لئے امپورٹ کرنا پڑتا۔ پھر بھی دورے تھے کہ اب زیادہ اور شدید ہونے لگے۔ جس وقت ان کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی تو ان کے منہ سے ولایتی گائے کی سی آوازیں نکلتیں۔ وہ بار بار گھر والوں سے کہتے۔

"ارے برف والے سوئے سے کوئی میرے پیٹ میں سوراخ کر دو۔ ارے کوئی درد والا ہے تو میرے پیٹ میں سوراخ کر دو۔"

لیکن ہوا ان کے پیٹ سے کسی طور خارج نہ ہوتی۔ بہت سونٹھ کے حلوے، ادرک کے مربّے، اجوائن کے چورن، معجون مرکب، پودینے کے ست کھائے۔ لیکن ہوا پیٹ میں اس وقت تک جمی رہتی جب تک اس کا جی چاہتا۔ اس مرض سے تنگ آ کر وہ صبح سویرے منہ اندھیرے منہ میں مسواک لئے سیر کو بھی جانے لگے تھے۔ رات کو بھی چٹکی دو چٹکی ترپھلا کھا کر سوتے۔ لیکن ہوا کی اپنی مرضی تھی۔ جب چاہتی بھر جاتی جب چاہتی فٹ بال پنکچر ہو جاتا۔

لیکن اس روز تو سان نہ گمان، زاہدہ کے ابا جی کو کسی قسم کی شکایت بھی نہ تھی۔ مزے سے پھوا مچھلی کے تلے ہوئے قتلے اور دو چٹکی ترپھلا کھا کر سر پر ٹوپی پہنی، غسل خانے خود گئے۔ واپسی پر کہنے لگے پتہ نہیں اب پاؤں کیوں سو جاتے ہیں، غسلخانے میں زاہدہ کی امّی عشا کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ سلام پھیر کر بولیں "بڑھاپے کی آمد ہے۔" یہ کہا اور پھر نماز کی نیّت باندھ لی۔

یہ ان دونوں کی آخری اختلاط بھری بات تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب منہ رضائی میں دے کر سو رہے۔ زاہدہ کی امّی نے پائے دھوئے پھر ان میں مسالہ ڈالا اور بھوبل پر دیگچہ رکھ کر سو گئیں۔ . . . صبح اٹھیں۔ تو پائے کھانے والا جا چکا تھا۔

اس حادثے کے تیسرے دن ایک اور کربناک بات ہوئی۔ زاہدہ دل ہی دل میں افتخار سے محبّت کرتی تھی۔ اور افتخار دل ہی دل میں باہر کسی ملک میں جانے کے خواب دیکھتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ زاہدہ نے دل کی بات نہ کسی سے کہی

اور نہ اپنی تمنّا کو کسی قسم کا عملی جامہ پہنایا۔ افتخار کے ابّا یونیسکو والوں کے اچھی طرح واقف تھے۔ اور افتخار کی تمناؤں کی عزّت کرتے تھے۔ فقط ایڑیاں کوشش جاری ہوئی اور بکسٹھ ایڑیاں ان لوگوں کو ابھی تین ماہ گذرے تھے کہ افتخار پیرس چلا گیا۔

آخری دن جب وہ کالج میں سب سے ملنے آیا تو زاہدہ چھٹی پر تھی۔ اور گھر میں سفید چادر پر بیٹھی ناک پونچھتی ہوئی کھجور کی گٹھلیوں پر کلمہ پڑھ رہی تھی۔ اسے اپنے والد کے سوئم پر اپنی کلاس کی لڑکیوں نے بتایا کہ افتخار پیرس جا چکا ہے۔

سمور جیسی نرم شخصیت میں یکدم خار پشت جیسے نکیلے کانٹے نکل آئے۔ اب وہ جہاں بیٹھتی چھوٹے سے رومال سے آنکھیں پونچھتی رہتی۔ پہلے پہلے تو لڑکیوں نے اس پر بہت ترس کیا۔ ہر طرح ساتھ ملائے رکھنے کی باتیں کی۔ لیکن ہر ایک اوئی اللہ ہائے میرے خدا کہہ کر لوٹی۔ زاہدہ بڑی کم گو اور چپ چپاں قسم کی لڑکی تھی۔ لیکن اب زاہدہ کے منہ میں دو موہنے سانپ کی زبان تھی۔ خبر بھی نہ ہوتی اور ڈس لیتی۔ اب بیچاری الگ تھلگ بیٹھی رہتی اور کسی لڑکی کو پاس پھٹکنے کی ہمت بھی نہ پڑتی۔

ڈمپل اور رشّو کا تعلق خاطر ان سب سے مختلف تھا۔ کچھ تو رشّو ڈمپل کی نفاستِ طبع اور لباس کی عمدگی سے مرعوب تھی۔ کچھ احسانمندی اور تشکّر کا عنصر تھا جو رشّو ان کے گھر رہ کر محسوس کرتی تھی۔ جب تک ماڈرن ہوسٹل میں جگہ نہ ملتی اسے ان کے گھر نظریں جھکا کر جی ہاں جی ہاں کرتے گذارنا تھی۔

کچھ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے رشّو کو بیک وقت حیران، متزلزل، اور

مرعوب کر رکھا تھا۔

ڈمپل میں ایک شانِ قلندری تھی۔ اس کا ہر فیصلہ ایک عنی کا فیصلہ تھا۔ کالج کے لڑکے اس کی بے داغ انگریزی اور اعلیٰ لباس سے ڈرتے تھے۔ برانڈرتھ روڈ والا باپ اپنی بیٹی سے اس لئے خوفزدہ تھا کہ اس لڑکی سے سارے گھر میں اجالا تھا۔ اس لڑکی سے سارے مستقبل کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اس لڑکی کا خوبصورت لباس دیکھ کر کبھی کبھی آپا کو خیال آتا کہ اتنی ساری قیمتی ساڑھیاں، ۱۰ ایسے خوبصورت کوٹ، یہ فینسی جوتے میری آمدنی سے تو نہیں بن سکتے۔ لیکن آپا میں آنکھیں موند لینے کی وہ خوبی تھی۔ جو کبوتر میں بلی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

کوٹھی کے اوپر والے حصّے میں کرایہ دار رہتے تھے۔ اور انہی کے کرائے پر مالکِ مکان کی بیشتر گذر بسر ہوتی تھی۔ ابھی رشّو کو اس گھر میں آئے آٹھ دس دن ہوئے تھے کہ ڈمپل نے ایک دن رشّو سے کہا۔

"میرے ساتھ اوپر چلتی ہو؟"

"اوپر؟"

"اوپر تو ایسے پوچھتی ہو جیسے میں ٹرائیڈنٹ کے سفر کے لئے کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن اوپر کیا کام ہے تجھے؟"

"کوئی کام نہیں صرف میل ملاقات۔ ۔ ۔ سوشل لائف۔ ۔"

"نہیں بھئی تم جاؤ۔ ۔"

"بابا بے ضرر سے میاں بیوی ہیں۔ بیوی دمے کی مریض ہے۔ کھانستی رہتی ہے۔ کبھی ہومیو پیتھک علاج کرتی ہے۔ کبھی کورٹیزون کھاتی ہے۔ چلو تو سہی۔۔۔"

"کیا ایسا ہی ضروری ہے؟"

"مردم بیزار نہیں ہونا چاہیے۔ آدمی گریگیریس جانور ہے۔ آؤ چلیں۔"

گورشو نہیں جانتی تھی کہ اوپر والے کیسے ہیں۔ اور کیوں اس کا دل دھڑک رہا ہے؟ لیکن کوئی چیز اسے بتا رہی تھی کہ معاملہ اتنا صاف نہیں جتنا نظر آرہا ہے۔

کرایہ دار کی بیوی واقعی دمے کی مریض تھی۔

جب وہ اوپر پہنچیں تو وہ پیٹی کا ڈریسنگ گاؤن پہنے اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ بار بار وہ تپائی سے ایک شیشی اٹھاتی۔ سینٹ چھڑکنے والی شیشی کی طرح اس میں ربڑ کا ایک گیند سا لگا تھا۔ ناک میں نلکی ڈال کر جب وہ مریضہ اس گیند کو دباتی تو دوائی پھوار بن کر ان کی ناک میں داخل ہو جاتی۔ اور کچھ دیر کے لئے ان کا سانس ہموار ہو جاتا۔۔۔

ڈمپل کو دیکھ کر کرایہ دارنی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور اس کے ہونٹ خوشامد بھری مسکراہٹ میں پھیل گئے۔

"آیئے آیئے! اتنے دن بعد تشریف لائی ہیں آپ؟۔۔۔"

ڈمپل اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ کر بولی۔۔۔

"یہ ہیں مسز سید۔ اور یہ ہیں میری سہیلی رشیدہ میر۔۔۔ ہوسٹل میں سیٹ نہیں ملی

انہیں۔ کچھ عرصہ قیام کریں گی میرے پاس ۔"

مسز سیّد نے ستے ہوئے چہرے پر گل و گلزار کی قسم کی کیفیت پیدا کر کے کہا۔

"کتنی اچھی بات ہے اور رونق ہو جائے گی یہاں ۔"

"کہیئے" اب طبیعت کیسی ہے آپ کی ۔"

"ابھی آدھ گھنٹہ ہوا اٹیک شروع ہوا ہے۔ ورنہ پچھلے ہفتے تو اللہ کی بہت مہربانی رہی مجھ پر ۔"

"ان کا ایک تو پٹرول پمپ ہے مال پر ... دوسرے ان کے میاں ملازم ہیں کسی آئل کمپنی میں ... ذرا نام بتا دیجئے اس آئل کمپنی کا ... "

بیوی نے جلدی سے نام بتا دیا۔

گو ڈمپل کو اس کمپنی کے اتنے کیلنڈر ڈائریاں مل چکی تھیں کہ اس کا نام بھول جانے کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن یہ ان دونوں کا ایک کھیل تھا۔ تجاہلِ عارفانہ کا کھیل... مسز سیّد بظاہر یہ ظاہر کرتی تھی کہ ڈمپل اس کی دوست ہے۔ اور ڈمپل اپنے رویّے سے یہ ثابت کرتی تھی کہ آئل کمپنی سے لے کر مسٹر سید تک اسے کسی چیز کا نام یاد نہیں رہتا۔

چائے پینے کے بعد جب وہ دونوں اٹھنے لگیں تو مسز سیّد نے اپنی قدِ آدم الماری کھولی اور اس میں سے ایک ایسا ڈبہ نکالا جس پر سنہری کاغذ چڑھا ہوتا ہے ...

"ایک چیز ہے تمہارے لئے ڈمپل ..."

"تو پلیز ..." ڈمپل نازک سا ہاتھ سینے پر رکھ کر بولی۔

"بس ہے ... دیکھو تو پھڑک جاؤ گی ..."

جس وقت مسز سید گدّی کا غذ اٹھا کر ڈمپل کو پان سات سو کی ریشمی ساڑھی دکھا رہی تھیں اس وقت مشو صاحب کمرے میں آ گئے۔ رشتو کو یوں وہم سا ہوا جیسے یہ آدمی ساتھ والے کمرے میں پہلے سے موجود تھا۔

"ہیلو ... ڈمپل صاحبہ ... ہاؤ آر یو ...؟ ..."

"فائن ... آپ سنائیے سید صاحب؟ ..."

راجپوتی طرز کی تراشی ہوئی باریک مونچھیں۔ ان کے نیچے گول سا بھرا بھرا دہن۔ کان ذرا باہر کو نکلے ہوئے۔ کدو کی طرح لمبا سر اور فراخ ماتھا۔ سید صاحب کا رنگ کچّا کالا تھا۔ جو کہیں کہیں سے ڈھل کر صندلی اور کہیں کہیں سے گہرا سانولا لگتا تھا۔ ان کے رنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے زعم میں گندمی رنگ کے آدمی تھے۔ اور دوسروں کی نظروں میں بالکل سیاہ۔ گرمیوں میں ان کا رنگ اور ہوتا اور سردیوں میں اور۔ برسات میں بھادوں بد رنگ ہو جاتے۔ اور بہار میں ان کی کینچلی بدل جاتی۔ روپے پیسے کی ان کے ہاں کمی نہ تھی۔ پٹرول پمپ۔ آئل کمپنی کی نوکری کے ساتھ ساتھ ان کے کچھ نہری مربعے بھی ٹھیکہ پر چڑھے ہوئے تھے۔ اتنی ساری مثبت رقموں کے باوجود ان کا ٹوٹل بہت بڑے صفر میں نکلتا تھا۔

لب کاٹتے ہوئے مسز سیّد بولیں۔

"یہ رنگ تو نہیں سجے گا ڈمپل ... دیکھو تو ..."

"خدا قسم ہیں اتنے ایکسپنسو تحفے نہیں لے سکتی آپ سے۔"

میاں بیوی نے لمحہ بھر کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میاں نے اور اصرار کرنے کو کہا۔ تو مسز سیّد بولیں۔

"آپ ہمیں شرمندہ کرتی ہیں۔ رہنے نا۔"

"خدا قسم میں شرمندہ ہوتی ہوں .... ایسے تحفے لے کر۔"

مسز سیّد نے پھر لب کاٹا اور آہستہ سے بولیں۔

"آپ جانتی ہیں میرے لئے تو بیکار ہے یہ۔۔ آپ قبول نہ کریں گی تو مجھے جمعدارنی کو دینا پڑے گی۔"

"ہائے پلیز ... نو ..."

ڈمپل نے جلدی سے ڈبہ پکڑ لیا

"ایسا ظلم تو نہ کیجئے گا۔"

"آپ مانتی جو نہیں ہیں ..."

جتنی دیر تحفے کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ مسٹر سیّد بڑی خاموشی سے چوہے کی مانند بسکٹ کترتے رہے۔ جب یہ موضوع سرد پڑنے لگا تو مسٹر سیّد نے کالج کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ وہ کالج کے ہر پروفیسر اور قریباً تمام لڑکوں سے بخوبی

واقف تھے۔ سائیکلوجی کی خاص خاص ٹرمینالوجی سے بھی اچھّی طرح واقف تھے
جتنی دیر یہ علمی باتیں ہوتی رہیں رشو نے دیکھا کہ ڈمپل اور سیّد صاحب دونوں آرام
کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سامنے پلنگ پر مسز سیّد گینڈ پچکا پچکا کر ناک میں دوائی
کی پھوار ڈال رہی تھیں۔ اور میز تلے براؤن بوٹ پر ڈمپل کی نوکدار سفید جوتی ٹکی تھی۔
مسز سیّد کی آنکھوں میں اچانک سفیدی کا حصّہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اور وہ فیڈ
آوٹ ہوتے منظر کی طرح معدوم ہوئی جا رہی تھیں۔

"اچھّا اب اجازت دیجیے آپا۔۔"

"ارے۔۔۔ ابھی سے۔" مسز سیّد پھر ان فوکس ہو گئیں۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔۔۔ ابھی ہمیں کچھ پڑھنا بھی ہے۔"

"ہائے اللہ۔۔۔ کچھ دیر تو بیٹھو ڈمپل۔۔۔ تم آجاتی ہو تو دل لگ جاتا ہے ہمارا۔"
ایک تیز سی نظر اپنے میاں پر ڈال کر انہوں نے کہا۔

"کل آؤں گی جی۔۔۔"

"ضرور۔۔۔ وعدہ کرو۔۔"

"اب جی وعدہ تو نہیں ہو سکتا۔۔۔ لیکن کوشش کرونگی۔"

"نہیں جی۔۔۔ وعدہ کرو۔۔"

"چلئے وعدہ ہی سہی۔۔" ڈمپل مسکرا کر بولی۔

"تو بھر یہاں کیا کھڑے ہیں۔ ٹارچ لے کر لڑکیوں کو زینہ دکھا آیئے ناں۔۔۔"

سیّد صاحب کچھ دیر الماری میں ٹارچ ڈھونڈتے رہے۔ آخر وہ ان کی جیب سے برآمد ہو گئی اچانک ۔ ۔ ۔

"رشیدہ صاحبہ! چھ مہینے سے ہمارے زینے کی وائرنگ خراب ہے لیکن انہیں فرصت بھی ہوا سے ٹھیک کرانے کی ۔ ۔ ۔ خدا کے لئے اس میں نئی وائرنگ کرائیں آج کل میں۔۔"

"اچھا بھئی کل ہی سہی ۔ ۔ ۔"

"آپ کی کل بھی دیکھی ہوئی ہے۔ دھیان سے راستہ دکھاتیے گا۔۔"

پتہ نہیں ٹارچ کے سیل پرانے تھے کہ اس کا سوئچ خراب تھا۔ بیس بائیس سیڑھیوں میں آٹھ دس دفعہ روشنی بند ہوئی۔

جب وہ دونوں اپنے کمرے میں لوٹ آئیں تو رشو نے ڈرتے ڈرتے سنہری پٹی والے ڈبے کو ہاتھ لگایا۔ گڈی کاغذ کھولا۔ اور بڑی جرأت سے بولی۔

"یہ ۔ ۔ ۔ یہ تحفہ کیسے دے دیا مسز سیّد نے ممّی ؟"

"دینا ہی پڑتا ہے تحفہ وغیرہ ۔ ۔ ۔ ایسی صورت میں ۔"

"کیا مطلب ؟"

"ایسی باتوں کا مطلب وطلب نہیں پوچھا کرتے۔ سو جاؤ آرام سے۔"

"اور پڑھائی؟ ۔ ۔ پڑھو گی نہیں تھوڑی دیر ۔ ۔ ۔"

"میں تو بہت تھک گئی ہوں ۔ ۔ ۔ شب بخیر۔"

بغیر کپڑے بدلے، بغیر نائلون کی باریک جرابیں اتارے وہ بیڈ لیمپ کی طرف

پشت کر کے لیٹ گئی اور تکیے پر سر رکھتے ہی سو گئی۔

دُر شوار گئے تک گم سم کتاب سامنے رکھے بیٹھی رہی۔ کبھی اس کی نظر ڈمپل کی پشت پر جاتی۔ کبھی اس کی نگاہ سنہری ڈبّے کا طواف کرتی۔ کبھی سوچتی اس لڑکی کا ضمیر ہے کہ نہیں۔ پھر کوئی اس کے دل کو سمجھاتا کہ چوری تھوڑی ہے۔ مسز سیّد نے چار آدمیوں کے سامنے بہ اصرار تحفہ دیا۔ اس میں چوری کیسی؟

اسی سوچ میں نہ جانے اسے کب نیند آگئی؟

جوانی کی نیند شاید ایسی ہی ہوتی ہے۔ لاکھ جسم کا توازن بگڑے، لاکھ ذہن میں گرے رنگ کا مغز پانی میں بدلتا جائے۔ نیند تو اس طرح لوٹ کر گرتی ہے جیسے پانی میں کھڑا کھڑ ا درخت نیورا کر گرے۔ یہ اور بات ہے کہ ملک صاحب کی بیگم عمر کے اس دور میں داخل ہو چکی تھیں جہاں پہنچ کر محبت کی طلب تو بہت ہوتی ہے لیکن محبت کی جملہ ضروریات کو جسم پورا کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے نیندیں اپنے بس میں نہیں رہتیں۔

ملک صاحب اور بیگم صاحبہ نے پورے بیس سال ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہو کر کاٹے تھے۔ جب نئی نئی شادی کے بعد ملک صاحب آبادان اپنی بیوی کے ساتھ گئے تو اپنے کام پر جاتے وقت ملک صاحب کا دل بیٹھ جایا کرتا تھا۔ آبادان سے واپسی پر وہ اچھے خاصے امیر ہو چکے تھے۔ وطنِ عزیز لوٹے تو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ رشتہ داروں نے کلغی کی طرح اپنے ہاتھوں پر سجایا۔ حیثیت

عمر بدلتے ہی شہر میں ان کی ساکھ بڑی منہ زور گھوڑی کی طرح گردن اکڑاتے
پھرنے لگی۔

یہ عہد ان کی زندگی کا بہترین عہد تھا۔ اللہ نے پانچ بچے عطا کئے۔ اظہر، منظہر اور
ظفر۔۔۔ سب سے بڑی بیٹی شائستہ تھی اور سب سے چھوٹی بچی کا نام نازلی تھا۔

نازلی تک پہنچتے پہنچتے ملک صاحب اور بیگم صاحبہ ازدواجی زندگی سے اس
طرح اوب گئے تھے جیسے حلوائی مٹھائیوں کے تھال دیکھ دیکھ کر مٹھائی سے متنفر ہو
جاتے ہیں۔ ملک صاحب نے سرجیکل اوزاروں کی فیکٹری بنا کر اپنے آپ کو ڈاکٹروں
کی قینچی، موچنے اور چھریوں کے حوالے کر دیا تھا۔ بیگم صاحبہ کے لئے پہلے سر درد کا
عارضہ تفریح کا باعث ہوا۔ پھر سارا سارا دن ملک صاحب کی توجہ کی طلب اور ملک
صاحب کی عدیم الفرصتی کے باعث چارپائی کا سہارا لیا جانے لگا۔ یہ معلوم نہیں کہ
ملک صاحب کی طرف سے بے توجہی پہلے شروع ہوئی کہ بیگم صاحبہ کی صحت پہلے
بگڑی۔ یہ بھی چھان پھٹک کر بتایا نہیں جا سکتا کہ دونوں کس طرح اور کیسے ایک دوسرے
کو گھر کا پرانا فرنیچر سمجھنے پر مجبور ہوئے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ ان دونوں میں سے بظاہر
سب کچھ طاق نسیاں پر رکھنے کے باوجود کون ماضی کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا لیکن
اتنی بات ضرور ہے کہ بیگم صاحبہ کی صحت پچھلے سات آٹھ سالوں میں بہت بگڑ چکی تھی۔

ڈاکٹروں سے مشورہ ہوا تو پتہ چلا کہ رحم میں گریپ فروٹ جتنی بڑی رسولی
ہے۔ جب اس رسولی کے پھٹنے یا کینسر میں تبدیل ہونے کا احتمال ہوا تو چھ انچ

پیٹ کاٹ کر یہ رسولی نکالی گئی۔

علیہ نے اس وقت جب بیگم صاحبہ بے ہوشی کے عالم میں سرجری کی میز پر پڑی تھیں۔ ڈاکٹروں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ رحم کو اس رسولی سے اس قدر گزند پہنچ چکا ہے کہ اب اس کو جسم میں رکھنے کا یہی مطلب ہے کہ جیسے ہری بیل کے ساتھ سوکھی توری لٹکی رہنے دی جائے۔ اسی وقت ملک صاحب سے اجازت طلب کی گئی اور بیگم صاحبہ کا رحم جس نے پانچ بچوں کو اپنے اندر نو ماہ تک پالا شریفے کے بیجوں کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔

کنڈر فیزٹرے میں جب رسولی اور رحم نکال کر ملک صاحب کے پاس ایک سیاہ فام نرس پہنچی تو ملک صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے نرس کسی غیر عورت کی باتیں ان سے کر رہی ہے۔

خدا جانے یہ رحم نکل جانے کے باعث تھا کہ عورت کی عمر چالیس کے پیٹے میں پہنچ کر خود بخود مردانہ پن کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ بہر کیف چہرے پر مونچھوں کے بال اور چاہِ ذقن کے ارد گرد پلکوں جیسے موٹے اور خمدار بال نکلنے لگے۔ وہی حلق جس سے پہلے کویل جیسی تیکھی آواز نکلتی تھی۔ اب پہاڑی کوے کی طرح بولنے لگا۔

یہ تو وہ تبدیلیاں تھیں جو ظاہری تھیں لیکن ایک ایسی تبدیلی تھی جس کا ذکر بیگم صاحبہ نے کسی سے نہ کیا تھا۔ جب انہیں خبر ملی کہ رحم تو ظالم سرجنوں نے رسولی کے ساتھ ہی نکال پھینکا تو فوراً ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اب وہ عورت نہیں،

رہیں ۔ لاکھ بیرونی ممالک سے پڑھ آئے ڈاکٹروں نے ان کی تشفی کی کہ رحم کا عورت کی نسوانیت اور اس کی شادی شدہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس کا تعلق اگر ہے تو ان بچوں سے ہے جنکو جننے کی بیگم صاحبہ کو خواہش نہیں ۔ لیکن ان کے دل کے کنوئیں میں نفورتی سے ٹوٹ کر ڈول گر چکا تھا ۔ اوپر سے چہرے پر بن بلائے بالوں نے اس شبہ کو تقویت دی تھی ۔ پہلے انہوں نے ملک صاحب کا کمرہ چھوڑا پھر اپنے آپ کو کٹبنے کی بے شمار مہمان داریوں کے سپرد کر دیا ۔

پتہ نہیں بیگم صاحبہ نے ملک صاحب کا کمرہ پہلے چھوڑا تھا یا ملک صاحب محض مارے مروت کے تیسری منزل پر نہ جاتے تھے ۔ بہر کیف جب وہ تیسری منزل پر مستقل طور پر مقیم ہو گئے تو بظاہر نہ اس طرف استفسار ہوا نہ ادھر انکار ۔ ۔ ۔ دونوں اس طرح علیحدہ ہو گئے ۔ گویا دو گاڑیاں اپنا اپنا لوٹکن بے کر ایک دوسرے کو کراس کر گئی ہوں ۔ ۔ ۔

کہتے ہیں کہ ابھی اس صدی کے شروع تک ٹراونکور کے علاقے میں دیو داسیاں مندروں میں رہا کرتی تھیں ۔ کنچنی، گوراچیکلا کی لال بیبی، خانگی، پریشان، یا لولی سے دیو داسی اس طرح مختلف تھی کہ ان سے سوسائٹی کا ایک ایسا طبقہ وابستہ تھا جو ان کی عزت کم کرنے کے بجائے ان کی اہمیت اور عزت دونوں میں اضافہ کرتا تھا پروہت اور مندر کی سیوا ان کا دھرم تھا ۔

ایسی دیو داسی جس کے حسن اور رس بھرے گیتوں نے مندر میں اجالا کر

رکھا ہو جب عمر کے اس حصے میں پہنچتی ہے جب ڈاڑھی کے بال نمایاں اور حلقوم سے پہاڑی کوے کی سی آواز نکلتی ہے تو ایسی دیو داسی مندر کی چوکھٹ پر سیس نوا کر عرض کرتی ہے کہ مجھے اپنے جھمکے اتارنے کی اجازت دی جائے۔

جھمکا اتارنے کی اجازت باضابطہ طور پر دی جاتی ہے۔ مہاراجہ کے محل میں اس رسم کی ادائیگی بڑے طمطراق سے کی جاتی ہے۔ مہاراجہ کے جلو میں وہ افسران با اختیار ہوتے ہیں جنہیں ضرورت پڑنے پر شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت بوڑھی دیو داسی لکڑی کے خالی تختے پر بیٹھ کر اپنے کانوں کے جھمکے اتارتی ہے۔ ان کے ساتھ اپنی گرہ سے مہاراجہ کا نذرانہ رکھ کر وہ تختے سے اٹھتی ہے۔ اور ان جھمکوں کی طرف ایک بار بھی دیکھے بغیر دربار سے رخصت ہو جاتی ہے۔

اسی دن کے بعد گو یہی جھمکے اسے لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن انہیں پہننے کی اسے کبھی اجازت نہیں ملتی۔

اب وہی مندر جس میں کچھ عرصہ پہلے اس کی کلا جگ رہی تھی۔ یہاں وہ ایسے رہتی ہے جیسے کسی ویلفیئر سیٹ کے غریب خانے میں معذور بزرگ رہتے ہیں۔

ظفو کی والدہ نے باضابطہ طور پر جھمکے تو نہ اتارے تھے لیکن وہ مندر کی زندگی سے دستبردار ضرور ہو چکی تھیں۔ یوں کمپلسری ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنے گھر کو جو روپ دیا وہ ان کی بیتی ہوئی زندگی کا شاہد تھا۔

نیم جوان بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں کچھ تنہا نہیں ہوتی۔ وہ بھی جب بڑے

دونوں بیٹے اور بڑی لڑکی شادی شدہ ہو۔ لیکن اماں تو لمحہ بھر کے لئے اپنے آپ کو اپنے ہی رو برو لانا نہ چاہتی تھیں۔ ہر وقت انہیں میلہ گھومنی کی طرح اپنے اردگرد میلہ اچھا لگتا۔ بھانجیاں، بھتیجیاں، بڑے لڑکوں کے سمدھیانے، بڑی بیٹی کے سسرال والے وقت بے وقت چلے آ رہے ہیں۔ گھر کی شکل و صورت کارواں سرائے کی ہو گئی۔ تولیے پر کھانا چنا جا رہا ہے۔ پردوں سے ہاتھ پونچھے جا رہے ہیں۔ چارپائیوں پر ٹرنک دھرے ہیں۔ ٹرنکوں پر مہمان لدے ہیں۔ مہمان ہیں کہ ایک آتا ہے دوسرا جاتا ہے۔ ساڑھے گیارہ سے لے کر چار سوا چار تک دوپہر کا کھانا چلتا ہے۔ منہ اندھیرے بھینس کے آگے چارہ دانہ ڈال کر چائے کی کیتلی چڑھتی ہے تو دوپہر تک انڈے پراٹھوں کی خوشبو باورچی خانے سے چلی آتی ہے۔ اماں کی خوش خلقی اور انکسار و محبت کی سب تعریف کر رہے ہیں۔ ملک صاحب تیسری منزل پر رہتے ہیں اور تیسری منزل سے اماں کے کمرے میں ٹوٹی کا حصّی پرنالہ چپ چاپ بہتا ہے۔ نہ اماں مانگنے جاتی ہیں نہ ملک صاحب کبھی دیتے ہوئے باز پرس کرتے ہیں۔

اس سارے تین منزلہ مکان میں ظفر اور ملک صاحب پال میں پڑے ہوئے آموں جیسی زندگی گذار رہے ہیں۔ اظہر اور مظہر اپنی اپنی بیوی اور اپنی اپنی دکان کے درمیان پنگ پانگ بال کی طرح اچھل اچھل کر بڑی مصروف زندگی بسر کر رہے تھے۔ ظفر کے لئے اس گھر میں جس سکون کی ضرورت تھی وہ اسے تیسری منزل پر بھی نہ ملتا۔ جب سے رشتو کو خط لکھنے کا سلسلہ بند ہوا تھا۔ وہ اپنے جذبات پر کارک

لگانے میں تو کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن اب اس کے دل میں اپنے باپ کے خلاف وہ دبا دبا بغض اکٹھا ہو رہا تھا۔ جو کارک لگانے کے باعث بڑی شدّت کے ساتھ تبخیر کی صورت میں جمع ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے بیک وقت نفرت اور محبت کا شکار ہو چکا تھا۔

یہ کون ہوتے ہیں مجھے منع کرنے والے؟
یہ کون ہوتے ہیں مجھ پر پابندی لگانے والے؟
وہ کون ہوتی ہے ان سے شکایت کرنے والی؟
یہ کیوں ہوا کہ میں نے ان سے وعدہ کر لیا؟
اور ایسے کیوں ہے کہ میں یہ وعدہ توڑ نہیں سکتا؟

ظفر کی طبیعت میں بلا کی شدّت تھی۔ جو کیفیت اٹھتی اس میں مدّوجزر اکبر کی صورت ہوتی۔ پھر جب تک یہ کیفیت طاری رہتی۔ وہ اتھلے پانیوں میں کبھی نہ آتا۔ گہرے عمیق پانیوں میں پتوار کے بغیر کشتی دوڑائے پھرتا۔ جب سے رشّو کو خط لکھنے کا سلسلہ بند ہوا تھا۔ وہ پہلے تو غصّے اور غم میں بھرا۔ پھر اس پر ایک گہری حزنیہ کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اندر ہی اندر فنیٹس بن گیا۔ اور رحم کی اندھیری چھاگل میں زانو سے سر لگا کر ایک سوالیہ نشان بنا وقت گذارنے لگا۔

اب اس کا زیادہ وقت باغوں میں کٹنے لگا۔ کبھی باغ جناح میں جا بیٹھتا کبھی جہانگیر کے مقبرے میں پناہ لیتا۔ جب شام کو کوّے کائیں کائیں کرتے غول در

غول گھروں کو لوٹتے تو وہ بھی موٹر سائیکل لے کر گھر آجاتا۔ سب سے زیادہ اسے نور جہاں کے مزار کا چسکا پڑا۔ اس مقبرے میں جو خستگی بے چارگی اور اندھیرا تھا وہ ظفر کی طبیعت کے ساتھ میل کھاتا تھا۔ وہ اپنی کتابیں گھر سے لاتا اور انہیں اندھیروں میں منہ دیئے پڑھتا رہتا۔ ان دنوں اس کے ساتھ سائیکلوجی سے زیادہ مختلف مذاہب کی کتابیں ہوتیں۔ کنفوشش، کپل دستو کے سدھارتھ، زرتشت، بہائی فرقہ اور صوفیہ کرام کے متعلق اس نے بہت کچھ پڑھ لیا۔ گندم جو، مکئی اور ساری دالیں مل کر اس کے اندر ایک ایسا حلیم پکانے لگیں جس کی خوشبو سے خود اس کا اپنا وجود منہال کی طرح بوجھل ہو گیا۔ رشو کی محبت سیر بین کی طرح کئی روپ دھارتی۔ کئی زاویوں سے اسے برماتی۔ بہت مذہب کا سہارا پکڑتا۔ کئی طور اس جذبے پر کمند پھینکتا۔ اس منہ زور گھوڑے کو زانوؤں میں دباتا۔ لیکن رشو سے محبت کچھ اکتسابی علم نہ تھا یہ تو ایک وجدانی کیفیت تھی جیسے صبح سویرے کوئی دھن کانوں میں رچ بس جائے۔ اور سارا دن ذہن میں دل میں کانوں میں شریانوں میں بھونرے کی گونجار بن کر گونجتی رہے۔ محبت سے تو وہ پیچھا نہ چھڑا سکا۔ لیکن مذہب کی لاٹھی ٹیکنے کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اس میں ایک قسم کی مثبت قوت مدافعت پیدا ہو گئی۔ پہلے وہ رشو کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ رشو کے قدموں کو پکڑ کر اسے یروشلم کی کسبی کی طرح اپنے آنسوؤں سے دھونا چاہتا تھا۔ وہ رشو کو اپنے بازوؤں کے حصار میں انار کلی کی طرح دفن کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دکھ اور صبر نے ایمان کی ایک اور راہ

متعین کر دی تھی۔

ایک روز ارشاد ہوا :

کہ جہانگیر بادشاہ کو شاہ حسین ڈھڈا کی زیارت کا دلی شوق و اشتیاق ہوا۔ مصاحبوں نے عرض کی کہ حضور وہ تو لکڑی کا گھوڑے بناتے اس پر سوار بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ نہ عزت داروں کا پاس رکھتا ہے نہ منصف مزاج ہے۔ ایسوں سے شاہوں کا اختلاط چہ معنی دارد۔ اتفاقاً جس روز جہانگیر نے قصدِ زیارت کا کیا، اسی رات وہ فقیر مجذوب صورت جھروکا شاہی تلے آنکلا۔ کسی نے شاہ کو خبر کی کہ آپ کے جھروکے کے نیچے شاہ حسین بہ نفسِ نفیس آموجود ہوتے ہیں۔ اگر ارادہ زیارت کا ہو تو طلب فرمایئے۔ بادشاہ نے جھٹ پٹ کمند لٹکا دی فقیر کو اوپر کھینچ لیا۔ کچھ دیر باہم اخلاص کی باتیں ہوتیں پھر بادشاہ نے پوچھا کہ اے دینِ اسلام کے چراغ یہ بتا تجھے خدا کیسے ملا۔ جواب ملا جیسے تو۔ پھر پوچھا کہ یہ بتا میں تجھے کیسے ملا۔ تو پھر ارشاد ہوا جیسے خدا . . . اب ہندوستان کے فرمان روا نے زچ ہو کر کہا کہ یہ معمہ کیا ہے یہ تو سمجھا۔ صاحب کرامت فقیر بولا۔ دیکھو والی تخت و تاج اگر میں تجھ سے ملنا چاہتا۔ تو پہلے نہا دھو کر تیری محفل کے دستور کے مطابق لباس پہنتا پھر کسی سواری پر یہاں پہنچتا۔ یہاں پہنچ کر تیرے برق اندازوں کی خوشامدیں اہلکاروں کی منتیں کرتا۔ درباریوں کی خدمتیں کرتا۔ اور پھر تجھ تک پہنچتا۔ تب تک خدا جانے طبیعت تجھے ملنے پر مائل رہتی کہ نہ رہتی۔ بس تمہارے دل میں تمنا جاگی

تڑپتا بسمل ہو گیا۔ چپ چاپ اپنے تک گھسیٹ لیا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور

ملاقات ہو گئی۔۔۔

خدا جانے یہ باغوں کا اثر تھا کہ علوم دینی کا عطیہ تھا ظفر کے دل میں یہ تمنا جاگ

اٹھی تھی کہ اب رشتہ اسے کمند پھینک کر اٹھاتے ورنہ وصل سے ہجر بہتر۔۔۔ پہلے

درجہ بدرجہ سلوک طے کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔ اب ایک جذبۂ عشق کا انتظار کرنے

لگا جو ایک آن میں ساری منزلیں طے کرتا ہے۔

اسی جذبۂ غیبی کے انتظار میں چشم شبنم کی طرح تر وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا

شیو بڑھی ہوئی تھی۔ پتلون سے باغ جناح کی خشک گھاس کے تنکے چمٹے تھے۔ ہاتھوں

اور کہنیوں پر سیلی مٹی کی ٹھنڈک تھی۔ لبوں پر کپل وستو کے شہزادے کی بانی تھی۔

اگر تمنا کا درخت کاٹ دو

تو اس کے تنے میں پھر حسرتوں کی کونپلیں نکل آتی ہیں۔

اگر تمنا کا درخت جڑ سے نہ ٹوٹے۔

تو دکھوں کی کونپلیں کیوں پھوٹیں گی؟

کیونکہ ہر تمنا کو ہمیشہ دکھ کی کونپلیں لگتی ہیں۔

ملک صاحب فائبر کا بریف کیس اٹھائے پیٹنٹ لیدر کے جوتے پہنے قائد

اعظم جیسے لمبے دبلے بیرسٹروں کی طرح لوہے کی لاٹ بنے تیسری منزل سے

نیچے اتر رہے تھے۔ ظفر اور ملک صاحب کی مڈھ بھیڑ اندھیرے زینے میں ہوئی۔

"سلام علیکم اباجی ۔ ۔ ۔"

"وعلیکم ۔ ۔ ۔ کہاں سے آئے ہو بھئی؟"

"بس جی امتحان کی تیاری ہے ۔"

ملک صاحب سے آفٹر شیو لوشن اور یوڈی کولون کی خوشبو آرہی تھی۔

"پھر اچھی طرح ہو رہی ہے پڑھائی؟"

"جی کوشش جاری ہے ۔"

"امید ہے فرسٹ کلاس تو آجائے گی تمہاری ۔ ۔" ملک صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

ظفر کا کندھا اس گرفت تلے ایسا سُن ہوا۔ جیسے سوکھے کی بیماری سے مارا گیا ہو۔

"دیکھئے ۔ ۔ ۔"

"دیکھئے نہیں بھئی ضرور کہو ۔ ۔ ۔ انشاء اللہ کہو ۔ ۔"

ظفر ایک سیڑھی اوپر چڑھ گیا۔ اسے نہ جانے کیوں اپنا باپ وہ گدھ سا نظر آیا جو پارسیوں کے مردہ گھاٹ کے اردگرد منڈلایا کرتا ہے۔

"تمہیں بہت محنت کرنی چاہئے ظفر! ہمارے گھر میں تمام بزنس مین ہیں ۔ ۔ اظہر اور مظہر کو اللہ نے بہت کچھ دیا ہے لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن میری تمنا ہے کہ تم سی ایس پی ہو جاؤ ۔ ۔ ۔ یہ عزت ہو گی ہمارے لئے ۔ ۔ ۔ اور کچھ مشکل بھی

نہیں تمہارے جیسے ذہین آدمی کے لئے۔۔۔"

"ابھی تو یہ ایم اے کا ہی فیصلہ نہیں ہو رہا آباجی۔"

"خیر خیر۔۔" ملک صاحب نیچے کی طرف اترنے لگے۔ "خیر خیر۔۔ خیر خیر۔۔

"آپ۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔۔۔"

محبّت کا ایک پرجوش ریلا اس کے دل میں گھستا چلا آیا۔ وہ جی میں سوچنے لگا یہ بوڑھا آدمی جو بظاہر نوجوان لگتا ہے۔ کس قدر خستہ ہے۔ اس کے کئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے۔۔ شاید اس کی کوئی ایسی محبّت بھی ہو جو بار آور نہیں ہو سکی۔ اور حبس کے بوجھ تلے یہ رات کو بہت بوڑھا نظر آتا ہے۔ کلاوہ اور ڈریسنگ گاؤن پہنے بیڈ لیمپ کی روشنی میں برٹرنڈ رسل پڑھتے ہوئے یہ آدمی کسی اندھیرے جزیرے کی طرح پر اسرار سا لگتا ہے۔۔۔۔ ایسا جزیرہ جسے پانی کی ایک لہر سمندر اور دوسری واپس جاتی لہر خشکی میں بدل دیتی ہے۔

"آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔۔"

"یہی بہتر ہے۔۔۔" اترتے ہوئے ملک صاحب رک کر بولے۔

کندھوں میں ہلکا سا خم۔۔۔ بالوں میں گھلی ملی سیاہی۔۔۔۔۔۔ اسے نہ جانے کیوں یاد آیا؟

"اپنے باپ کی عزّت کر

اپنے باپ کے لرزتے قدم دیکھ۔۔۔

دیکھ کہ یہ سایہ سورج غروب کے خوف سے لرز رہا ہے۔
دیکھ یہ سایہ شام کی ظلمت سے جھگڑ رہا ہے۔
دیکھ اور سورج ...
یہ سایہ کہیں تیرا اپنا سایہ تو نہیں ...

حجرے ہی جی میں اس نے اپنے باپ کے لئے دعا مانگی۔ اپنے باپ کی خوشیوں کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اس کی تمنائیں بر آنے کی خواہش کی ...

نچلی سیڑھی پر پہنچ کر ملک صاحب نے پلٹ کر اوپر والی سیڑھی پر نظر ڈالی.. لحہ بھر کو ظفر کی طرف دیکھا اور منہ پھیر کر کہا۔

"تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا ..."

"جی .."

"امتحانوں کے بعد ہم خود تمہارا انتظام وہیں کر دیں گے .. بشرطیکہ تم نے چاہا .. تب تک تم اسے کسی طرح تنگ نہیں کرو گے .."

"جی .."

ظفر کے دل میں نفرت کا دھواں نہ جانے کہاں سے گھس آیا۔ کوئی عورت جب محض مرد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ سوتی ہے تو سحر کے وقت اس کے دل میں اس مرد کے لئے بالکل ایسی ہی نفرت اٹھتی ہے۔ ایک ایک مسام سے گرمی کے پسینے کی طرح پھوٹتی ہوئی ... باہر نکلنے بر رہے

سانس میں کاربن ڈائی اکسائڈ کی طرح گھلی ہوئی... یہ نفرت مکڑی کے جالے کی طرح نازک لیکن فولاد کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ وہ بار بار خوشنودی حاصل کرتی ہے اور بار بار اس شکنجہ میں اپنا وجود کسواتی ہے۔ نہ خوشنودی کی گرہ نیم باز کھلتی ہے نہ نفرت کا بازار سرد پڑتا ہے۔ یہ دونوں کیفیتیں ہم طاقت لہروں کی طرح ایک ہی رفتار سے رواں کرتی سمندر کے وسط میں ملتی ہیں۔ اور پانی کی ایک ایسی دیوار کھڑی کر دیتی ہیں جو ایفل ٹاور سے مشابہ ہوتی ہے۔ انسی ایفل ٹاور کو سینے سے لگائے ظفر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نہ جانے کیوں یکدم اس کی ہتھیلیاں جلنے لگی تھیں۔

جس وقت ملک صاحب کی کار مین روڈ پر پہنچی اس وقت ڈمپل اور رشوجان کالج سے لوٹ کر باسی دال اور نان کباب کھا رہی تھیں۔ گھر پر ان دنوں کوئی ملازم نہ تھا۔ صبح جو کچھ پک پکا جاتا وہی کالج سے واپسی پر بھی کام آتا۔ ان دونوں کا معمول ہو چکا تھا کہ برابر کے پیسے ڈال کر واپسی پر نان کباب لے آتیں۔ اور چار سوا چار بجے کھانا کھاتیں۔ بغیر پردوں کی کھڑکی میں سے باہر جھانک کر ڈمپل نے پہلے دیکھا اور پھر اس نے جلدی سے دال سے لبالب بھرا تام چینی کا ڈبہ الماری میں بند کر دیا اخبار سمیت نان کباب لپیٹ کر رشو کے سرہانے تلے چھپا دیئے۔ اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی...

"السلام علیکم ملک صاحب۔"

"السّلام علیکم"
لمبی سیاہ گاڑی جس کے اندر لال گدّیاں اور مستک پر سدرشن چکر سا لگا تھا پھاٹک کے عین سامنے کھڑی تھی۔ اور مودّب وردی والا ڈرائیور رومال سے سامنے والا شیشہ صاف کر رہا تھا۔

"مس رشیدہ گھر پر ہیں . . ."

"آپ آیئے تو سہی اندر . . ."

"میں ادھر سے گذر رہا تھا تو مجھے یاد آ گیا کہ آپ لوگ یہاں رہتی ہیں . . ہیں۔"
ملک صاحب نے جلدی سے ایک جامع بہانے کی تلاش کی لیکن ذہن حاضر نہ تھا مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔

"رشّو . . . رشّو ذرا باہر آؤ . . . رشّو . ." کسی آپرا سنگر کی طرح پنجمی سُروں میں ڈمپل نے آواز دی۔

رشّو باہر آئی تو اس کے ہونٹوں کے کنارے کبابوں کی تیزی کے باعث سرخ ہو رہے تھے۔ اور ناک پر پسینے کے قطرے جمے تھے۔

اتنے ہی دو باتوں پر ملک صاحب کی نظرِ تحسین پہلے پڑی۔

"السّلام علیکم . . ."

جانبین نے ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا۔

"میں ادھر سے گذر رہا تھا۔"

"اندر آجائیے ملک صاحب ۔"

"بس جی وقت کم ہے ۔ مجھے فری ہسین کی میٹنگ پر جانا ہے ۔"

رشّو خاموش کھڑی سوچ رہی تھی ۔ شاید یہ اپنے ہونے والی بہو کا قریب سے جائزہ لینا چاہتے ہیں ۔ شاید یہ مجھ سے امّاں کا ایڈریس مانگنے آئے ہیں ۔ شاید یہ اس بات کا اندازہ کرنے آئے ہیں کہ میں ظفر کو کس قدر پسند کرتی ہوں ۔

"افسوس اباجی اس وقت گھر پر نہیں ہیں ۔ ۔ ۔ ورنہ ۔ ۔ ۔"

"میں ان سے ملنے ضرور کسی دن حاضر ہو جاؤں گا ۔ ۔ ۔ آپ لوگوں کو کسی جگہ چلنا ہو ۔ تو ۔ ۔ ۔ میری گاڑی حاضر ہے ۔"

"جی نہیں ہم تو ابھی لوٹے ہیں جی کالج سے ۔ ۔ ۔" رشّو بولی

"اور ڈرامہ دیکھنے نہیں جانا اوپن ایئر میں ۔ ۔ ۔" ڈمپل آہستہ سے بولی

"چلئے میں پہنچا آتا ہوں آپ کو ۔"

"جی نہیں شکریہ ہم چلی جائیں گی ۔"

"اگر آپ کو مجھ پر اعتراض ہے تو ۔ ۔ ۔ تو میں ٹیکسی پر چلا جاؤں گا ۔ آپ کار پر چلی جائیں ۔ ۔" معصومیت سے ملک صاحب نے کہا ۔

"توبہ توبہ ! ۔ ۔ ۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ ملک صاحب ۔" رشّو نے جلدی سے کہا ۔

"تو پھر آیئے چلئے ۔"

"ذرا ہم کپڑے تبدیل کر لیں ۔" ڈمپل نے جلدی سے رشو کا بازو پکڑ لیا۔
ملک صاحب کو ٹوٹی ہوئی نواڑی کرسی پر بٹھا کر وہ دونوں اندر چلی گئیں۔ اس آدھ گھنٹے میں جب کہ ڈمپل اور رشو اندر تیار ہو رہی تھیں۔ ملک صاحب نے پہلے کوٹھی کا جائزہ لیا۔ ایک ہی نظر میں انہیں علم ہو گیا کہ اوپر والے حصے میں کوئی متموّل شخص رہتا ہے۔ اور نچلے حصے کی کسمپرسی کا باعث مالک مکان کی تنگدستی ہے۔ اوپر والی منزل کے کمروں میں بڑے خوبصورت پردے ٹنگے ہوتے تھے۔ کمروں سے ریڈیو بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ کھڑکیوں کا پینٹ پالش تازہ تھا۔ اور ایک کھلی کھڑکی میں سے ایک بڑے گلدان کے پھول نظر آ رہے تھے۔

جب ملک صاحب نے اس کوٹھی کے آگے ڈرائیور کو رکنے کے لئے کہا تھا تو وہ دل ہی دل میں کچھ سہمے ہوتے تھے۔ ڈمپل کو دیکھ کر ڈمپل کے گھر اور گھر والوں کا کچھ اور ہی نقشہ انہوں نے دل میں مرتب کیا تھا۔ لیکن اکھڑے ہوتے پلستر اور کھڑکیوں میں شیشوں کی جگہ گتے لگے دیکھ کر اندر ہی اندر ان کا حوصلہ زاویہ قائمہ پر کھڑا ہو گیا۔

ابھی تک وہ اپنے جذبات کا بھلی طرح تجزیہ نہ کر سکے تھے۔ انہیں پہلے تو رشیدہ پر ترس آیا۔ پھر اس لڑکی کی مدد کرنے کو دل چاہا۔ اور اب وہ اِس آدھ گھنٹے میں اس لمبے کانوں والی لڑکی میں ایک ایسی کشش محسوس کرنے لگے تھے جو کششِ ثقل کی طرح نامعلوم اور یقینی ہوتی ہے۔

اندر رشّو نے جب ملک صاحب کی گاڑی میں جانے سے انکار کر دیا تو ڈمپل
نے لمیس کے دستانے اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ ۔ ۔

"لو پہنو اور سیدھی طرح چلو۔"

"میں نہیں جا سکتی ۔ ۔ ۔ امّاں نے لکھّا تھا کہ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔
کسی کے ساتھ باہر نہ جاؤں ۔ ۔"

ڈمپل نے ہنس کر کہا۔

"یہ کسی ہیں؟ ملک صاحب کسی ہیں؟ ۔ ۔ ۔ جنابہ محترمہ رشیدہ صاحبہ یہ تمہارے
ہونے والے سُسر ہیں۔"

"اگر تم ایسی باتیں کرو گی تو خدا قسم میں ہوسٹل چلی جاؤں گی ۔ ۔"

ڈمپل سفید دستانوں والے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"اچھّا بابا معافی ۔ ۔ ۔"

"ہم کس طرح جا سکتے ہیں ان کے ساتھ۔"

"وہ اپنی میٹنگ پر جا رہے ہیں۔ فری میسن کی میٹنگ پر ۔ ۔ ۔ ہم کو باغ جناح
تک لفٹ دیں گے اور بس ۔ ۔ ۔"

"یہاں سے تو ہم چل کر بھی جا سکتی ہیں اوپن ایئر تک ۔ ۔"

"جو لطف مرسڈیز بنز میں سے اترنے کا ہے۔ وہ پیدل پہنچنے میں نہیں ہے۔"
رشّو کے ٹخنوں میں امّاں کا وہ خط جھنکار رہا تھا۔ جو ابھی ہفتہ بھر پہلے اسے

ملا تھا۔ اس کے قدم اس خطے نے جکڑ رکھے تھے۔

"دیکھو وہ ظفر کی بیوقوفی کی تلافی کر رہے ہیں۔ خود ہی سوچو اتنا معتبر معزز آدمی جب معافی مانگ رہا ہے تو تم خاردار تھوہر بن رہی ہو۔ خدا قسم یہ معافی مانگنے کا ایک ریفائنڈ طریقہ ہے۔ چلو... سیدھی طرح..."

جب رشو چلنے پر آمادہ ہو گئی تو ڈمپل اس کے کپڑوں پر معترض ہوئی۔

"یہ کاٹن کی قمیض اور سفید دوپٹہ نہیں چلے گا... اتار دو اسے..."

رشو کے لمبے کان جلنے لگے۔

"خدا قسم ٹھیک ہیں یہ کپڑے۔"

"سنو رشو! جب کبھی اسکورٹ کے بغیر کسی پبلک جگہ میں جاؤ تو ہمیشہ اتنے قیمتی لباس میں ہونا چاہیئے کہ کسی کو بات کرنے کی ہمّت نہ پڑے۔ اور اگر کار میں سے اتر سکو تو اور بھی اچھا۔ معمولی آدمی قریب نہیں پھٹکتا..."

"لیکن میں ساڑھی پہن کر نہیں جا سکتی مجھے ساڑھی کی عادت نہیں۔"

"عادت بھی پہننے سے ہوتی ہے۔ یہ معزز عورتوں کا فارمل ڈریس ہے۔ چلو پہنو..."

"ڈمپل... خدا کے واسطے..."

اور یہ بیس کے دستانے اور جوتے... کورٹ شو..."

ساڑھی دستانے اور جوتے پہن کر جب وہ ڈمپل کے سامنے آئی اور ڈمپل

نے اس کے چہرے کو بیوٹی کلینک کے حوالے کیا تو رشتو آئینے والی صورت پر حیران
رہ گئی۔ ڈسٹمپر کا کورٹ ختم ہوا تو جلد ساٹن کی طرح ملائم اور چمکدار ہو گئی۔ آنکھوں میں ایسی
چمک پیدا ہو گئی کہ رشتو کی اپنی نگاہیں آئینہ پر جمی رہ گئیں۔ وہ کسی لاکھوں پتی رئیس باپ
کی ایسی بیٹی لگ رہی تھی جو سوئٹزرلینڈ سے پڑھ کر آئی ہو۔ جس کے باپ کی ملیں چلتی ہوں
اور جو اپنے ذاتی سوئمنگ پول میں نہانے کی عادی ہو۔

وہ دونوں باہر نکلیں تو ملک صاحب کا جی چاہا کہ بندوقوں کی سلامی دیں۔ اور
پرانے جانبازوں کی طرح گھٹنے ٹیک دیں۔ اس کے برعکس کار کا دروازہ بھی ڈرائیور
نے کھولا۔ اور وہ پرانی کمانی کی عینک صاف کرتے اگلی سیٹ میں جا بیٹھے۔

اور جب ایئر تھیٹر کی پہاڑی پہ انہیں دائیں بائیں لے کر ملک صاحب اوپر
پہنچے۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی فخر سے ان کی گردن بہت اونچی ہو چکی تھی۔ تیسری
پتھریلی قطار میں گدیوں پر جب دونوں بیٹھ گئیں۔ اور اردگرد فرانسیسی سینٹ
مہکیں تو معذرت مانگ کر ملک صاحب اپنی میٹنگ پہ چلے گئے۔

جب ملک صاحب کی کار دوبارہ میس کی زردرو اونچی کرسی والی عمارت کے
پاس رکی تو پہلی بار ان کی نگاہ اپنے چہرے پر پڑی۔ سامنے ذرا سے چھوٹے آئینے
میں انہوں نے اپنی عینک دیکھی۔ اس عینک کا فریم لوہے کا تھا اور پرانی وضع کا
تھا۔ اس سے آنکھوں کا درمیانی فاصلہ تنگ نظر بنیوں کی طرح بہت چھوٹا نظر آتا
تھا۔ ملک صاحب نے عینک اتار کر اپنا چہرہ دیکھا۔ پھر عینک لگائی۔ اپنی آنکھوں

کے گرد حلقوں پر نظر ڈالی۔ اور پھر ڈرائیور سے کہا۔

"علی بخش ذرا کار مال پر لے چلو۔۔"

علی بخش نے کار موڑی اور مال کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی دوسرے ایکٹ کا پہلا سین شروع ہوا تھا کہ ملک صاحب واپس اوپن ایئر تھیٹر میں جا پہنچے۔ رشّو انہیں دیکھ کر بھونچکی سی رہ گئی۔ ملک صاحب شام کو کچھ تھکے تھکے اور بڈّھے سے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اس نیم اندھیرے میں وہ حیرت انگیز حد تک ظفر سے مشابہ تھے۔

"میٹنگ جلدی ختم ہو گئی۔۔۔ آپ۔۔۔ برا تو نہ مانیں گی اگر میں۔۔۔ بیٹھ جاؤں یہاں۔۔۔"

علیحدہ سیڑھیوں کے پاس رشّو کے بائیں ہاتھ ملک صاحب نے اپنی فوم ربڑ کی گدّی رکھ دی۔

ڈھیلے نے چپس کا لفافہ ملک صاحب کو پیش کیا تو اس لفافے کو پکڑنے کے لیے چند ثانیے کے لئے ان کی کہنی رشّو کے گھٹنے سے مس ہو گئی۔ رشّو نے جلدی سے گھٹنا نیچے گرا لیا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔" ملک صاحب نے رشّو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

دوسرے ایکٹ کے تیسرے سین کے آخری جملے تک رشّو سوچتی رہی کہ ملک صاحب میں آخر کیا تبدیلی ہو گئی ہے۔ اس سوکھی ڈال میں کہاں سے شگوفے نکل آئے ہیں

تیسرے سین کے بعد جب فل لائٹیں روشن ہوئیں اور ملک صاحب نے بیرے کو چائے کا آرڈر دیا تو رشو پر یکدم ملک صاحب کی جوانی کا راز کھلا۔

ملک صاحب کے چہرے پر پیتل کی کمانی والی عینک نہ تھی۔ بلکہ اس کی جگہ چوڑے فریم کی گلابی پلاسٹک کی ایسی عینک تھی جو ان کے دبلے چہرے کو بھرا بھرا اور کتابی بنا رہی تھی۔

انٹرول کے دوران ملک صاحب ڈمپل سے پہلے ایکٹ کی کہانی سنتے رہے پھر انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"رشیدہ بی بی! آپ بہاولپور سے نئی آئی ہیں۔ میں آپ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید میرے پاس آنے کی جرأت نہ کرتی لیکن ... آپ نے بہت راست گوئی سے کام لیا ... میں آپ کو لاہور کے متعلق ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور حلیم کی ایک دیگ ہے۔ اس میں ہر قسم کا اناج کھپ جاتا ہے۔ ہر طرح کی بوٹی گل جاتی ہے ... یہاں اگر آپ کو اپنی شخصیت بے داغ رکھنا ہے تو آپ کو ہڈی کی طرح سخت بننا پڑے گا۔"

"جی ..." رشو نے سعادت مندی سے سر جھکا کر کہا۔

"اس شہر میں اتنے بھانت بھانت کے پنچھی اور ایسے ایسے آوارہ اوباش جمع ہیں کہ آپ جیسی معصوم لڑکی کے لئے اس بحرِ بیکراں میں کھو جانا معمولی بات ہے ..."

"جی ..."

"میں ظفر کا باپ ہونے کی حیثیت سے . . . میری یہ ذمہ داری . . . یعنی میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ آپ کی نگرانی کروں . آپ کا قیام لاہور میں آرام دہ ہو . . . اور . . . "

"جی . . . "

"آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں ؟"

"جی . . . "

"ظفر کو . . . آپ سے کیا تعلق ہے . اس کے لئے وقت درکار ہے . آپ پڑھ رہی ہیں - اس پڑھائی کے لئے آپ کو سکون اور فراغت کی ضرورت ہے "

"ہمارے گھر میں اسے ہر طرح سے سکون ہے "

"پھر بھی یہ بہاولپور سے آئی ہیں اور بہاولپور کا اپنا مزاج ہے . . . لاہور سے بہت مختلف . . . "

"جی . . . "

"اگر آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو . . . پیسے کی . . . یا کسی اور چیز کی تو . . . مجھ سے بلا تکلف کہیئے گا . "

"جی . . . فی الحال تو . . . "

"میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں ظفر کا باپ ہوں . . . میں . . . اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں . . . "

"شکریہ . . ."

"اور . . . اور میں نادم بھی ہوں ظفر کی حرکتوں پر . . ."

"جی کوئی بات نہیں . . ."

جب بتیاں بجھ گئیں۔ اور صرف سٹیج پر تیسرے ایکٹ میں چاندنی کھلی تو ملک صاحب نے آہستہ سے اپنا ہاتھ رشّو کے ہاتھ پر رکھ کر پوچھا . . .

"آپ میرا مطلب سمجھتی ہیں ناں ! ۔ میں چاہتا ہوں کہ جو تکلیف آپ کو ظفر کی وجہ سے ہوئی ہے ۔ لاہور کے قیام میں دوبارہ آپ کو ایسی کوئی تکلیف نہ ہو . . ."

رشّو نے جلدی سے اپنا ہاتھ اٹھا کر ڈمپل کے زانو پر رکھ لیا ۔ اور سر جھکا کر بولی۔

"شکریہ جی . . ."

"میرا مطلب ہے آپ لاہور کی زندگی سے واقف نہیں ۔ میں ظفر کے باپ کی حیثیت سے کہتا ہوں آپکو ایسی پبلک جگہوں پر اسکورٹ کے بغیر نہیں آنا چاہیے۔

راستے کو جب رشّو اور ڈمپل لمبی سیاہ کار میں واپس گھر آئیں تو رشّو کے منہ پر تالا پڑا تھا ۔ بظاہر ملک کی کسی بات پر برا ماننے کا کوئی جواز نہ تھا ۔ پھر بھی اسے کچھ کچھ غصّہ ملک صاحب پر کچھ اپنے آپ پر اور زیادہ ڈمپل پر آ رہا تھا ۔ سونے سے پہلے ڈمپل نے پوچھا ۔

"کیوں کیسا ڈرامہ تھا ۔"

رشّو چپ رہی ۔

"کیوں کیسا ڈرامہ تھا؟"

"اچھا تھا۔۔۔" مری سی آواز میں رشّو نے کہا۔

"ملک صاحب بڑے بھلے آدمی ہیں۔۔"

"ہوں؟۔۔۔ ہاں۔۔۔"

"تم ان سے کچھ اچھی طرح پیش نہیں آتیں۔ کل کلاں کو وہ تمہارے فادر ان لا ہو گئے تو۔۔۔ تو اچھی بات نہیں ہے۔"

غصّے سے رشّو نے آنکھیں نچا کر کہا۔

"ایک بار کان کھول کر سن لو وہ میرے فادر ان لا نہیں ہوں گے۔۔۔ سن لیا۔۔؟"

"ہائے؟ اچھا بھئی تمہارا ذاتی معاملہ ہے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔۔ شب بخیر۔۔"

"شب بخیر۔"

جب ڈمپل بیڈ لیمپ بجھا کر سو گئی تو یکدم رشّو کو اپنے رویّے پر تاسّف ہونے لگا۔ ایسی محسن سے اس قدر بے رخی اور وہ بھی بلا وجہ۔۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو بہت لعنت ملامت کی لیکن اتنی ہمّت نہ پیدا کر سکی کہ اٹھ کر ڈمپل کے پلنگ تک جا سکتی۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہہ سکتی۔

"آئی ایم سوری!"

زندگی بھر رشو میں یہی عیب رہا۔ جب خوب ندامت میں بھیگ جاتی تو اندر ہی اندر کڑھتی لیکن ندامت کے اظہار کا کوئی راستہ نہ نکل سکتا۔ معذرت کا ایک لفظ منہ سے نہ نکلتا۔

بچپن میں اسے بزرگوں کو سلام کرنے سے بڑی شرم آتی تھی۔ ذرا گھر میں کوئی آجاتا تو وہ ٹرنکوں والی کوٹھڑی میں محض اس خوف سے چھپ جاتی کہ کہیں سلام نہ کرنا پڑ جائے۔ اماں اس کی اس عادت سے بہت نالاں تھیں۔ الٹا ایک ایک آدمی کو چار چار بار سلام کرواتیں . . . !

ذرا بڑی ہوئی تو سلام کرنے کی عادت تو رہ گئی لیکن ایک اور گانٹھ پڑ گئی۔ ذرا جو کسی دوست سے بول چال بند ہو جاتی تو مہینوں سلسلۂ کلام منقطع رہتا۔ ذرا سی پھانس مغلئی پھوڑے کی طرح رسنے لگتی۔ اگر ادھر سے صلح کا سفید جھنڈا بلند نہ ہوتا تو ادھر سے لاکھ چاہنے کے باوجود رشو کے لئے دوست کو منانے کی صورت نہ نکلتی۔ ایسا پرت دار حجاب پیدا ہو جاتا جو ہر دن گراونڈ گلاس کی طرح پکا اور اندھا ہوتا جاتا۔

کالج میں آکر بھی یہ عادت نہ گئی۔ وہ دوستوں سے ہمیشہ متفق رہنے کو اسی لئے ترجیح دیتی تھی کہ اگر خدانخواستہ دوست روٹھ گئی تو پھر منائے گا کون؟

ڈمپل گہری نیند سو رہی تھی اور رشو پر گہری ندامت طاری تھی۔ اب ملک صاحب پر بھی غصہ باقی نہ رہا تھا۔ ہائے بھلا انہوں نے کیا کیا ہے۔ ہمدردی

کی ہے مجھے غریب الوطن جان کر اور یہیں خواہ مخواہ جل بھن رہی ہوں اُن پر۔۔
نکتے نتلے اماں کا تازہ ترین خط بھی اسے بھول چکا تھا۔ صرف ڈمپل کا خوف باقی
تھا۔ جو کہیں ڈمپل ناراض ہو گئی تو میں اسے کیسے مناؤں گی؟ بڑی دیر ڈمپل کے
متعلق سوچتی رہی۔ پھر اٹھی بتی جلائی۔ ڈمپل کا لحاف اس کے کٹے ہوئے بالوں
تک کیا۔ اور اپنے پلنگ پر آ بیٹھی۔

شام کو وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔

کتنی معجوب نظروں نے کاسۂ التفات اس کی طرف بڑھایا تھا۔

اس پر ساڑھی واقعی بہت سجتی ہے جسم کا ایک ایک خم اُبھر آتا ہے۔

شام کا میک اپ ابھی تک چہرے پر باقی تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر آئینے
کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں اس کا جسم بہت سڈول نظر آ رہا تھا
رشو نے اپنے بال کھولے اور سٹول پر بیٹھ کر انہیں کنگھی کرنے لگی۔ آج اسے اپنے
کان لمبے نہیں لگ رہے تھے۔ بالوں کے ریشمی کوڑیالے کندھوں پر ساٹن کے
بلاؤز پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر لپ سٹک کی نامعلوم سی لکیر
باقی تھی۔ آنکھوں میں پارے کی سی چمک تھی۔

پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ ڈمپل سے زیادہ خوبصورت ہے اور اگر وہ ڈمپل
کی طرح اپنے وجود کو سینت سنبھال کر رکھتے تو چینی نقش و نگار کی طرح اس کا اثر
بڑا دیرپا اور پریشان کن ہو سکتا ہے۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے یوڈی کولون

کی شیشی اٹھا کر سینے پر چھڑکی - ایک نگاہ ڈمپل پر ڈالی اور کھلے بال چھوڑ کر اپنے پلنگ پر جا بیٹھی -

کہتے ہیں کہ ویسے تو ہندوستان میں ان گنت سانپ ہیں. گوکھرا، کریت، کوڑیالا لیکن مستی کی رت میں گوکھرا جسے انگریز لوگ کوبرا پکارتے ہیں کوڑیالوں کے ساتھ مل جاتے ہیں - اور شنکر چور ناگ جنم لیتے ہیں - پتر راج اور دودھ راج ناگ کی دوغلی نسل سے بھی شنکر چور ناگ جنم لیتے ہیں. ان کے سروں پر عموماً گائے کے کھر کا سا سفید نشان نہیں ہوتا جیسا کہ گوکھرے کے پھن پر ہمیشہ ہوتا ہے - لیکن یہ ناگ اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ ان کی مسموم سانس سے انسانی جسم میں ورم آجاتا ہے - اور ان کی پھنکار سے چرند پرند دور دور بھاگتے ہیں. سردی کی رت میں شنکر چور عموماً دھوپ سینکنے کو اونچے درختوں پر چڑھ کر سو رہتے ہیں جس درخت پر شنکر چور اس طرح بسرام کر رہا ہو - اس کے اوپر پرندوں کے غول شور مچاتے پھرتے ہیں - اور جانوروں کو اپنے شور سے آگاہ کرتے ہیں کہ اس پیڑ پر شنکر چور دھوپ سینکتا ہے - مالدیوی سپیروں کو ایسے ناگ پکڑنے میں بڑی مہارت ہے - اور عموماً اس نسل کے سپیرے سندربن میں شنکر چور پکڑنے جاتے ہیں - سنا ہے کہ سپیرے کی بین سن کر عام طور پر ایسا ناگ پھنکارتا اور غراتا ہے - اول تو اس کی آواز سے بزدل آدمی بھاگ جاتا ہے لیکن اگر مالدیوی سپیرا ہو تو ڈٹا رہتا ہے - ایسے میں سانپ درخت سے اترتا ہے - سپیروں کا کہنا ہے کہ شنکر چور کو پکڑنے کے لئے عموماً تین سپیروں کی ضرورت ہوتی ہے -

ایک وہ جو اس کا سر پکڑے دوسرا دم دبانے کے لئے اور تیسرے کو چاہیئے کہ ترنت ناگ کی کمر دبالے ۔ ورنہ ایسا منہ زور سانپ عموماً ایک ہی جھٹکے میں سر اور دم چھڑا لیتا ہے ۔۔۔۔

اس رات رشتوں کے احساسِ حسن نے ڈمپل کے میک اپ کے سامان کے ساتھ مل کر ایک ایسے شنکر چور کو جنم دیا جس کی پھنکار سے چرند پرند بھاگیں ۔ اور جس کی سانس اتنی مسموم کہ انسانی جسم پر ورم آجائے ۔

اس شنکر چور کا احساس سب سے پہلے ملک صاحب کو ہوا ۔ وہ گھر لوٹے تو ان کے دائیں ہاتھ میں عجیب قسم کی دکھن تھی ۔ جیسے پہلی بار شراب پی کر ہینگ اوور کی گرانی ہو ۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچے تو ظفر کے کمرے کی بتی جل رہی تھی ۔ انہوں نے پہلی بار خواہش کی کہ کاش یہ بتی اس وقت بجھی ہوتی تو بہتر تھا ۔ ان کا معمول تھا کہ بتی جلی دیکھ کر وہ ظفر کے کمرے میں ضرور جاتے ۔ اور ان سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اپنے کمرے میں لوٹتے ۔ ان باتوں کا اثر ان پر ہمیشہ خوشگوار ہوتا تھا ۔ لیکن آج وہ ظفر کے کمرے کی طرف جانے کی ہمت اپنے میں نہ پاتے تھے ۔ پہلے انہوں نے برٹرنڈ رسل پڑھنے کی کوشش کی ۔ پھر سگار جلا کر کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے ۔

تیسری منزل کی تیسری کھڑکی میں رات کا تیسرا پہر آگیا اور نیند اُن سے کوسوں دور تھی !!

ان کے دل میں زندگی اس طرح جاگ اٹھی تھی جیسے سردیاں گذر جانے پر شہد

کی نکھیوں کا چھتہ اچانک جاندار ہو جاتا ہے۔ جیسے قطب شمالی کا سفید ریچھ ایک صبح برف میں سے تھوتھنی نکال کر دیکھتا ہے تو سمندر پر برف کی تہ ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔۔ اور ساری برف میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ اور آہستہ آہستہ سمندر کی سطح سفید نہیں رہتی۔ کالے نیلے سرد پانیوں کا ریلا سفید خشکی کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ ان کے دل میں ایک بار پھر جینے پھولنے پھلنے کی تمنا آرطوس کے شگوفوں کی طرح راتوں رات سر نکال بیٹھی تھی۔

لیکن وہ تو اپنی زندگی ختم کر چکے تھے؟

وہ تو صرف اپنے بچوں میں زندہ تھے۔ اپنے بچوں کی خوشیوں میں عکسِ معکوس بن کر وقت کاٹ رہے تھے۔ ان کی کوئی منزل نہ تھی۔ سب راستے ان کے بچوں کی شاہراہیں تھیں۔

پھر یہ احساس کیسا تھا؟ یہ احساس کیوں تھا؟ اور اگر تھا تو اِس احساس کا علاج کیا تھا؟

انھیں اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ تب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اُن دنوں اُن کی دوستی اپنی جماعت کے ایک ہندو لڑکے مدن سے تھی۔ مدن ان ہندوؤں میں سے تھا جو کہا کرتے ہیں کہ جرمن لوگ ہماری رگ وید کے تین صفحے چرا کر لے گئے اور ان ہی صفحوں کی بدولت ہٹلر نے ہوائی جہاز بنائے بم بنائے۔ کبھی کبھی جب کوئی اسے جھٹلانے کی کوشش کرتا تھا تو مدن بڑی تیکھی آواز میں کہتا،

"کیوں اڑن کھٹولا اور کیا ہے۔ ہوائی جہاز ہی تو ہے۔ ہنومان جی بھلا کس چیز سے لڑے تھے راکھشوں کے ساتھ۔ بموں کے ساتھ اور کیا۔ انہوں نے ساری لنکا نگری کس چیز سے جلائی تھی۔ ڈائنا مائٹ سے اور کیا۔"

رگ وید سے اتنی عقیدت کے باوجود مدن کی دوستی مسجد کے پڑھے ہوئے بختیار سے بہت تھی۔ دونوں اس دور میں جادو اور عورت سے بہت متاثر تھے۔ گو در اصل وہ ایک ہی چیز سے متاثر تھے اور وہ تھی عورت! لیکن جادو بھی ایک زینہ تھا عورت تک پہنچنے کا۔ اس لئے انہیں دونوں سے لگاؤ تھا۔

انہیں دنوں جب وہ شکستہ چینی کو جوڑنے کے لئے بیضۂ مرغ کی سفیدی لئے لئے پھرتے تھے۔ اور کاغذ پر لکھ کر ان حروف کو اڑا دینے اور پھر واپس لانے کی پریکٹس کیا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں ان کی گلی میں بیبو نامی ایک لڑکی آ کر اتری۔ یہ لڑکی میانوالی سے آئی تھی۔ قد بت کسی توی ہیکل سانڈنی کا سا تھا۔ لیکن ان دونوں کو یہ قند کا پتلا نظر آئی۔ دونوں کی ٹھوڑی تک رال ٹپکنے لگی۔

اسی روز بختیار دارچینی کا باریک سفوف روٹی میں ملا کر مسجد کے پچھلی طرف کتوں کو کھلانے نکلا تھا۔ یہ اس کی ساتویں روٹی تھی۔ ہر بار وہ اماں سے روٹی مانگ کر اس میں دارچینی کا سفوف ملاتا۔ اور مسجد کے پچھواڑے چلا جاتا۔ یہاں دو خارش زدہ کتے مستقل طور پر رہائش پذیر تھے۔ وہ کوڑھی روٹی کھا کر پھر پڑ رہتے حالانکہ اسرار الغیوب کی کتاب میں صاف لکھا تھا کہ ایسی روٹی کھاتے ہی کتا بے

اختیار ناچ اٹھتا ہے۔

جس وقت ساتویں روٹی خارش زدہ کتے کھا کر ایک دوسرے پر تھوتھنی رکھے لیٹ گئے تو مدن گلی کی طرف سے برآمد ہوا۔ بختیار کا موڈ ہڑتال پر آمادہ تھا۔

"چلو، ابھی چلو۔"

"تمہاری ساری کتابیں مجھوڑی ہیں۔ کیا رگ دید کیا اسرار المنود۔۔۔"

"بکو مت۔۔"

"سات روٹیاں کھا چکے ہیں اور کم بخت ایک بھی نہیں ناچا۔"

"ادھر شیخ جی کے چوبارے میں ایک لڑکی آئی ہے۔"

"لڑکی؟"

"ہاں گوری چٹی۔ ناک میں بڑی سی کیل ہے اور کچھ اور طرح بولتی ہے پنجابی دب دب کر کے۔"

"ہم تو ادھر نہیں جا سکتے۔۔"

یک دم مدن کا چہرہ بھی اتر گیا۔ ابھی چند دن ہوئے انہوں نے شیخ جی کے ریشمی تانگے کے گھوڑے کی چال اپنے تجربوں سے سست کی تھی۔ سارے محلے میں ابھی تک اس کا چرچا عام تھا۔ اور گھر والوں نے انہیں شیخ جی کے مکان کی طرف جانے کی ممانعت کر رکھی تھی۔

"ہمارے گھر سے چوبارہ تو نظر آتا ہے۔۔۔ ہے نا؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے . . . چلو تمہارے چوبارے پر چلیں . . ."

مدن اور بختیار پتنگ اڑانے کے بہانے دوسری منزل پر پہنچے تو شیخ . . کے چوبارے میں میانوالی کی بیبو بیٹھی لکڑی کی چھوٹی کنگھی سر میں پھیر رہی تھی کبھی کبھی وہ انگوٹھے کے ناخن آپس میں ملا کر دبا بھی دیتی۔

"اس کے تو شاید جوئیں ہیں سر میں۔" بختیار نے ڈر کر کہا۔

"جوئیں؟ . . . واہ! اتنی خوبصورت لڑکی کے سر میں جوئیں کیسے ہو سکتی ہیں؟"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے . . ."

سوچ کر بات کیا کرو . . ."

بیبو ماتھے پر گھسیٹ کر کنگھی پھیرتی اور جوئیں مارتی رہی۔ یہاں اٹھ پر نو بجنے کا مشغلہ رہا۔ پھر بختیار اور مدن بھاگ جا کر جو آئینہ نیچے سے لے آئے۔ اب مسلسل بیبو پر سورج کا عکس ڈالنے کی مشق ہونے لگی۔

"مجھے دے آئینہ . . ."

"مجھے دے آئینہ . . . تم تو مٹی پہ عکس ڈال رہے ہو۔"

"تمہیں کیا پتہ ہے۔ یہ پنپال جنتر کی طرح مشکل کام ہے۔ لا مجھے دے آئینہ . . ."

آپس میں بلیوں کی طرح جھگڑ جھگڑ کر جب آخر بیبو نامی لڑکی پر عکس بھی پڑا تو وہ سانڈنی یک دم بپھری۔ چھوٹی سی تیل کی کٹوری، کنگھی اور دری اٹھا کر اندر چلی گئی۔ اس دن کے بعد اس نے کوٹھے پر آنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن مدن موہن بڑا گنیا مجبر قسم کا لڑکا

تھا۔

"اس کا باپ یہاں گھی بیچنے آیا ہے۔"

"میاں والی سے یہاں گھی بیچنے آیا ہے؟"

"ہاں۔ کوئی حرج ہے اس میں۔۔۔"

"تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے معلوم ہو جاتا ہے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔"

کچھ دن کے بعد جب مدن کافی معلومات لے آیا۔ اور انہیں معلوم ہو گیا کہ بیبو کی اس محلے میں ایک چھوٹی سی سہیلی بن چکی ہے جس کی وساطت سے نامہ و پیام بھی جاری ہو سکتے ہیں تو ایک دن دوسری منزل کی برساتی میں بیٹھ کر مدن اور بختیار نے سنبل سفید، گیرو، رومی مصطگی ہموزن لے کر علیحدہ علیحدہ سرمہ کی طرح پیسی، اور پھر اس کی لاجوردی سیاہی بنا کر ایک محبت نامہ دونوں کی طرف سے لکھا۔

اس محبت نامے کو پہنچانے سے پہلے انہیں معلوم ہوا کہ میانوالی کی بیبو کا باپ بہت سخت گیر، وحشی، بد و ستم کا آدمی ہے۔ اور اونٹ کٹارے کی طرح سخت جان بھی ہے۔ اسی لئے پہلے انہوں نے چار آنے کا لالچ دے کر منی کو خط پہنچانے پر آمادہ کیا اور آٹھ آنے دے کر خط واپس لیا۔

اس خط کو واپس لینے کے بعد کئی دن یہی فکر رہی کہ نامہ پہنچائیں تو کیسے۔ بالآخر مدن ہی کہیں سے نسخہ لایا۔ اب گل سرخ کے عرق سے نامہ لکھا گیا۔ سو لکھنے پر حروف

نفعی بھائی نہ دیتے تھے۔ اس طرح سادہ خط منّی کے ہاتھ ببو کو بھیجا گیا۔ ادھر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ تو دوسرے عرق لیموں میں پھٹکڑی حل کر کے خط لکھا۔ حروف پھر غائب ہو گئے اور سادہ ورق بمع چار آنے منّی کے حوالے کئے گئے۔

اسی طرح جب پورا ماہ ادھر سے سادہ صفحے جاتے رہے اور ادھر سے ماتھے تک ہاتھ بھی نہ آیا تو ایک دن مدن بولا۔۔۔

"اب میں سمجھا کہ وہ جواب کیوں نہیں دیتی۔"

"کیا مطلب ؟"

"اسے سادہ کاغذ ملتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ پھر؟۔۔۔"

"اور وہ حروف واپس لانے کا طریقہ نہیں جانتی۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو سوچا ہی نہ تھا۔"

"کاش کسی طرح اس کو بتا سکتے کہ۔۔۔ کاغذ کو آگ دکھانے پر تمام حروف باہر نکل آئیں گے۔"

"پھر اب کیا کریں۔۔۔"

"پر کہیں وہ ہمارے خط جلا کر پڑھتی تو حروف نظر آتے۔"

"ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں اُسے۔"

"جو خط ہم نے آب نارنج سے لکھا تھا اسے اگر وہ دھوپ میں رکھ دیتی تو

بھی پڑھ سکتی تھی ہمارا خط۔"

"تو پھر تم نے نسخہ لکھا کیوں نہیں۔"

"چپ کرو۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں خواہ مخواہ بولتے جاتے ہو۔"

بختیار چپ ہو رہا لیکن سوچ وہ بھی رہا تھا۔ اگلا خط اس نے منّی کی وساطت سے جو بھیجا تو اس میں حروف واپس لانے کے جملہ نسخے رقم تھے۔ اور چونکہ یہ خط صرف بختیار کی طرف سے تھا۔ اس لیے جب میانوالی کے اونٹ کٹارے کو حروف واپس لانے کی ترکیب معلوم ہو گئی تو اس نے خوب خوب خطوں کو آگ دکھائی اور وہ راز جو بیبو تک نہ پہنچ پایا تھا جناب گھی بیچنے والے کو معلوم ہو گیا۔ اور بختیار کی وہ گت بنی کہ اس کے بعد وہ بے حد گھنّا لڑکا بن گیا۔

اب اسے علم تسخیر، جادو، کششِ جسمانی، اوروں کی نظروں سے خود کو غائب کر لینا، موکّل کے توسّط سے سب کو دیکھتے رہنا۔ اور خود نظروں سے اوجھل رہنا، جنّات پر قابو، مسمریزم وغیرہ کا چسکا پڑ گیا۔ مدن موہن بہت بعد تک ڈینگیں مارتا رہا کہ اس کے تعلقات بیبو سے ہو چکے ہیں۔ لیکن بختیار کا اب اس کے ساتھ ایسی باتوں میں ساجھا نہ رہا تھا۔ اس کا اعتقاد رگ وید اور اسرار الہنود سے یکسر اُٹھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مدن موہن وہ رشی منی ہے جو زبانی شیشے چباتا ہے۔ انگاروں پر چلتا ہے۔ کڑھائی سے بھُنے ہوئے تیتر اڑا دیتا ہے۔۔۔ اندھیرے کمرے میں دیگ روشن کر دیتا ہے۔ لیکن جاتے ہوئے جیسے دو ردٹیاں

بہت کافی ہوتی ہیں۔ اور جس کا علم خود اس کا جسم بھی پالنے کے لئے کافی نہیں۔
بختیار اپنے کمرے میں گھنٹوں ایک نکتے پر آنکھیں مرکوز رکھتا اور اپنے میں قوتِ تسخیر پیدا کرتا۔ کئی موہنی تنتر، کئی عمل، کئی وظیفے اس نے چوری چوری کئے لیکن گیدڑ میں شبیر کی جوان مردی پیدا نہ ہوئی۔ یہ سبق انہوں نے زندگی میں بہت جلد سیکھ لیا کہ کچھ لوگوں سے عورتیں صرف اس لئے محبت کرتی ہیں کہ وہ مسمریزم نہیں جانتے، ۔ ۔ ۔ ۔ اور کچھ لوگوں سے عورتیں اس لئے محبت نہیں کرتیں کہ وہ مسمریزم جانتے ہیں !!

عورتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا انہوں نے ایک دوسرا طریقہ نکال لیا تھا اس طریقے کے تحت مرد کا امیر ہونا بہت ضروری تھا۔

لیکن یہ تو بہت پہلے کی باتیں تھیں ۔ ۔ ۔ جب ملک صاحب جوان تھے۔
اتنے سال برف کے نیچے دبے رہنے کے باعث اب ان کے اعضا یخ ہو چکے تھے ۔ ۔ ۔ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایسی یخ بستہ حالت میں زندگی سب سے پہلے کس عضو سے پھوٹتی ہے۔ احیائے زندگی کا وعدہ مردہ لاش سے کیوں کیا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

وہ اپنے ماضی کو کھنگال رہے تھے۔

اپنی شادی شدہ زندگی کے لاشے سے سوئیاں نکال رہے تھے۔

وہ اپنی زندگی کے ستوپا سے نکل کر باہر کی کھلی فضا میں آ بیٹھے تھے اور جو

چیز سب سے پہلے انہیں نظر آئی تھی وہ ایک شنکر چور ناگ تھا۔ جس کے ماتھے پر گائے کے کھُر کا سا سفید نشان نہیں تھا۔ یہ شنکر چور برگد کے پیڑ پر چڑھا دھوپ سینک رہا تھا اور وہ ایسے گوکھرے اور ایسے کوڑیالے کا کوئی منتر نہ جانتے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مالدیوی سپیرے ایسے سانپ کو پکڑنے کے لئے گروہ کی صورت میں نکلتے ہیں.... مدن بہت دور رہ گیا تھا۔ اور وہ پھنکارتے سانپ سے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔

جب سورج کی پہلی کرنیں کھڑکی میں داخل ہوئیں تو وہ مختلف بنکوں کی کاپیاں، پے ان سلپیں اور چیک بکس سامنے لئے بیٹھے تھے.... انہیں بس اب ایک ہی منتر یاد رہ گیا تھا۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک عورت تھی جس کو اپنے شوہر سے بدرجۂ غایت محبت تھی۔ لیکن شوہر کو نہایت نفرت۔ ہر طرح کی تدبیریں کیں لیکن کوئی کارگر نہ ہوئی۔ اس نے سنا کہ مدینۂ منورہ میں ایک عورت بڑی ساحرہ ہے۔ ناچار اس کے پاس گئی۔ اور اپنا دردِ دل ظاہر کیا۔ اس نے کہا کہ اچھا میں تجھے سلطان الساحرین کے پاس لئے چلتی ہوں وہ کچھ علاج معقول کرے گا۔ رات کے وقت دونوں مدینۂ طیبہ سے باہر نکلیں۔ دیکھا کہ دو جانور سیاہ رنگ گدھے کے برابر کھڑے ہیں۔ دونوں سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ آناً فاناً میں ملک عراق کے اندر چاہ بابل کے کنارے جا اتریں۔ جہاں

ہاروت ماروت آویختہ ہیں ۔ وہ ساحرہ کنوئیں کے اندر گئی اور اپنے ساتھ والی کی سفارش
کی ۔ وہ دونوں سیدھے ہوکر بیٹھ گئے ۔ اور کہا کہ بلاؤ ۔۔۔ عورت گئی اور اپنا ماجرا بیان
کیا ۔ پہلے تو اس کو سمجھایا کہ تو جادو نہ سیکھ ۔ اہل اسلام کو یہ بات زیبا نہیں ۔ مگر اس عورت
نے اصرار کیا ۔ ہاروت و ماروت نے کہا خیر تیری خوشی ۔ باہر ایک تنور ہے جا اور
اس میں پیشاب کر ! وہ عورت گئی اور یونہی بیٹھ کر چلی آئی ۔ پیشاب نہ کیا ۔ واپس آئی
تو پوچھا کہ کیا دیکھا ۔ اس نے کہا کچھ بھی نہیں ۔ انہوں نے کہا معلوم ہوتا ہے تو نے
پیشاب نہیں کیا ۔ پھر جا اور پیشاب کر !

اس نے دوسری بار بھی ایسا ہی کیا ۔ تب فرشتوں نے کہا کہ
جب تک پیشاب نہ کرے گی مطلب حاصل نہ ہوگا ۔ ناچار تیسری بار اس نے پیشاب
کیا اور دیکھا کہ ایک سفید چیز جسم کے اندر سے نکلی اور ایک سیاہ چیز داخل ہوگئی ۔
ان سے کیفیت بیان کی تو کہا جا اب تو پوری ساحرہ ہوگئی ۔ جس طرح گئی تھیں اسی
طرح رخصت ہوکر واپس چلیں ۔ لیکن اس عورت کا تردد نہ گیا ۔ پہلی ساحرہ نے پوچھا
کہ اب کس لئے پریشان ہے ۔ اس نے کہا کہ مجھ کو تشفی و اطمینان کیا خاک ہو نہ کوئی تجربہ
نہ منتر نہ پڑھنت نہ تعلیم و تلقین ۔ میں تو جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہوں ۔ اس
نے کہا کہ یہاں پڑھنے پڑھانے کی کچھ حاجت نہیں ۔ شاید تجھ کو اپنی سحر آموزی پر یقین
نہیں ہوا ۔ ذرا اس درخت کی طرف جو سامنے ہے بنظر غضب دیکھ ۔ اس نے
جو دیکھا تو درخت فی الفور خشک ہوگیا ۔ پھر کہا کہ اب بنظر رحمت دیکھ ۔ رحمت کی نظر

ڈالی تو معاً ہی سرسبز ہوگیا۔ کہا کہ اب بھی تجھے یقین آیا یا نہیں۔ بس تیرے ارادے پر موقوف ہے۔ جو چاہے گی وہ وہ ہو جائے گا۔ تب اس عورت کو اطمینان ہوگیا۔ گھر میں آئی۔ شوہر کو منتظرِ محبت دیکھا اسی دم مطیع فرمان ہوگیا۔

کہتے ہیں کہ اِس زمانے میں وہ کالی چیز سونے کی بن چکی ہے جس کے تن کے اندر یہ روپہلی چیز داخل ہو جاتے وہی ساحر اور اگر وہ ارادہ کرے تو ہر شخص اس کا مطیع فرمان بھی ہو جاتا ہے۔ ملک صاحب نے بھی نہ کوئی منتر جنتر پڑھے نہ پڑھنت نہ تعلیم و تلقین۔۔۔ بس کامل ساحر ہو گئے۔

رفتہ رفتہ ان کی ساحری کے چرچے کالج کے لیڈیز روم میں پہنچے۔

ایک روز جب ڈمپل اور رشو کالج نہ آئی تھیں تو چائے کارڈے سامنے سجا کر سائیکلوجی ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں نے خوب خوب بخیے ادھیڑے۔

"ڈمپل کی صحبت میں بالکل ڈمپل جیسی ہو گئی ہے۔" گلنار نے کہا۔

"وہی لباس وہی بول چال۔۔۔" ظ نے کہا۔

"کرسمس کی چھٹیوں تک بالکل خیر تھی۔ یہ کچھ سکستھ ایئر ہی موافق نہیں آیا انہیں"

"خدا قسم دیکھ کر شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہی لڑکی ہے۔" طیبہ بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو یہ سکستھ ایئر کا اثر ہے سارا۔۔۔"

"ڈمپل کا بھی اثر ہے وہ تو بارود ہے پورا۔۔"

"بیچاری کی ماں بہاولپور میں سمجھتی ہوگی کہ بیٹی صاحبہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں یہاں

فیشن کا مکتب کھلا ہے۔" ط نے کہا۔

"یہ باہر کی لڑکیوں کو پر بھی زیادہ لگ جاتے ہیں لاہور والیوں کی نسبت۔"

"میں تو حیران ہوں کہ آخر اتنے مہنگے کپڑے آتے کہاں سے ہوں گے؟"

"سنا ہے کہ اس کے انکل بہت امیر ہیں۔" طیبہ نے روشنی ڈالی۔

"کونسے انکل؟" گلنار نے سوال کیا۔

"وہ اس دن نہیں آئے تھے سیاہ مرسڈیز میں ... بالکل قائداعظم کی طرح رعب والے، ویسا ہی قد..."

"ہائے اللہ! کاش ہمارا بھی کوئی انکل اتنا امیر ہوتا!" ظ بولی۔

"ہائے کاش!" ط نے کہا۔

"واقعی..." گلنار بولی۔

"اور کیا۔ ہائے کاش!" طیبہ سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

رشو پر تبصرہ بہت جلد اپنے حالات کا تبصرہ بن گیا۔ اور ان کو بھول گیا کہ رشو کو لاہور نے کس قدر ملوث کر دیا ہے۔

لیکن ظفر کی حالت اس پن ڈبے جیسی ہو چکی تھی جسے یکدم معلوم ہو کر وہ دمے کا مریض ہے۔ اور اب پانی میں اترنا اس کے لئے خطرے سے خالی نہیں۔ اپنے باپ سے کیا ہوا عہد اسے قبر کی سل بن کر دباتا تھا۔ ادھر رشو قوس قزح کی طرح

ان لوگوں میں سے تھا جو ہر جذبے میں شدت کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ تن من دھن سے رشو کا ہو چکا تھا۔ بار بار اپنا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ اب وہ زندگی بھر رشو کا رہے گا۔ اور کوئی چیز، کوئی واقعہ، کوئی فعل اس کے جذبات میں کمی واقع نہ کر سکے گا۔

کسی بڑی امریکن کار کی پچھلی بتیوں جیسی عینکیں چہرے پر لگائے ٹیڈی پیسے جتنی باریک ہیلوں والے جوتے پہنے چست قمیص میں جب وہ چینی عورتوں کی طرح چلتی آتی تو ظفر کا دل یکدم بند ہو جاتا۔ خدا جانے یہ رشو کا رعب حسن تھا جو جلا پا کر خیرہ کن ہو چکا تھا یا اپنے باپ سے کیا ہوا وعدہ تھا کہ ظفر نے ایک بار بھی رشو سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔

کالج میں وہ رشو اور ڈمپل کے عین پیچھے بیٹھنے کا عادی تھا۔ یہی گھنٹے جو وہ کلاس میں ان کی پشت پر بیٹھ کر گزارتا اس کا سرمایہ حیات تھے۔ اپنے آپ پر ایک پابندی لگانے سے اس میں ایک طرح کی صبر آزما قناعت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ رشو کو خط تو نہ لکھ سکتا تھا۔ اس سے بات نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس خوشبو میں سانس تو لے سکتا تھا جو رشو سے اٹھتی تھی۔ وہ ان بالوں کو تو دیکھ سکتا تھا جو سر پر بناتے ہوئے بڑے سے جوڑے میں سے نکل کر گردن پر آ لٹکتے تھے۔ وہ ان کندھوں پر تو نگاہیں مرکوز کر سکتا تھا۔ جو کھلے گلے سے نظر آتے تھے۔ جو سنگ مرمر کی طرح سفید اور ہاتھی دانت کی طرح چکنے تھے۔

رفتہ رفتہ ظفر کو اپنی قناعت سے اپنے ضبط سے پیار ہونے لگا۔

وہ کالج کی رشنو کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر تیسری منزل میں پہنچتا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر سوچتا۔۔۔ صرف چند ماہ کی تو بات ہے۔

صرف امتحانوں تک ہی کی تو شرط ہے۔

اور لاد کو ہٹ دھرمی سے نہیں سر جھکا کر اپنی خواہشیں منوانا چاہئیں۔ اولاد وہی حلالی ہے جو والدین سے لڑ جھگڑ کر اپنی منزل کی طرف نہ بڑھے بلکہ اپنی سعادتمندی سے اپنی فرمانبرداری سے انہیں بھی شریک سفر کرے۔ اس کے دل میں باپ کے خلاف ایک بچھو کا ڈنگ چھپا ہوا تھا۔ لیکن وہ اس بچھو کے ڈنگ پر اپنی سعادت مندی اپنی فرمانبرداری اپنی شرافت کا ڈھکنا لگائے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بھی اعتراف کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کا ایک حصہ۔۔۔ اس کے اندر اس کی انا کا ایک ہزار واں ٹکڑا اپنے باپ سے نفرت کرتا ہے۔

جوانی کی محبت کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ اور وہ ہے بسنت کا زرد رنگ!

یہ زرد رنگ کبھی زعفرانی ہو جاتا ہے اور کبھی کیسری۔ لیکن بنیاد اس کی ہمیشہ زرد رنگ پر ہوتی ہے۔ اس میں مبتلا ہو جانے والے سرسوں کے پھولوں کی طرح شگفتہ مگر زرد رہتے ہیں۔ ان کی بہار املتاش کے پھولوں کی طرح گرمیوں کی خاموش دوپہروں میں کوئل کی کوک سے جاگتی ہے۔ وہ لکھنؤ کے مسطر کی طرح زرد، چکنے اور ہلدی رنگے ہوتے ہیں اور ان کا نفس مضمون بڑا بے رونق ہوتا ہے۔ لکھوری کی کتابت کی مانند۔۔۔

جوانی میں محبت میں اندر اور باہر کا ایک رنگ ہوتا ہے ... جون کی دھوپ کا زرد رنگ .... سہل انگار اس دھوپ سے ڈر کر ماں باپ کی چھاؤں میں جا لیٹتے ہیں لیکن ظفر سہل انگار نہ تھا۔ اس کے ارد گرد ایک دن کے چوزے کی زردی کھنڈی تھی اور وہ اکیلا ہی اپنی محبت کے یرقان میں مبتلا چلا جا رہا تھا۔ نہ اس نے رشوّ سے رحم کی التجا کی نہ اس نے اپنے باپ سے وعدہ توڑ ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا وہ تو اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب بیج خود سیاہ مٹی کا سینہ چیر کر باہر آنکلتا ہے وہ تو اس لمحے کا منتظر تھا جب رشو کو خود چل کر اس کے پاس آنا تھا۔

تب تک ساری کائنات زرد تھی اور وہ گیروا رنگا لباس پہنے کپل وستو کے سدھارتھ کی طرح زرد زندگی بسر کر رہا تھا۔ کالج سے گھر اور گھر سے کالج.... اِن دو جگہوں سے تھک کر کبھی کبھار وہ ہوسٹل میں غازی کے پاس چلا جاتا۔ اس لئے نہیں کہ غازی اس کا دوست تھا بلکہ صرف اس لئے کہ غازی بھی اس کی طرح ایک زرد جزیرے میں رہتا تھا۔

سب سے پہلے غازی نے ہی ظفر کو بتایا کہ ملک صاحب کی کار میں اس نے رشوّ اور ڈمپل کو شاپنگ کرتے دیکھا تھا۔ یہ اطلاع اس نے کمال سادگی سے دی تھی...

"مبارک ہو یار ظفر" غازی نے کہا۔

"کیسی مبارک ؟"

"ہمیں تو گلنار نصیب نہیں ہوگی لیکن تمہارا تو کام بن گیا۔"

"کیسا کام ؟ کیا کہہ رہے ہو ؟ . ."

"اب ہم سے چھپا رہے ہو ۔ یہ اچھی بات نہیں ہے ۔ ہم تو تمہیں گلنار کے کوٹھے پر لے گئے اور تم ہم سے اپنے تعلقات چھپا رہے ہو۔"

"کیسے تعلقات ؟ کس کے تعلقات ؟"

"تمہاری کار میں پرسوں یعنی بروز جمعرات شام کو ساڑھے سات بجے انار کلی میں کون تھا۔"

"کون تھا ؟"

"اب اس قدر بھولے بھی نہ بنو ۔ میں بھلا کسی کو بتا تھوڑی دوں گا . . ."

"کمال کر رہے ہو ۔ اگر کوئی تھا تو مجھے معلوم نہیں۔"

کچھ محجوب کچھ پریشان ہو کر غازی نے کہا ۔

"بھئی میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے بخشی مارکیٹ کے اندر جہاں بچوں کے کھلونوں کی دوکانیں ہیں عین وہاں تمہاری کار کھڑی تھی ۔ ڈمپل اور رشو بیچ میں بیٹھی ڈگگھیاں بٹن خرید رہی تھیں امرا کی خواتین کی طرح . . ."

"ڈمپل اور رشو ! ہماری کار میں ؟"

"تمہاری کار کا نمبر بہتر باسٹھ ہے ناں . . ."

"یہی نمبر ہے۔"

"تو پھر... وہی کار تھی اور وہی دو نوں تھیں۔"

"اور ساتھ کون تھا؟"

"ملک صاحب تھے... تمہارے آباجی۔ تو بھلا میں انہیں نہیں پہچانتا۔ ہر ملک کی وہی صورت ہوتی ہے۔ کیا میرے آباجی کیا تمہارے آباجی۔ وہی پچکے ہوئے جبڑے وہی بے مہر یونانی چہرہ۔ وہی قد۔"

ظفر خاموش ہو گیا۔ اس کے ارد گرد کی فضا گہری بسنتی ہو گئی۔

"تم چپ کیوں ہو گئے...؟" غازی نے سوال کیا۔

"بس ایسے ہی سوچ رہا ہوں۔"

"یعنی کیا؟"

"تمہارے اور گلنار کی بابت۔"

غازی نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ اور آہستہ سے بولا۔

"ہمارے متعلق سوچنا چھوڑ دو۔"

"کیوں؟"

"ہماری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔"

"ہو چکا ہے؟ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔"

"کچھ باتیں بتانے سے انکی تکلیف کم نہیں ہوتی..."

"پھر..."

"کچھ نہیں . . . گلنار نے شادی کر لی"

"شادی کر لی ؟ . . . کس سے ؟ . . . کیوں . . . کہاں ؟ . . ." ظفر کو چند لمحوں کے لئے "رشتو" بالکل بھول گئی۔

"بس شادی کر لی ۔ کرنے والوں سے . . ."

"کچھ بتاؤ تو سہی . . . یار . . . وہ . . . تو . . . وہ تو تم سے محبت کرتی تھی"

"ہاں . . . اور کرتی ہے اب بھی . . ."

"پھر اس نے . . . شادی کیوں کر لی کسی اور سے . . ."

غازی نے اس بات کا بڑی دیر تک کوئی جواب نہ دیا۔ کھڑکی میں کھڑا وہ ان لڑکوں کو دیکھتا رہا جو لان میں ٹینس کھیل رہے تھے۔

"کیسے ، کیسے ، کیسے ؟"

"ہیرا منڈی کے اپنے اصول ہیں یار ! وہاں کی سائیکلوجی سمجھنا ہو تو پہلے اپنی ساری سائیکلوجی گھر چھوڑ کر جانا پڑتی ہے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"گلنار مجھ سے محبت کرتی ہے ۔ اس لئے وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی ۔ یہ وہاں کی سائیکلوجی ہے۔"

"کیا ؟"

"سوال مت کرو مجھ سے . . . میں . . . تمہیں کچھ بتانا نہیں چاہتا۔"

لیکن جب ظفر خاموشی سے سگریٹ پینے لگا تو غازی خود ہی آہستہ آہستہ بولنے لگا... جیسے بھری گرمی کی دوپہر میں املتاش کے پھول جھڑ رہے ہوں۔

"میں نے کئی دفعہ پہلے بھی اسے گلنار کے کوٹھے پر دیکھا تھا۔ جس طرح ہزارے کے پٹھان ہوتے ہیں۔ اونچا لمبا قد، سرخی مائل رنگ... لیکن وہ موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ اس کی سیاہ واسکٹ میں چھوٹی سی توند بھی نظر آتی تھی۔ جب بھی وہ گلنار کے کوٹھے پر آتا تو اپنی سفید پگڑی کے لڑ سے منہ ڈھانپے ہوتا۔ اسے گلنار سے بڑی محبت تھی۔ کینوس کے تھیلے میں نوٹ بھر بھر کر لایا کرتا تھا وہ...."

"کیا نام تھا اس کا..."

"صاحب خان..."

"بڑا خوبصورت نام ہے۔"

"کسی زمانے میں خود بھی بہت خوبصورت ہوگا۔ اب تو صرف قدبُت کے سرپر خوبصورت لگتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے گلنار کا مجرا جاری تھا۔ میں بھی گیا ہوا تھا گلنار بار بار میری طرف آتی تھی۔ صاحب خان نے سو سو روپے کا نوٹ منہ میں لے کر گلنار کو اشارہ کیا۔ لیکن وہ ادھر نہ گئی... نہ جانے کیوں گلنار صاحب خان سے اس قدر چڑتی تھی۔ جتنا وہ اس کے پیروں تلے ہاتھ رکھتا اسی قدر وہ چونکیل چھتے کی طرح بھڑکتی..."

"بہت زیادہ عمر تھی اس کی؟"

"چالیس پینتالیس سے زیادہ نہ ہو گی لیکن گلنار کی نفرت کی وجہ یہ نہ تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتی تھی۔ غازی ان کوٹھوں کا اور ہی حساب ہے۔ جن سے ہم پیار کرتے ہیں انہیں کوٹھے پر چڑھنے نہیں دیتے۔ اور . . . اور جو کینوس کے تھیلے میں نوٹ لاتے ہیں ان کی ہر طرح ناز برداری ہوتی ہے . . ."

"لیکن بی بی جی تمہاری تو بہت خاطر مدارات کرتی تھیں . . . یاد ہے انہوں نے مجھے بھی بیڑے کھلائے تھے۔"

"کیونکہ ان کا اپنی بیٹی سے خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا۔"

"کیسا معاہدہ۔"

"گلنار ان سے وعدہ کر چکی تھی کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔"

"لیکن یہ وعدہ کس لئے . . . آخر؟"

"تم اتنے سوال پوچھو گے تو مجھے بھی یاد نہیں رہے گا کہ کس بات کا جواب کس دن سے شروع ہوتا ہے۔"

ظفر نے نیا سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لئے تو غازی نے اپنی داستان جاری کی . . .

"وہ کلا بھٹ سے آیا کرتا تھا۔ کینوس کے تھیلے میں نوٹ لے کر . . . ایک موتیے کا ہار گلنار کے گلے میں ڈالنے کے لئے اس نے بی بی جی کو ڈھائی ہزار روپے دیئے تھے . . . اس کی محبت دیکھ کر کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا تھا اپنی محبت پر . . ."

"کیا مطلب؟"

"جو شیفتگی اس کی نظروں میں ہوتی۔ جس طرح وہ گلنار کی فرمائشیں پوری کرتا جیسے وہ بی بی جی کے اشاروں پر ناچتا۔ اس کی وارفتگی دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے مجھے گلنار سے محبت نہیں ہے۔ گلنار کے ایک ادنیٰ اشارے پر وہ ہزاروں خرچ کرتا اور خوش ہوتا۔"

"جوان کے پاس دینے کو سوائے دل کے اور کچھ نہیں ہوتا۔۔ غازی!۔۔۔ جب بوڑھا آدمی دل نہیں دے سکتا تو وہ دولت کا دِل بنا کر پیش کرتا ہے۔"

"یہی گلنار کہتی تھی۔"

"کیا؟"

"کلاچھٹ جانے سے پہلے وہ مجھے ملی تھی۔ کہنے لگی۔ غازی! ہمارے پیشے کی عورتیں اوّل و آخر اسی بازار میں آتی ہیں۔ جب صاحب خان مجھے اس بازار میں واپس چھوڑ جائیگا تو مجھے ملنے آنا۔۔۔ میں نے اس کی کلائیاں پکڑ کر کہا تو پھر تم کیوں جا رہی ہو اس کے ساتھ۔۔۔ وہ رونے لگی۔۔۔ تم نے گلنار کو دیکھا ہے دیکھا ہے ناں؟ جب وہ روتی ہے تو دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔۔۔ یہ لاہور ہڑپے کی صورت ویران ہو جاتا ہے۔ آسمان سے زمین تک زرد آندھی چلنے لگتی ہے۔"

ظفو اور غازی دیر تک آہیں بھرتے رہے۔

"تم نہ جاؤ گلنار .... نہ جاؤ مجھے مجھے .. چھوڑ کر نہ جاؤ گلنار .....
بڑی دیر رو چکنے کے بعد وہ بولی ... کیسے نہ جاؤں ؟ غازی ! میں چار بار دلہن
بن چکی ہوں - ہر بار مجھے کنواری بنا کر نوچی بنا کر یہ لوگ میرا نکاح کرتے ہیں ....
چار مرتبہ میرا نکاح ہو چکا ہے . اور پھر بھی میں پیشہ کرتی ہوں - میں اس رسوائی سے
اس ذلّت سے تھک گئی ہوں . گلنار .... تو چلو .. میرے ساتھ چلو گلنار !
ہم .... یہاں سے کہیں دور چلے جائیں گے .. تو وہ نہیں مانی پھر ..."
" طوائف زادی کسی کے کہنے سے کبھی کچھ نہیں کرتی . کہنے لگی - روز روز کے
نت نئے گاہک کے ساتھ گناہ کرتے دکھ ہوتا ہے غازی ! مجھے کلا پھٹ چلے جانے
دو - وہ مجھ سے محبّت کرتا ہے - میں نے گلنار کے پاؤں پکڑ لیے اور اس کی بہت
منتیں کیں - میں نے اسے ہر طرح منایا لیکن وہ مانی نہیں ."
کمرے میں عرصہ تک خاموشی چھائی رہی جیسے وہ دونوں گلنار کو منانے میں
مشغول ہوں ..
"جب میں اٹھنے لگا تو وہ پچھلی طرف سے آئی . اور میری پیٹھ سے سر جوڑ کر
بولی - دیکھتے نہیں سارا بازار ان عورتوں سے بھرا پڑا ہے . جو ہیرا منڈی سے
اٹھ کر شہر کی طرف گئی تھیں . دیکھتے نہیں سارے بازار میں ان عورتوں کی تعداد
زیادہ ہے جن کے نکاح ہو چکے ہیں - دیکھتے نہیں یہاں ان عورتوں کی بھرمار ہے .
جو محبّت کی خاطر بازار سے نکلیں ، گھر سے نکلیں اور پھر جوتیاں کھا کر واپس آئیں .....

میں نے پلٹ کر اس کا سر ہاتھوں میں لے لیا... "تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

کمرے میں زرد آہیں دھند کی طرح چھا گئیں۔

"ہے.... بہت ہے اسی لئے تو میں اس اعتبار کو آزما نہیں سکتی... میں...
اپنی محبت کو، تمہاری محبت کو آزمائش کی کٹھالی میں ڈال نہیں سکتی۔ غازی! کچھ تو ایسا
بھی میرے پاس رہنے دو جو ٹوٹا ہوا نہ ہو۔"

"وہ چلی گئی پھر..."

"کلا چھٹ جانے سے پہلے وہ مجھے ملنے کالج آئی تھی.... پہلی اور آخری بار
ہم دیر تک بنچ پر بیٹھے رہے۔ ہمارے دل پتھریلی بنچ کی سطح سے بھی ٹھنڈے تھے،
جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا، غازی! بی بی کی طرف بھی تو دیکھو.... وہ ملیر
کوٹلے چلی گئی تھیں۔ شادی کر کے وہاں ان کے تین بیٹے ہوئے.... اور پھر وہ
تینوں بیٹے اشراف کے ہو گئے اور بی بی طوائف رہ گئیں۔ چھڑی طوائف....
سات سال بیاہتا رہ کر بازار میں لوٹ آئیں بی بی! جن سے ہم نفرت کرتے ہیں
ان کے ساتھ سونے کی ہمیں کبھی معافی نہیں ملتی۔ کبھی معافی نہیں ملتی۔ کبھی معافی نہیں
ملتی..."

ظفو نے لمبا سا زرد دھواں چھوڑ دیا۔

"جب سات سال کی شادی شدہ زندگی گذارنے کے بعد... تین بیٹے جننے
کے بعد میں بازار میں آؤنگی.... تو کم از کم مجھے ایک سکون ضرور ہوگا غازی!

..... کیسا سکون؟ میں نے پوچھا۔ وہ یہ سکون یہ ہے کہ میں تمہاری بیوی نہیں تھی، تم نے مجھے گھر سے نہیں نکالا... تم نے بیوفائی نہیں کی.... میں نے آخری بار اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا... گلنار اب بھی وقت ہے اپنے ارادے سے باز آجاؤ..... خدا کے لیے کلا پھٹ نہ جاؤ... صاحب خان کی محبت سے میرا جذبہ زیادہ دیرپا ہوگا..... وہ چپکے سے اٹھ کر برقع کی ڈوریں باندھنے لگی.... پھر بڑی دیر بعد بولی.... دعا کرنا میں واپس نہ لوٹوں۔ صاحب خان مجھے اپنے گھر میں اپنی پہلی بیوی کے قدموں میں بٹھائے رکھے...."

"صاحب خان کی پہلی بیوی کوئی اور... ہے؟..."

"غیر ضروری باتیں نہ کرو..... مجھے یاد کرنے دو... ایک ایک لمحہ ایک ایک لفظ اس سے بچھڑنے کا ایک ایک ثانیہ... وہ کتنی دبلی ہو گئی تھی... جیسے ٹائیفائڈ کے مرض سے اٹھی ہو... بغیر لپ سٹک کے ہونٹ.... بغیر سرمہ کے آنکھیں... چلتے ہوئے اس نے پھر مجھ سے کہا۔ غازی! تمہیں معلوم ہے نا میں تمہیں دغا نہیں دے رہی..... میں نے سر جھکا لیا... میں تم سے بے وفائی نہیں کر رہی.... صاحب خان اگر مجھے چھوڑ دے گا.... تو... میں برداشت کر لوں گی..... لیکن اگر..... اگر شادی کے بعد تم نے مجھے چھوڑ دیا تو.... تو غازی!!... کچھ تو ایسا میرے پاس رہنے دو جو ٹوٹا ہوا نہ ہو...."

"چلی گئی.... گلنار..... بالآخر...."

غازی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے سرسوں رنگ چہرے سے کافور کی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

موصل کہ یہ شہر نہایت قدیم اور دریائے دجلہ پر واقع ہے اور بغداد سے جو دارالسلطنت خلفائے عباسیہ تھا دکھن کی جانب تھوڑی مسافت پر ہے۔ یہاں ایک تاجر رومی مع زن و فرزند بقصدِ تجارت و زیارت خانۂ کعبہ اپنے شہر سے روانہ ہوا جب موصل میں پہنچا تو ایک مرد پیر سے جو عالم بے بدل اور زاہد بے مثل مشہور تھا ملاقی ہوا۔ جس کی صورت سے پرہیزگاری ظاہر تھی۔ سرخ چہرہ مانند زعفران کے زرد لب پر آہ زبان پہ فغان، ہر طرح اثبات درد تھا۔ زہد و تقویٰ اس درجہ کو تھا کہ برصیصا اس کے آگے گرد تھا طاعت میں یکتائے عصر تھا۔ عبادت ظاہری میں وحید دہر تھا۔ علوم دنیا میں دستگاہ کامل تھی۔ الٰہیات و دینیات میں تحصیل حاصل تھی۔ معنی و منطق کو مثل ابجد پڑھاتا۔ حکمت افلاطون کو بھی اگر بتا سکھاتا۔ بو علی سینا بھی خود اپنی حقیقت کو اس سے چھپاتا۔ اور کبھی قانون اس کے سامنے پیش نہ کرتا۔ تاجرِ رومی ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہا۔ دل و جان سے اس کا معتقد ہو گیا۔

اتفاقاً درد گردہ تاجر کو عارض ہوا۔ امیدِ زندگی سے مایوس ہو کر سخت گھبرایا کہ اس غربت میں جہاں کوئی یار و مددگار، مونس و غم خوار نہیں۔ اپنے اہل و عیال کو کس کے سپرد کر کے بنا بر حفاظتِ مال و دولت کے وصی مقرر کرے۔ اس اندیشے میں خیال خام بوجہ عقیدت تام یہ آیا کہ زاہد سے بہتر اس کام کے واسطے کوئی نہ ہوگا۔ مرد خدا ہے۔

دنیا سے نافر و بے واسطہ ہے۔ اس واسطے زاہد کو بلوایا اور حرفِ مطلب سنایا۔
اور عرض کی کہ جب میری روح تنِ خاکی سے مفارقت کرے۔ تجہیز و تکفین سے فراغت کے
زر و مال کو میرے شمار کیجے۔ اور چار حصے اس کے فرما کے ہر ایک کو براہِ خدا، اہلِ احتیاج
کو دیجیے۔ دوسرے کو آپ قبول فرمایئے۔ اور دو حصے باقیماندہ سے ایک حصہ صرف
تعلیم میری اولاد کا کیجیے۔ اور چوتھے حصے کو محفوظ رکھیے اور بلوغ پر ہر چہار لڑکوں پر
تقسیم فرمایئے۔

جس شب کو تاجر نے ملک بقا کا راستہ لیا بعد تجہیز و تکفین زاہدِ خشک
سال نے شمار مال و دولت کا کیا تو آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اور زہد اس کا سانپ کی کینچلی
بن کر جسم سے جھڑ گیا۔ اب دل میں ٹھانی کہ زنِ تاجر کو عقد میں لایئے۔ اور دخترِ تاجر
کو اپنے فرزند سے منسوب کیجے۔ اور لڑکوں کو جن سے کسی طرح کا مفر نہیں اگلی منزل
میں ٹھکانے لگایئے۔

موصل کے زاہد نے کیونکر دولت ہتھیالی اور اس دولت کو ہتھیانے کے بعد وہ
کس طرح موصل کے قاضی کے پاس پہنچا یہ ایک مختلف داستان ہے۔

جس وقت رشو جان ملک صاحب کے ساتھ جائنٹ اکاؤنٹ کھول کر بنک
کی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل جائنٹ اکاؤنٹ کیا ہوتا ہے؟ وہ
تو تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ اس جائنٹ اکاؤنٹ میں ملک صاحب نے کتنی رقم جمع کی ہے؟
اسے تو بس اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ اس کے پرس میں پچیس چیکوں والی ایک چیک

بک ہے۔ اب تک اس نے منی آرڈروں پر دستخط کئے تھے۔ آج بنک کے مینجر نے اس سے جابجا دستخط کروائے تھے۔ ان دستخطوں کو کرتے وقت اس کے جی میں انجانی سی خوشی تھی۔

ملک صاحب کتنے اچھے ہیں!

ملک صاحب اپنے بیٹے کی خاطر مجھ سے کتنی مروّت برتتے ہیں!

ملک صاحب تو اباجی ہی کا دوسرا روپ ہیں!

بنک کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ملک صاحب نے پہلی بار کہا۔

"میں نے آپ کے اکاؤنٹ میں پانچ ہزار روپیہ جمع کروا دیا ہے۔"

"پانچ ہزار؟"

اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

"یہ ... یہ رقم آپ کی نہیں فقط آپ کے تصرّف میں ہے۔"

"جی میں سمجھی نہیں ..."

"دیکھیے رشّو! بات صرف اتنی ہے کہ میں نے یہ اکاؤنٹ محض اس لئے کھلوایا ہے کہ وقت بے وقت بہاولپور سے رقم نہیں پہنچ سکتی۔ آپ کو اپنا تمام تر وقت پڑھائی پر صرف کرنا چاہیئے۔ آپ کو یہ فکر نہیں ہونا چاہیے کہ ... کہ .. روپے کہاں سے آتے ہیں؟ فیس کہاں سے دی جائے گی؟ آپ کو تو ... فقط اپنے مطالعہ سے غرض رکھنی چاہیے۔"

”جی وہ تو میں ۔۔۔ میں باقاعدگی سے پڑھتی ہوں ۔۔۔“

”پڑھائی تو آپ یقیناً کرتی ہیں۔ لیکن میرا مطلب ہے کہ آپ گھر سے دور ہیں۔ یہاں ایک دوست کے ہاں آپ کا قیام ہے۔“

”ڈمپل بہت اچھی ہے جی ۔۔۔“

اچھی یا بری کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ۔۔ آپ کو ان کا احسان اس قدر نہ اٹھا لینا چاہیے کہ ۔۔۔۔ بعد میں وہ آپ پر کسی قسم کی دھونس جما سکیں ۔۔۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں جی ۔۔۔“

”میرا مطلب ہے کہ آپ کو وہاں ایک پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہنا چاہیے لاہور ایک مصروف شہر ہے، مہنگا شہر ہے۔ یہاں کوئی کسی کے اخراجات برداشت کر کے خوش نہیں رہ سکتا ۔۔۔“

”ڈمپل ۔۔۔ ڈمپل ایسی نہیں ہے۔“ رشنو نے لب کاٹ کر کہا۔

”ڈمپل زیرِ بحث نہیں ہے رشنو! میرا مطلب ہے کہ آپ آسانی سے ان کی مدد کر سکتی ہیں۔ اس رقم میں سے ۔۔۔۔ اور جب آپ ان کی مدد کرنے کی اہل ہیں تو پھر مفت ان کے گھر رہنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں ماہ بماہ ڈمپل کو کچھ ۔۔۔۔“

”ہاں کیوں نہیں تین سو چار سو ۔۔۔۔ جس قدر بھی آپ چاہیں۔ آخر امتحانوں میں دیر ہی کونسی ہے؟ ۔۔۔۔ چند ماہ کی تو بات ہے۔“

تین سے چار سو روپیہ ماہوار!

اسے تو کل سوا سو روپیہ اماں بھیجتی تھیں بہاولپور سے۔ ایکبار تو جیٹ طیارے کی سی تیزی سے ساری زمین اس کے پیروں تلے سے نکل گئی۔ پھر خیال آیا جو کہیں ملک صاحب سے پہلے ملاقات ہو جاتی تو میں خالہ کے گھر سے کیوں نکلتی؟ خالہ جان کو تین چار سو روپیہ ماہوار دیتی اور دھونس سے رہتی۔ ڈمپل کے گھر میں اسے کوئی تکلیف نہ تھی لیکن پچھلے کچھ دنوں سے وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ڈمپل کے اباجی اسے کھردری نظروں سے دیکھا کرتے ہیں۔ جب کبھی وہ اکٹھا کھانا کھاتے، تو ان کی نظریں رشّو کی پلیٹ پر جمی رہتیں۔ جتنی مرتبہ وہ سالن کے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔ اتنی مرتبہ اس کے اباجی ہولے سے کھانستے۔ جب وہ چھابے میں سے روٹی اٹھاتی اباجی کا اپنا نوالہ جہاں بھی ہوتا لمحہ بھر کے لئے رُک جاتا۔

رشّو جان کو ڈمپل کے گھر رہ کر بہاولپور کی حویلی کا سا آرام ملا تھا لیکن ملک صاحب کے ساتھ جائنٹ اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد رشّو کی انا بہت اونچی ہو چکی تھی...

ایک معزّز شہری کی طرح وہ اپنی ساکھ کے لئے یکدم بہت متفکّر ہو گئی تھی...

"آپ کیا سوچ رہی ہیں رشّو؟"

"کچھ نہیں جی..."

"پھر بھی؟"

"یہی سوچ رہی تھی جی کہ... کہ... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"دیکھوناں رشّو! تمہاری ان سے کوئی رشتہ داری تو ہے نہیں۔ وہ منہ سے کہیں یا نہ کہیں لیکن بوجھ ضرور محسوس کرتے ہوں گے تمہارا۔ ویسے لاہور میں تو رشتہ دار چھوڑ اپنے بچّوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔"

اپنے بچّوں کا بوجھ؟ رشّو نے سر جھکا کر سوچا... "ہائے اللہ! کیسا شہر ہے؟ جہاں اپنے بچّوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے"

سیاہ کار مین روڈ کی طرف جا رہی تھی... رشّو کے پرس میں پچیس چیکوں والی چیک بک تھی جس کے ہر چیک کو وہ اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کر سکتی تھی۔

ملک صاحب نے سگریٹ بجھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اچانک ان کا ہاتھ رشّو کے گھٹنے سے مَس کر گیا۔ پھر انہوں نے بڑی ندامت سے معافی مانگی تو رشو نے فراخدلی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جی کوئی بات نہیں"

افسوس ملک صاحب کے کندھے پر کوئی ہاتھ نہ تھا ورنہ وہ ضرور رشّو کے ہاتھ کو تھپکتا!

اتنے سارے تحفے جو ملک صاحب وقتاً فوقتاً اس کے لئے لاتے رہے تھے انہوں رشّو کو احسان مند ضرور کیا تھا۔ لیکن وہ اسے ملک صاحب کے قریب لانے سے قاصر رہے تھے۔ وہ انہیں ظفر کا باپ سمجھتی تھی۔ اور بطور بہو بیگم کے ان کی سعادت مندی اور فرمانبرداری کرتی تھی۔ بنک میں اکاؤنٹ

کھلوانے کے بعد بنک سے گھر تک پہنچتے ہوئے پہلی بار اس نے ملک صاحب کے وجود پر بھرپور نظر ڈالی ۔ ۔ ۔ ان کے اثاثے کا اندازہ لگایا ۔ ان آساٸشوں کا پڑتا لگایا جو ان کے ساتھ مستقل طور پر رہنے میں حاصل ہو سکتی تھیں ۔ پھر جی ہی جی میں وہ ان کے معمّر وجود ، دراز قد قائداعظم جیسی شخصیت سے متاثر ہوتی پہلی بار اس نے دل ہی دل میں باپ بیٹے کا موازنہ اس طرح کیا جیسے گنگا اور سندھ کے میدان کا مقابلہ جغرافیے کی کلاس میں کیا جاتا ہے ۔

اس تجزیئے کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ جب کار کا دروازہ پکڑ کر ملک صاحب نے اسے اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو رشّو مزاحم نہ ہوئی بلکہ سفید دستانے میں ملفوف ہاتھ ملک صاحب کے پھریلے ہاتھ میں تھما دیا ۔

دونوں ہاتھوں میں ننھّی سی غلط فہمی ، چھوٹا سا معاہدہ ۔ ذرا سا احساسِ رفاقت پیدا ہوا جو ملک صاحب کے لئے بڑی گہری تسکین کا باعث ہوا ۔ اور جس نے رشّو کو پہلے متحیّر کیا اور بعد میں سوچنے پر مجبور کر دیا ۔

”میں کل آؤں گا ۔ ۔ ۔ ۔ شام کو ۔ ۔ ۔ “

”جی ۔“

”تب تک ۔ ۔ ۔ خدا حافظ ۔ ۔ “

”جی ۔ ۔ ۔ خدا حافظ ۔ ۔ ۔ “

کہاں تو ڈمپل کے آباجی رشّو کے نوالے گنتے تھے اور کہاں تین سو

روپیہ ملتے ہی رشّو کے لئے ناشتہ پر انڈے پراٹھے پکنے لگنے۔ اوپر والے حصّے کا
کل کرایہ ڈھائی سو روپے تھا۔ اس کرائے پر سارے گھر کی گذر بسر ہوتی تھی۔
ڈمپل اپنے اخراجات کی خود کفیل تھی۔ اور اس کے اخراجات اللہ خود پورے کرتا تھا۔
پورے تین سو روپے ڈمپل کے ابّا کو کیا مل گئے۔ انہیں تو رشّو جان پوری شہزادی
نظر آنے لگی۔

پہلے تو رشّو جان کو ان لوگوں کی خدمت گذاریوں پر تعجب ہوا۔ تھوڑی دیر کے
بعد وہ ان مراعات کی عادی ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ ہر جگہ اس بات کی متوقع
رہنے لگی کہ لوگ اٹھ کر اسے پانی پلائیں۔ اس کے لئے کرسی لائیں، اس کا گرا ہوا
رومال پکڑ دیں، بھاگ کر اس کے لیے ٹیکسی لائیں ...... خدمت کرنے سے
زیادہ خدمت کروانے میں لطف ملنے لگا... زندگی میں ایک بانکپن پیدا ہو گیا
خود اعتمادی کا جذبہ، خود ستائی کی خواہش، خود پسندی کی عادت رفتہ رفتہ جڑ پکڑنے
لگی......

کہاں تو ملک صاحب کی سیاہ گاڑی پھاٹک پر آ کر لگتی تھی تو گھر پر ابّا جی
سوں سوں کرتے تھے۔ اب ملک صاحب کی گاڑی دیکھ کر گھر والے پذیرائی کو
دوڑتے... ملک صاحب کو گھر کا خاص فرد سمجھ کر سونے والے کمرے میں
بلا لیا جاتا.. پاس کے کھوکھے سے کوکا کولا کی بوتلیں آتیں، لڑکیاں پڑھتی
رہتیں اور ملک صاحب اور ڈمپل کے ابّا جی پاس بیٹھ کر شطرنج کھیلتے رہتے۔

سب کچھ کتنا معصوم تھا! کس قدر گھریلو پن تھا ساری فضا میں!.... صرف ایک ٹائم بم چھپا ہوا تھا اِس مخملیں فضا میں.... اور یہ مخملیں ٹائم بم اس روز پھٹا، جس روز ڈمپل اوپر کرائے داروں سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ اباجی برانڈرتھ روڈ سے نہ لوٹے تھے۔ اور ڈمپل کی چھوٹی بہنیں سکول کی گرل گائیڈز کے ساتھ کسی ریلی پر گئی ہوئی تھیں۔

رشو کو اس دن ہلکا سا زکام تھا۔ اور وہ کاپیاں کتابیں لیے نائیلون کا ہلکا گلابی نائٹ سوٹ پہنے بالوں سے کرڈ لگاتے پلنگ سے پشت لگائے بیٹھی تھی۔ ملک صاحب بغیر دستک دیئے داخل ہوئے تو غیر شعوری طور پر وہ اکٹھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اس کی نگاہیں کمرے میں ادھر ادھر کسی دوپٹے کو تلاش کرنے لگیں، ملک صاحب نے اس کی طرف توجہ دیئے بغیر کرسی گھسیٹی، اور اس پر بیٹھ کر اپنا سر ہاتھوں میں لے لیا۔

رشو نے بستر کی چادر کو کندھوں تک اوپر کرتے ہوئے سلام کیا لیکن ملک صاحب نے اس سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔

"گھر والے کہاں ہیں...؟"

"ڈمپل کے ابا تو ابھی آئے نہیں اور ڈمپل اوپر گئی ہے مسز سیّد کے پاس۔"

"اور لڑکیاں؟"

"وہ بھی گھر پہ نہیں ہیں... گرل گائیڈ ریلی پر گئی ہیں والٹن...؟"

"شکر الحمد للہ!..." ملک صاحب نے لمبی سانس لی۔ اور پھر کرسی کی پشت رشّو کی جانب کر کے بولے۔

"جو کچھ اب میں تم سے کہنے والا ہوں اس کا جواب چاہے تم کچھ بھی دو... لیکن جب تک میں بات کروں درمیان میں مت بولنا..."

رشّو نے مری سی آواز میں جی کہا۔

ملک صاحب کی پیٹھ رشّو کی طرف تھی۔ گردن سے سر تک جاتے ہوتے بالوں میں سیاہی سے زیادہ سفیدی تھی۔ لیکن کمر مضبوط اور سیدھی تھی۔ کانوں کے پیچھے ہلکی ہلکی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ لیکن لوتیں بہت سرخ اور تازہ تھیں۔ رشّو نے ملک صاحب کی گردن پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ اور چپکے سے سننے میں مشغول ہو گئی.... وہ جانتی تھی کہ اب اس لمحے.... اسے کوئی بہت اہم فیصلہ کرنا ہو گا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن یہ جسارت اس لئے ہے کہ میں اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ تم دراصل ظفر کی امانت نہیں ہو۔ اگر تمہیں ظفر سے محبّت ہوتی۔ اگر تمہیں ظفر میں تھوڑی سی بھی دلچسپی ہوتی تو تم کبھی اس کے خطے گر مجھ تک نہ پہنچتیں۔ دراصل تم نے ایک طرح مجھ سے ظفر کے خلاف پناہ مانگی تھی۔ ظفر کی محبّت چونکہ یک طرفہ تھی اس لئے میں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ.... کہ اگر میں تم سے اظہارِ محبّت کروں تو یہ ظفر

کی حق تلفی نہیں ہے۔ ظفر تمہاری زندگی کا سائبان نہیں . . . فقط ایک ایسی ٹوٹی ہوئی دیوار ہے جو ہمیشہ ہمسایوں کے درمیان وجہ نزاع ہوا کرتی ہے۔"

ملک صاحب بولتے جا رہے تھے۔ جسقدر علم کا خزینہ ان کے پاس موجود تھا استعمال میں لا رہے تھے۔ منطق کا جو بھی اسلحہ ان کے پاس برسوں سے سٹور تھا داغ رہے تھے۔

اور رشو جان آہستہ آہستہ سوچ رہی تھی . . .

اتنی جلدی . . . . یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ؟

ابھی کل کی تو بات ہے کہ میں بہاولپور سے آئی تھی . . . فقط فتح ایر اور شکستہ ایر کے لفظ کا ہیر پھیر ہے۔ اور اتنی بڑی بات بھی ہو گئی . . . .

کیا مجھے ظفر سے محبت تھی ؟

کیا ظفر سے محبت اب اِن حالات میں پنپ سکتی ہے ؟

کیا ملک صاحب اب مجھے اپنی بہو بنانے پر رضامند ہو جائیں گے ؟

اور ملک صاحب کہہ رہے تھے۔

"ظفر کے پاس آپ کو دینے کے لئے جوانی ہے۔ جذبہ ہے۔ لیکن جوانی کا جذبہ کچھ ایسی چیز نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ ظفر کی طبیعت میں طغیانی کی سی کیفیت ہے۔ جب یہ کیفیت جاتی رہتی ہے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ میں ظفر کا باپ ہوں مجھے اس سے کوئی بیر نہیں۔ اگرچہ کہیں آپ کو بھی اس میں دلچسپی

ہوتی تو میں ... میں اپنے منہ پر ہمیشہ کے لیے تالا ڈال لیتا لیکن ... میں جانتا ہوں کہ ... آپ کو اس سے محبّت نہیں اس لیے ... مجھے ... میرا فرض ہے کہ میں آپ سے ظفر کی کوتاہیوں کا ذکر کروں! ..."

ظفر کی کوتاہیاں؟

ظفر کی تو فقط ایک ہی کوتاہی تھی کہ وہ اس سے محبّت کرتا تھا۔ اب جب کہ کالج کی تمام لڑکیوں نے اس سے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ اب بھی ظفر کی نگاہیں اس کی آمد پر اسے خوش آمدید کہنے کو اٹھتی تھیں۔ اور کلاس کے ختم ہونے پر گلے ملنے کو ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ ... ظفر میں تو بس ایک ہی کمی تھی کہ ... کہ ...

"رشّو ... ! میں بچوں کا باپ ہوں۔ جوان لڑکوں کا باپ ہوں۔ میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ لیکن بخدا میری عمر صرف پچّاس برس ہے؛ میری بیوی میری بیوی نہیں اپنے بچّوں کی ماں ہے۔ ہمارے درمیان نہ محبّت کا رشتہ باقی ہے نہ جنس کا ... رشّو! ... رشّو! مجھ پر رحم کرو ... مجھ پر رحم کرو رشّو!"

یکبارگی ملک صاحب کرسی سے اٹھ کر پلنگ کے پاس دو زانو ہو گئے، پھر انہوں نے رشّو کے پلنگ کی پٹّی پر بازو رکھ کر اپنا سر اس پر دھر دیا۔ اور ان کی سسکیوں سے رشّو کا پلنگ بجلی کی لہروں سے بھر گیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں ملک صاحب؟"

سسکیاں اور بلند ہو گئیں۔

"ملک صاحب ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ "

"میں زندگی سے، تنہائی سے تنگ آچکا ہوں ۔ میں روپیہ کمانے والی مشین بن چکا ہوں جسے ہنسنے کا، جسے خوش رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ میری اپنی زندگی پارے کا وہ چھینٹا ہے جو فرش پر گرتے ہی ننھی ننھی مدوّر گولیوں میں بٹ جاتا ہے ۔ میں ۔ ۔ میں کہیں موجود نہیں ۔ ۔ ۔ کہیں نہیں ۔ ۔ ۔ صرف میرے بچے موجود ہیں، میرا گھرانہ موجود ہے ۔ تم مجھے ثابت کر سکتی ہو رشّو ۔ ۔ ۔ تم ان ننھے قطروں کو جمع کر کے پھر میرا وجود تیار کر سکتی ہو ۔ ۔ ۔ اور اگر تم نے انکار کر دیا تو ۔ ۔ ۔ "

سسکیاں اب اس قدر بلند ہو چکی تھیں کہ رشّو کو آگے بڑھ کر ملک صاحب کا سر اٹھانا پڑا۔ تشفّی کا کوئی لفظ ابھی اس کے منہ سے نہ نکلا تھا کہ ملک صاحب نے اپنا سر اس کے زانو پر رکھ دیا۔ ننھے ننھے گرم آنسو پتلون سے رِس کر اس کی پنڈلیوں پر گرنے لگے ۔ ۔ ۔

ملک صاحب کے ساتھ رشّو کا نکاح ایک چھوٹی سی تقریب تھی ۔ ۔ ۔ رشّو کی طرف سے ڈمپل کے آباجی ولی مقرر ہوئے ۔ ملک صاحب نے پچاس ہزار روپیہ کا حق مہر اسی وقت رشّو کو ادا کر کے نکاح پڑھوایا ۔ ۔ ۔ بالکل بندر بندریا کا سا ننگا بوچا نکاح ۔ ۔ ۔ رشّو کے ہاتھوں میں ڈمپل نے کیوٹکس لگائی۔ اسے زرق برق سرخ جوڑا پہنایا ۔ ۔ ۔ اور اسی ملیسن روڈ کے ایک کمرے میں دولہن کو دولہا کے سپرد کر دیا ۔ ۔ ۔

دوسری صبح جب ڈمپل ناشتہ لے کر آئی تو ملک صاحب غسل خانے میں ماؤتھ واش سے غرارے کر رہے تھے۔ رشّو پلنگ پر بیٹھی ایک انگریزی رسالے میں نٹنگ کا نمونہ دیکھ رہی تھی۔ اور فضا میں بالکل خاموشی اور روزمرّہ پن تھا۔

"کہو!"

"کیا کہوں؟" رشّو نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

"رات کیسی گذری؟"

"رات؟"

یکدم رشّو کو وہ دن یاد آگیا جب وہ پہلی بار کالج گئی تھی۔ اس روز پروفیسر اعجاز حسین ایڈ تکیس کومپلکس پر لکچر دے رہے تھے۔۔۔ انہوں نے کلاس میں پرانے عہدنامے کا ایک اقتباس پڑھا تھا کہ

> لوط جب ضغر میں داخل ہوا تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ برسائی۔ اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا۔ اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا۔ اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا۔ ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں۔ اور اس سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ سے اپنی نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی

اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔

"کیوں پھر... کیسی گذری رات؟" ڈمپل نے اس کے لئے توس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

درشنو نے نگاہیں اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"کیسی رات؟"

"یہی پچھلی.... شادی کی پہلی رات..."

وہ ڈمپل کو کیا بتاتی کہ اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی...

ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر اس نے کہا۔

"بہت اچھی... جیسی پہلی رات ہوا کرتی ہے، ویسی اور کیسی..."

لیکن یہ جملہ بولتے ہی جیسے اس کے نیچے لگا ہوا فوم ربڑ کا گدا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا... اور تکئے کے پروں میں خود بخود پھڑپھڑاہٹ پیدا ہو گئی... قفس میں بند طوطے کی پھڑپھڑاہٹ....

بار بار اسے وہ پہلا دن... کالج کا پہلا دن یاد آنے لگا۔ اور ریکارڈ کے ایک ہی گروو میں پھنسی ہوئی سوئی پکارنے لگی...

"پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی...؟"

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ گو یہ نکاح نہایت رازداری سے پڑھا گیا تھا پھر بھی اس کی اطلاع سب سے پہلے ظفر کو ہوئی...

اس روز وہ افتخار، غازی اور رشید کے ساتھ این سکبیسٹر کی فلم "آئی کنفس" دیکھ کر گھر لوٹا تو این سکبیسٹر اس کے ساتھ ہی چلی آئی۔ کمرے کو اندر سے کنڈی لگا کر اس نے این کو اپنے پلنگ پر بیٹھنے کے لئے کہا ... تو این نظریں جھکا کر بولی...

"یہ تمہارا پلنگ ہے، میں اس پر بیٹھ نہیں سکتی ...!"

لمبے کانوں والی این کے بازو چھو کر ظفر نے پوچھا....

"وہ کیوں ؟..."

"کیونکہ میں شادی شدہ عورت ہوں"

فلم کی ہیروئن کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے یکدم ظفر کو محسوس ہوا جیسے "رشو" اور این سکبیسٹر ایک ہی چیز ہے۔ جیسے وہ ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ ایک ہی شکل کی دو لڑکیاں ہیں۔ ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ اس کا سانس زور زور سے پسلیوں سے ٹکرانے لگا... تیسری منزل کی تیسری کھڑکی میں کھڑے ہو کر اسنے پورے تین گھنٹے اپنے اس پاگل پن پر قابو پانا چاہا۔ لیکن اس کمرے کی ہر چیز "رشو" تھی۔ ہر لمحہ این تھا۔ اور وہ لمحہ وہ چیز ہر بار نظر جھکا کر یہی کہتی تھی.... کیونکہ میں شادی شدہ عورت ہوں...

دھوں سے جھگڑتے جب رات کا پچھلا پہر آ گیا تو اسے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز آئی... وہ اپنے آپ سے اس قدر خوفزدہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنی محبت سے اس وقت ایسا پریشان تھا کہ اُس نے آنے والے کا دل

ہی دِل میں استقبال کیا۔ اور دروازے کا پٹ کھول کر آنے والے کی راہ دیکھنے لگا۔۔۔۔

ملک صاحب ٹارچ کی روشنی ریلنگ پر ڈالتے اوپر آئے۔ ظفر کو یوں کھڑا پا کر ٹھٹکے، لمحہ بھر کو ان کا چہرہ سفید ہوا۔ اور پھر انہوں نے بڑی شفقت سے کہا:

"ابھی تک پڑھ رہے ہو۔۔۔"

"نہیں اباجی! ویسے ہی جاگ رہا تھا"

"اچھا؟۔۔۔۔ اب سو جاؤ۔۔۔"

"اچھا جی۔۔۔"

ملک صاحب ٹارچ کا سپنولیا چھوڑتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ظفر کو باپ کی شکل دیکھ کر جیسے قرار سا آگیا۔ سفید بال اور لمبا دراز قد۔۔۔۔ لوہے کی لاٹھ خلوص کا پتلا!۔۔۔ واپس کمرے میں پہنچ کر اس نے جرابیں اتاریں اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔

اسی وقت اسے اپنا باپ لائٹ ہاؤس کی مانند نظر آرہا تھا۔ وہ اس باپ کی زندگی کے متعلق رقّت کے ساتھ سوچنے لگا۔۔۔ بے چارہ آدمی۔۔۔۔۔ بے چارہ تنہا آدمی! ہماری ماں تو ایک میلے میں رہتی ہے۔ یہ لائٹ ہاؤس وسیع و عریض ساحل کے کنارے گھنگھریالی چٹانوں پر روشنی کا ستون بنے وقت گذارتا ہے۔۔۔۔

میرا باپ کتنا تنہا ہے! کتنا اداس ہے!

"میرا باپ !

میرا باپ !

میرا باپ !

اپنے باپ کی عزّت کر !

اپنے باپ کے لرزتے قدم دیکھ !

دیکھ کہ یہ سایہ سورج غروب کے خوف سے لرز رہا ہے۔

دیکھ یہ سایہ شام کی ظلمت سے جھگڑ رہا ہے۔

دیکھ اور سوچ !

یہ سایہ کہیں تیرا اپنا تو نہیں ؟

جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اسی طرح اسے ملک صاحب کے متعلق محبت اور خوف میں لپٹے ہوئے کئی چھوٹے چھوٹے سے فکر رہا کرتے تھے۔ اتنے شفیق باپ سے بھلا وہ اپنی مشکلات کا ذکر کیوں نہیں کر سکتا ؟ . . . وہ آباجی سے جا کر کیوں نہیں کہہ سکتا کہ اب وہ ایک لمحہ اور اپنے اوپر ضبط کی طنابیں کھینچ کر نہیں رکھ سکتا . . . ایسے مشفق باپ کے پاس پہنچ کر تو خود بخود راہیں کھل جائیں گی۔ مسئلے حل ہو جائیں گے . . . .

نائٹ سوٹ پہن کر جب وہ ملک صاحب کے کمرے کے پاس پہنچا تو کمرہ اندر سے مقفل تھا . . . اس نے آہستہ سے دستک دی۔ کمرے میں فقط بیڈ لیمپ

روشن تھا.. اور ملک صاحب لمبے گرم پاجامے اور اونی واسکٹ میں سونے
کی تیاری کر رہے تھے...

"کون ہے؟"

"میں ہوں اباجی۔ ظفر.."

گرم فلالین کے بیڈ روم جوتے، وائیلا کا گرم پاجامہ۔ اور اونی واسکٹ میں
میں ملبوس ملک صاحب نے دروازہ کھولا... ان کے سامنے ظفر کھڑا تھا..
اس کے تن پر لکیروں والا نائٹ سوٹ تھا۔ اور پیر ننگے تھے۔ اس کے باوجود اس
کے چہرے پر پسینے کے آثار تھے..

"کیوں کیا بات ہے؟" ملک صاحب نے پوچھا۔

"میں آپ کے پاس سو جاؤں ابو جی.."

"ہاں ہاں... کیوں نہیں... آؤ... آؤ۔"

باپ بیٹا اتنے برسوں کے بعد جب ایک ہی پلنگ میں لیٹے تو دونوں کو محسوس
ہوا جیسے وہ کسی اجنبی کے ساتھ ایک ہی پلنگ میں جا لیٹے ہیں۔ بیڈ لیمپ میز
پر روشن تھا۔ اور اس کی روشنی بار بار اس پلاٹم بیٹ پر پڑتی تھی۔ جو میز پر کھلا
پڑا تھا۔ بڑی دیر وہ دونوں خاموش رہے پھر ظفر نے کہنی کے بل ہو کر کہا۔

"اباجی۔"

"کیا ہے ظفر؟"

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"رات بہت گذر چکی ہے۔ میں تھک چکا ہوں۔ صبح سہی۔"

"ابھی اسی لمحے، اباجی میں پریشان ہوں۔"

کسی انجلنے خطرے کو سامنے پا کر ملک صاحب نے تپائی سے عینک اٹھائی اور چہرے پر لگالی۔

"میں اپنے وعدے کی پابندی نہیں کر سکتا اباجی۔"

"کیا مطلب؟"

"میں رشتو سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا اباجی.... میں... میں... آپ سمجھتے کیوں نہیں... وہ..."

"میں کیا نہیں سمجھتا؟"

"میں کیا کوئی مرد... بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا اباجی... وہ بدل رہی ہے۔ تیزی سے بدل رہی ہے۔ مجھے اسے روکنا ہے.... وہ.... وہ اگر اسی طرح بدلتی چلی گئی تو ہمارے درمیان اتنے فاصلے اتنے بُعد پیدا ہو جائیں گے.... کہ.... کہ میں... ان فاصلوں کو طے نہیں کر سکوں گا۔"

حجابے کی دبیز خاموشی دونوں پر مسلط ہو گئی۔۔

"اگر آپ مجھے اس وعدہ سے رہا کر دیں تو... تو... میں کم از کم ایک بار۔"

ملک صاحب نے منہ میں سگریٹ لیا اور اسے جلانا بھول گئے...

"میں اس سے ایکبار شادی کی درخواست کرنا چاہتا ہوں .... ایک بار...
میں... میں اس تذبذب میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں پڑھ نہیں سکتا اباجی... میں"

پھر حجاب نے اس کی زبان پکڑ لی۔

"آپ ... آپ کو میں بتانے آیا تھا اباجی .... کہ میں اپنا وعدہ نہیں رکھ سکتا... کوئی طاقت ہر لمحہ ہر وقت مجھے یہ وعدہ توڑنے پر اکساتی رہتی ہے ...
میں اس طاقت کے خلاف زیادہ دیر تک اپنی کمزور ڈھال کا سہارا نہیں لے سکتا۔"

ملک صاحب خاموش تھے۔

"آپ... آپ بتایئے ناں ... جواب دیجئے .... مجھے رہا کیجئے"

بڑی دیر کے بعد .... ایک صدی کے بعد ملک صاحب بولے ...

"اگر میں تمہیں اس وعدہ سے آزاد بھی کر دوں تو بھی تمہیں کچھ فائدہ نہ ہوگا،
ظفر ..."

"میں اپنے فائدے، اپنے نقصان کی پروا نہیں کرتا۔ میں ... میں صرف ایک بار جاننا چاہتا ہوں اباجی کہ .... کہ ... کہ وہ میرے متعلق کیا سوچتی ہے"

دونوں طرف سے مکمل خاموشی پھر عود کر آئی ...

"وہ تمہارے متعلق کچھ نہیں سوچتی ... نہ مثبت نہ منفی .."

ایک ہی تکئے پر دونوں کی کہنیاں ٹکی تھیں۔ ان کی سانسوں کی اس وقت

ایک خوشبو تھی۔ اس قرب کے باوجود دونوں اس وقت قطب شمالی اور قطب جنوبی کی طرح ایک دوسرے سے دور تھے۔

"وہ... وہ مجھ سے اس قدر لاتعلق نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھ سے نفرت کر سکتی ہے لیکن وہ مجھ سے لاتعلق نہیں ہو سکتی... آپاجی..."

ملک صاحب ظفر کو اپنی شادی کی اطلاع نہ دینا چاہتے تھے۔ جس راز داری سے انہوں نے نکاح کیا تھا۔ وہ اس راز داری کو تاحیات قائم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن نہ جانے ظفر کا چہرہ دیکھ کر انہوں نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔

ظفر پانچویں میں پڑھتا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ اور وہ دفتر سے لوٹے تھے۔ ان کے ساتھ وہ سوڈا واٹر کی بوتلیں تھیں جو کسی زمانے میں ربڑ اور کپچے سے بند ہوا کرتی تھیں۔ ظفر، اظہر، منظہر دوڑ کر ان سے لپٹ گئے۔ اور پھوس کی وہ ٹوکری ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ ایک بوتل گرتے ہی کچھ اس طرح ٹوٹی کہ شیشے کی ایک کرچی ابھر کر ظفر کے گال میں اتر گئی۔

ملک صاحب کے دماغ میں اس روز ظفر کا روتا چہرہ کچھ اس طرح مرتسم ہو چکا تھا کہ اس وقت جب ان کی نظر اس پرانے زخم کے نشان پر پڑی تو وہ اپنے ہاتھ کے تمام پتے میز پر رکھنے کو تیار ہو گئے۔

"اب تمہیں رشو کا خیال چھوڑ دینا چاہئے ظفر!"

"کیوں؟... کیوں آپاجی؟"

"کیونکہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔"

"رشو شادی شدہ عورت ہے؟ کس کی بیوی ہے وہ؟ - کس کی بیوی ہے وہ اباجی؟"

ملک صاحب نے ساری سسکیوں کو سینہ کے اندر تھپک کر کہا۔

"میری!"

"آپ کی بیوی؟ .... رشو؟ .... آپ کی بیوی؟"

وہ باپ کے پلنگ میں سے اس طرح نکلا جیسے آگ اور دھوئیں سے بھرے ہوئے مکان سے آتش زیر پا مکین نکلتے ہیں۔ زمین پر نظریں گاڑے، ٹھنڈے فرش سے پیر جمائے ظفر تھر تھر کانپ رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب راجہ سالواہن کے ہاں پورن پیدا ہو گیا۔ اس وقت

پرندے باغوں کی طرف واپس آ رہے تھے۔

نوبتیں بجنے لگیں۔ سارے دربار نے خوشی منائی۔

سب لوگوں نے راجہ سالواہن کو مبارکباد پیش کی۔

لوناں پانی لینے کے لئے نکلی اور کنوئیں پر آئی۔

راجہ پانچوں کپڑے پہنے اور پانچوں ہتھیار سجائے۔

قلعے سے باہر نکلا اور شکار کے لئے روانہ ہوا۔

اے کنوئیں کے اندر آہستہ سے رسّی ڈالنے والی! تیرے بھائی جیتے رہیں۔

ہم پانی کے پیاسے ہیں - ہمیں کٹورہ بھر پانی پلا۔

میں چماروں کی بیٹی ہوں - ہم نیچ ذات لوگ ہیں۔

اے لوناں! کیا تو ڈھول کی مارون ہے؟ یا وہ سیتا ہے جسے رام نے گم کر دیا تھا

بول! کیا تو جنک کی بیٹی ہے؟

راجہ اسے بیاہ کر اپنے شہر کی طرف چلدیا۔

لوناں باندی سے کہنے لگی .... تو جلدی سے شہر میں جا۔

کوئی ایسا آدمی ڈھونڈ کے لا جو مجھ جیسا ہو۔

راجہ سالواہن بوڑھا ہے یہ میرے کام کا نہیں۔

ہیرا باندی وہاں سے چلی اور شہر میں پہنچ گئی۔

اس نے پورن کا چہرہ دیکھا تو غش کھا کر گر پڑی۔

پھر جلدی سے اٹھ کر لوناں کے پاس آئی۔

پورن تجھ سے بھی حسین ہے وہ تیرے لئے موزوں بر ہے۔

وہ تیری سوت کا بیٹا ہے مگر ہے بہت حسین۔

پورن لوناں کے محل میں آیا - رام رام کہا اور ماں کے سامنے سیس نوا دیتے۔

مجھے ماتا نہ کہہ - میں تیری ہم عمر ہوں۔

کمان زوروں پہ ہے اسے کھینچ کر لطف اٹھا۔

جیسے تنور سے شعلہ اٹھتا ہے اور بجھائے نہیں بجھتا - یہی میری حالت ہے۔

اے ماتا کیوں دھرم کی جڑ کاٹتی ہو؟

اگر ماں بیٹے میں ایسے تعلقات ہو جائیں تو دنیا تباہ ہو جائے۔

گناہ کا برتن پھینک دو۔ دھرم کے برتن سے غسل کرو۔

تالابوں کے پاس جوہڑ ہیں۔ قصبوں کے پاس گاؤں۔

بادشاہ کے بغیر عزت نہیں۔ گورو کے بغیر نجات نہیں۔ بیٹوں کے بغیر نام باقی نہیں رہتا۔

پورن بھگوان کو یاد کر کے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

پورن نے چھلانگ لگائی تو اس کا جوتا وہیں رہ گیا۔

سالواہن نے لوناں سے کہا..... میری بات سن۔

میں نے راستے میں بہت بدشگون دیکھے ہیں۔ سخت تیز ہوا چل رہی تھی۔

جھٹپٹے کا وقت تھا جب پورن میرے محل میں داخل ہو گیا۔

میں نے سمجھا آپ ہیں۔ اس لئے سیج بچھا دی۔

شیر کے سامنے بکری تھی۔ جیسے اس کا جی چاہا اس نے کھائی۔

میں گائے کے مکھن پر پلی عورت ہوں۔ میں نے اپنا بدن سنبھال کر رکھا تھا۔

اس نے آپ کے سونے کا ڈھیر لوٹ لیا ہے..... اسے قتل کر دیجیے۔

بیٹا! کل تم نے لوناں کے محل میں جا کر کمائی کی۔

پتاجی! نہ میں نے آگ کی لکڑی کھائی ہے۔ نہ سانپ کا گوشت کھایا ہے۔

چوہڑوں نے نشتروں سے گہرے زخم لگا کر اس کی آنکھیں نکال لیں۔

اچھراں کے محل کا چراغ بجھ گیا۔

وہ بازاروں میں پھرنے لگی۔

ظفر کا وجود پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سارا جسم سُن اور دماغ ماؤف تھا۔ اپنا گھر زندان، ہوائیں دشمن، اور موسم زہر آگیں ہوگیا۔ وہ بیک وقت ظفر تھا بھی اور نہیں بھی۔ وہ سائیکلوجی کا طالب علم تھا اور سائیکلوجی سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ورٹیگو کے مریض کی طرح ساری کائنات اس کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس کے اندر اس کا اپنا وجود لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ وہ لوناں ماتا کے سامنے پورن کی طرح کھڑا تھا۔

ملک صاحب سے شادی کے دسویں دن رشو مسین روڈ سے گلبرگ میں منتقل ہو گئی۔ یہ کوٹھی مین بولے وارڈ پر فوارے سے کچھ ہٹ کر داہنی طرف تھی۔ چار کینال کی اس کوٹھی کا کرایہ سات سو روپے تھا۔ اس کے برآمدے کے ستونوں میں کوٹے کا سنگ مرمر اور غسل خانوں میں بلا سٹک کی ٹائلیں لگی تھیں۔ کوٹھی سڑک سے کسی نودولتے بنک کی عمارت لگتی تھی۔ کوٹھی کے بائیں طرف اونچے اونچے شیشے لگے تھے جیسے ہسپتالوں میں سرجری کا وارڈ ہوا کرتا ہے۔ رشو عموماً یہاں بیٹھ کر سڑک کی جانب دیکھا کرتی تھی۔ اس برآمدہ نما لاونج سے آگے ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں پانچ ہزار کا قالین اور آٹھ دس ہزار کا فرنیچر تھا۔ اس کمرے کو دیکھ کر پیرس یا روم میں پاکستانی سفارت خانے کا خیال آتا تھا۔ ہر چیز قیمتی، نفیس اور ستھرے مذاق کی آئینہ دار تھی۔ ڈرائنگ روم سے ایک زینہ اوپر ماسٹر بیڈ روم

کر جاتا تھا۔ وہ ماسٹر بیڈ روم جس میں ملک صاحب اور رشو جان رہتے تھے۔
باقی تمام کمرے اس سوئمنگ پول کی طرح بے آباد اور آراستہ تھے جس کے مالک تیز نانہ جانتے ہوں۔ اس ماسٹر بیڈ روم میں سفید فرانسیسی فرنیچر تھا۔ سفید ایرانی قالین تھا۔ سفید ساٹن نائیلون کے پردے تھے۔ اور سڑک کی جانب کھلنے والی ایک آئینے کی دیوار تھی۔ جس کے سامنے چیکو سلواکیہ کی بنی ہوئی لیس کے سفید پردے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر لمبے لمبے لوشنوں کی کاسنی زرد بوتلیں اور چاندی میں مڑھے ہوئے کنگھے اور برش تھے۔ یہ کمرہ کھلے سیپ کی طرح روشن اور آبدار موتی کی طرح بے داغ تھا۔
اٹیچ باتھ کا رنگ نوزائیدہ چوزے کی طرح ہلکا زرد تھا۔ ٹائلیں زرد، ٹب زرد، فلش زرد، سنگ زرد . . . . ٹب کے گرداگرد لگا ہوا پلاسٹک کا پردہ زرد رات کے وقت جب ٹب میں گرم پانی بھر کر باتھ سولٹ ڈال کر رشو چھوٹے سے برش سے اپنی پیٹھ صاف کرتی تو یکدم اسے اماں یاد آجاتیں جو بورے کی انگیٹھی پر تیل میں آلو کی بھاجی پکایا کرتی تھیں۔
وہ کالج سے چھٹی پر تھی۔
ملک صاحب اپنے گھر والوں کے لئے کراچی جا چکے تھے۔ نہ رشو نے ابھی اماں کو اطلاع دی تھی۔ اور نہ ہی ملک صاحب نے ابھی گھر پر اپنی شادی کا ذکر کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زیادہ دیر یہ خبر چھپ نہیں سکے گی لیکن جب تک وہ کبوتر کی

طرح آنکھیں بند کئے خطرے سے بچ سکتے تھے تب تک بچنا ان کا فرض تھا۔
اس نئی شادی نے ان کے سارے وجود کو گوبھی کے پتوں کی طرح چوڑائی بخش دی تھی۔ آج تک وہ پیسہ خرچ کرتے وقت ہمیشہ لمحہ بھر کو سوچا کرتے تھے۔ لیکن اب ان کا بنک بیلنس پرنالے کی طرح بہہ رہا تھا اور وہ خوش تھے۔

رشّو چاندی کے برش سے بال بناتی تو وہ پشت پر کھڑے ہو کر آئینے میں اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ رشّو ٹب میں نہاتی تو وہ پلاسٹک کے پردے کے پاس نظریں جھکا کر اس سے باتیں کرتے۔ رشّو سو جاتی تو وہ بیڈ لیمپ جلا کر رشّو کے کندھے دیکھتے۔ اس کی گردن کے سنگِ مرمر پر انگلیاں پھیرتے۔ ابھی انہیں گلمرگ میں آئے چند دن ہوئے تھے کہ ایک رات رشّو بہت جلد سو گئی۔ آدھی رات کو رشّو نے محسوس کیا جیسے کوئی کنکھجورہ اس کی گردن پہ رینگ رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ دیکھا تو بیڈ لیمپ روشن تھی۔ اور ملک صاحب اس کے پاس بیٹھے تھے....

"کیا کر رہے ہیں آپ اس وقت؟"

"میں؟.... کچھ نہیں...!"

"پھر بھی آپ جاگ کیوں رہے ہیں:"

"بس یونہی.... نیند نہیں آتی۔"

"لیکن آپ کر کیا رہے تھے۔"

ملک صاحب جھینپ گئے۔۔۔

"بتایئے ناں کیا کر رہے تھے آپ؟"

"میں تمہاری گردن۔۔۔"

"ہائے اللہ آپ تھے۔ میں سمجھی تھی کنکھجورہ ہے کوئی۔۔۔"

لجاجت سے ملک صاحب بولے۔۔۔

"نہیں میں ہی تھا۔"

"تو پھر سو جایئے اب۔"

"نیند نہیں آتی۔ رشو!"

"کوشش کیجئے۔۔۔"

"بہت کوشش کی ہے۔" لجاجت سے ملک صاحب نے نظریں جھکا کر کہا۔

"آپ۔۔۔ فکر کرتے ہیں۔۔۔"

"کیسا فکر۔"

"اپنے گھر والوں کا خوف ہے آپ کو اور کیسا فکر۔۔"

گھبرا کر ملک صاحب نے دائیں بائیں سر ہلایا۔

"مجھے بھی تو بہاولپور واپس جانا ہے۔ مجھے بھی تو اماں کو کچھ جواب دینا ہوگا۔"

"تم فکر نہ کرو۔۔۔ میں ساتھ چلوں گا تمہارے۔۔۔ ہم۔۔۔ اماں کے پاؤں پڑ جائیں گے۔" ملک صاحب نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو رشو نے جلدی سے

ہاتھ چھڑا کر کہا...

"اچھا سو جائیے اب"

"پتہ نہیں کیا بات ہے نیند نہیں آتی۔"

"تو کوئی سلیپنگ پلز کھا کر سو جائیے۔"

ملک صاحب خاموشی سے اٹھے اور خواب آور گولیاں کھا کر چپ چاپ لیٹ گئے...

ماسین ردوکی اور بات تھی۔ وہاں ڈمپل تھی۔ اس کے ابا جی تھے۔ ڈمپل کی چھوٹی بہنیں تھیں۔ ایک گھریلو ماحول تھا... یہاں ان لوگوں سے کٹ کر آسائش کی گود میں پہنچ کر اس کا محبوب ترین مشغلہ ملک صاحب کو دیکھنا رہ گیا تھا۔ وہ ہنٹر پھڑکاتی اور رشید کرسی پہ بیٹھ جاتا۔ وہ چمڑے کا سانٹا سر پہ گھماتی اور ہاتھی ناچنے لگتا... وہ شوں شوں کرتی اور کتا دونوں ہاتھ اٹھا کر ہڈی مانگنے لگتا۔

آسائش میں بس ایک ہی قباحت ہے کہ پہلے انسان اس کا متمنی ہوتا ہے، پھر اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر اسے اپنا پیدائشی حق سمجھ کر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

...

گھر کی ہر چیز اپنا نیا پن کھو چکی تھی... رشو ان چیزوں کے لیے پیدا ہوئی تھی.... اور وہ دل سے سمجھتی تھی کہ وہ ایسے ہی گھر ایسی ہی آسائشوں کے قابل تھی...

پہلے تو اسے اپنی زندگی نے بے حد متاثر کیا۔ وہ کچھ روز اپنی قسمت پہ نازاں بھی رہی

پہنے مفلر لپیٹے بیٹھی ہے وہ کیا کہنا چاہتی ہے؟'

ظفر کے سارے قیاس غلط نکلے؟ اس کے سارے اندازے بے بنیاد تھے؟ چہرہ شناسی اور عندیے کی کھوج میں وہ سراسر فیل ہو گیا تھا۔

وہ جو رشو نے مجھ سے پن مانگ کر نوٹس لکھے تھے۔ پہلے پن دینے اور اس کے بعد لینے میں جو ان کی آنکھیں اور انگلیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتی تھیں تو کیا وہ ایک حادثہ تھا؟

ہر مرتبہ ظفر اس کی کتاب میں جب اپنا خط رکھتا اور وہ چور نظروں سے اسے دیکھ کر مسکراتی، اس لمحے جب ظفر کا دل بلیوں اچھلنے لگا اس کی کچھ بھی ذمہ داری رشو پر نہ تھی۔۔۔؟

اردو مباحثے کے روز جب وہ ظفر کے عین سامنے والی قطار میں بیٹھی طیبہ اور گلنار کی باتیں کرتی تھی اور اس کا آدھا چہرہ ظفر کی جانب ہو جاتا تھا۔ تب ان کنکھیوں کی باتیں کیا جھوٹ تھیں؟

یہ ضرور ہے کہ رشو نے اس کے خطوں کا جواب نہیں دیا اور کہیں اس سے باتیں کرنے کو نہیں ٹھٹکی لیکن سوئمنگ گالا کے دن جب بیک سٹروک ریس میں ظفر تیرتا ہوا لڑکیوں کی سیٹوں کے پاس پہنچا تو رشو نے سوئی میں دھاگا پرونے والی ریس میں اسی کا ساتھی بننا قبول کیا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ادائیں، ان کہی محبت کی باتیں قلبی تعلق کا چھپا چھپا اظہار۔۔۔ کیا اتنی ساری لگاوٹیں جھوٹ تھیں؟۔۔۔ سب

عادتاً یا مروتاً اس سے حسن سلوک کیا جارہا تھا۔

چاندنی سرنج کی طرح اس کے جسم میں پیوست ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں اُن آنسوؤں کی چبھن تھی جو اس کی پلکوں تک نہ آسکے تھے۔ کھڑکی میں سارے خط اور ٹافیوں کا ڈبہ پڑا تھا۔ محبت کا اظہار، سیپ کے موتی کے بجائے وہ لاش بنا ہوا تھا جسے بجّو قبر سے نکال کر چور لہے میں چھوڑ جائیں۔

کہتے ہیں کہ تین شہزادے کہ ایک ایک سے بڑھ کر گوہرِ نایاب تھا اکٹھے جنگل میں ہڑیال کا شکار کھیلتے تھے۔ پہر دوپہر شکار کھیلا، پھر ستانے کو کنارِ دریا پر آبیٹھے۔ اور کمر سے ترکش کھول کر رکھ دیئے۔ دریں اثنا ایک سوداگر بچہ پریشان حال اور دزدیدہ نگاہ ادھر آیا اور کہنے لگا "صاحبو! تم نے کہیں میرا اونٹ تو ادھر جاتے نہیں دیکھا"۔ پہلا شہزادہ کہ حسن وجوانی میں بے مثل تھا بولا "تیرا اونٹ کانا تھا کیا؟" سوداگر بچہ نے اس کا گریباں کھینچا اور ربیلایا کہ بتا میرا اونٹ تو نے کہاں چھپایا ہے؟ کیونکہ درحقیقت وہ کانا ہی تھا۔ دوسرے شہزادے نے کہ گفتارِ شیریں رکھتا تھا اور فصاحت کے زیوروں سے مجلا تھا۔ ہولے سے پوچھا کہ قاعدہ شائستہ لوگوں کا ہے۔ بتا تو سہی تیرے اونٹ پر کہیں سرکہ تو نہیں لدا ہوا تھا۔ اب تو سوداگر بچہ کو بجتہ یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہی اونٹ کو چرانے والا ہے۔ اب کڑک کر بولا کہ ناہنجار بتا میرا اونٹ کہاں ہے۔ شیریں گفتار نے کہا یہ تو خیر میں نہیں جانتا۔ سوداگر بچہ کہ نہایت اکھڑباز اور رستہ گیر تھا اب

دوسرے شہزادے کے درپے ہوا تو تیسرے شہزادے نے کہ فہم و فراست میں یگانہ وقت تھا آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور پوچھا کہ بول تو سہی تیرے اونٹ کے دم تھی کہ نہیں۔ میرا تو خیال ہے نہیں تھی۔ اب تو بیوپاری نے ماتھا پیٹ لیا اور کہنے لگا کہ "بہتر ہے کہ تم اونٹ کو مع اسباب لوٹا دو ورنہ میں تمہیں قاضی کے پاس لے چلوں گا۔" شہزادے بولے بسم اللہ ہم تو خود قاضی کے پاس جاتے ہیں۔ جب یہ چاروں قاضی کے پاس پہنچے تو سارا ماجرا سوداگر بچے نے اس کے روبرو بیان کیا۔ تینوں شہزادوں نے دعویٰ کیا کہ اس کا شک بے بنیاد ہے اور ہم نے اونٹ کو دیکھا تک نہیں۔ قاضی نے پوچھا تو پھر تم کو اس اونٹ کے متعلق اتنی معلومات کیسے حاصل ہوگئیں؟ بڑے شہزادے نے کہ صاحب حسن تھا جواب دیا کہ اے قاضی مجھے اس امر سے دریافت ہوا کہ اونٹ کانا ہے کہ راستے میں تمام درختوں کے پتے ایک طرف سے چرے تھے۔ جو اونٹ کے دونوں دیدے سلامت ہوتے تو دوسری طرف سے بھی پتے کھاتا۔۔۔

دوسرا شہزادہ کہ جس کے منہ سے دم گفتار پھول جھڑتے تھے گویا ہوا۔ اے قاضی قاعدہ ہے کہ جس جگہ زمین پر سر کہ گرتا ہے۔ وہاں کی زمین اُبل اٹھتی ہے۔ میں نے جا بجا اس حقیقت کا معائنہ کیا اور اسی لئے جانا کہ اونٹ پر سرکہ لدا تھا۔ تیسرا شہزادہ کہ فہم و فراست میں یکتائے زمانہ تھا کہنے لگا اے قاضی راہ میں جا بجا اونٹ کے بیٹھنے کی علامتیں موجود تھیں۔ وہ نشان کہ اونٹ کی دم سے

زمین پر پڑتا ہے کہیں بھی نہ دیکھا۔ اس لئے اندازہ لگایا کہ اونٹ کی دم کٹی ہوئی تھی... سوداگر بچہ یہ سن کر اونٹ کی تلاش میں سرگرداں ہوا۔ اور قاضیٔ شہر ان ذی فہموں کو لے کر گھر چلا کہ جانتا تھا ایسے ذکی لوگ عام انسان نہیں ہوتے

ظفر کے قیافے تمام درست تھے اور پھر بھی وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ اونٹ مع مال و اسباب قیمتی کہاں گیا؟... اسی فکر میں غلطاں وہ صبح تک بیٹھا رہا۔ ارد گرد سگرٹوں کے جلے، ادھ جلے اور بے دردی سے بجھائے گئے سگریٹ پڑے تھے... بہت سالوں کے بعد اس نے پہلی بار صبح کاذب کو دیکھا۔ پہلے شہر کا آسمان کاسنی ہوا، پھر خاکستری اور بعد میں انڈے کی سفیدی کی مانند دودھیا سفید ہو گیا۔ اس کے منہ کا مزہ اس طرح تھا جیسے روزوں میں سحری کھا کر بہت دیر سونے کے بعد جاگا ہو... شہر خاموش تھا اور موذن کی آواز اندھیرے اجالے کو چیرتی آ رہی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سل پر سر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا...

"اے رب العالمین! یہ تیری نگری میں کیا دستور ہے کہ قیافے غلط نکلتے ہیں... ایسا کیوں نہیں کہ تو ہی انصاف کر دیا کرے؟ تو راہ کیوں نہیں سجھا دیتا؟۔ تو آزمائشوں میں کیوں ڈالتا ہے؟ تو سیدھی راہ کیوں نہیں دکھا دیتا؟ تیری اِس نگری میں انصاف کیوں نہیں ہے؟..."

یکدم وہ سارے آنسو جو رات بھر اس کے لاشعور میں اکٹھے ہو رہے تھے سل کی ٹھنڈی لاش پر پڑنے لگے... آہستہ آہستہ تواتر کے ساتھ پہلے وہ

اتنی سی بات پر رشّو یوں بلبلا کر روئی کہ ملک صاحب پریشان ہو گئے۔ لیکن
جب انہوں نے رشّو کو چپ کرانا چاہا تو وہ بپھر کر بولی۔

"مجھے ہاتھ نہ لگائیے خدا کے لئے۔۔۔۔ آپ کے ہاتھ تو کسی منحوس کے ہاتھ
ہیں۔۔۔۔ پرے رکھیئے انہیں۔۔۔ کسی کا خیال نہیں، کسی پر ترس نہیں۔۔۔ بس۔۔۔
اپنا ہی خیال ہے۔"

ملک صاحب کا دل کٹ گیا۔ لیکن وہ زندگی میں اتنا کچھ برداشت کر چکے
تھے کہ خاموشی سے پلنگ پر لیٹ گئے۔ رشّو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر روتی
رہی۔ دو چار بار وہ کھانسے۔ ایک آدھ بار انہوں نے پلٹ کر بھی دیکھا لیکن پھر
چار وٹامن کی گولیاں اور دو سلیپنگ پلز کھا کر وہ خاموشی سے سو رہے۔

پہلے کچھ دیر تو رشّو بڑے جوش سے روتی رہی۔ پھر پلنگ کے پاس آ کر
ملک صاحب کو دیکھنے لگی۔۔۔ ان کی خواب آور گولیوں کی بوجھل نیند سے رشّو کو
اللہ واسطے کا بیر ہو گیا۔

یہی قدر جو قائد اعظم کی طرح مضبوط اور پر اعتماد تھا اب رنجیت سنگھ والی
پنجاب کی طرح اندر سے کانا نکل آیا تھا۔

پہلے ملک صاحب چپ کرانے پر آمادہ تھے تو رشّو نے ان کی ہمدردی
کو ٹھکرا دیا اب وہ سو گئے تھے تو انہیں پتھر دل سمجھ کر وہ اور زور سے رونے
لگی۔۔۔۔

پچھتاوے کی آگ سے بالآخر امّید کا سمندر پیدا ہوا۔

یہ سمندر آگ چاٹتا تھا۔ آگ کھاتا تھا۔ آگ کی جھلسی ہوئی ہوا میں سانس لیتا تھا۔ وہ لمبے دیوان پر شنیل کا تکیہ ڈالے اوندھی لیٹی تھی۔ ہولے ہولے ماضی لوٹ رہا تھا۔ دبے پاؤں سات سمندر پار سے آنے والا دولہا دروازے پر اتنی مدّھم دستک دے رہا تھا جیسے پتنگا کمرے میں آسنے کے لیے پر پھڑپھڑا رہا ہو۔۔۔

ظفر کتنا خوبصورت تھا!

اس کے خطوں میں کیسی حیا تھی کیسی سادگی تھی!

ظفر اسے کلاس میں کیسے دیکھتا تھا!

ظفر نے اس کی تصویریں کھینچی تھیں شالامار میں!

یکدم اس کا دل چاہا کہ وہ واپس کالج جائے اور ایک نظر ظفر کو دیکھے۔۔ دبے پاؤں اس نے ڈریسنگ ٹیبل میں سے اپنا پرانا ٹرنک نکالا۔ اور اپنی کاپیاں کتابیں اکٹھی کرنے لگی۔۔۔۔ ہولے ہولے اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔۔۔۔ ایسے آنسو جو آج تک اس کی آنکھوں میں نہ آئے تھے۔۔۔۔ ایسے آنسو جو موت سے ہم کنار اور محبّت سے بھیگے ہوئے تھے۔

میں سوتی ہوں پر میرا دل جاگتا ہے۔

یہ میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹکھٹاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

میرے لئے دروازہ کھول! میری محبوبہ! میری پیاری!
میری کبوتری! میری پاکیزہ!
کیونکہ میرا سر شبنم سے تر ہے۔
اور میری زلفیں رات کی بوندوں سے بھری ہیں۔
میں تو کپڑے اتار چکی ہوں اب پھر کیسے پہنوں؟
میں تو اپنے پاؤں دھو چکی اب ان کو میلا کیوں کروں؟
میرے محبوب نے اپنا ہاتھ سوراخ سے اندر کیا
اور میرے دل و جگر میں اس کے لئے جنبش ہوئی۔
میں اپنے محبوب کے لئے دروازہ کھولنے کو اٹھی
اور میرے ہاتھوں سے مُر ٹپکا
اور میری انگلیوں سے رقیق مُر ٹپکا۔
اور قفل کے دستوں پر پڑا۔
میں نے اپنے محبوب کے لئے دروازہ کھول دیا۔
لیکن میرا محبوب مڑ کر چلا گیا تھا۔
جب وہ بولا تو میں بے حواس ہو گئی۔
میں نے اسے ڈھونڈا پر نہ پایا۔
میں نے اسے پکارا پر اس نے مجھے کچھ جواب نہ دیا۔

پہرے والے جو شہر میں پھرتے ہیں مجھے ملے۔
انہوں نے مجھے مارا اور گھائل کیا۔
شہر پناہ کے محافظوں نے میری چادر مجھ سے چھین لی۔
اے یروشلم کی بیٹیو!
میں تم کو قسم دیتی ہوں کہ میرا محبوب اگر تمہیں
مل جائے تو اس سے کہہ دینا
کہ میں عشق کی بیمار ہوں۔

سلطنتِ شہر میں ظفر خارش زدہ کتے کی طرح گھوم پھر رہا تھا۔ کبھی غازی کے پاس چلا جاتا کبھی تیسری منزل کی تیسری کھڑکی کے سامنے جا کر جہانگیر کے مقبرے کے دھندلے مینار دیکھنے لگتا۔ وہ کئی بار اپنے باپ کے کمرے میں گیا۔ اور لوٹ آیا کیونکہ وہاں اس کے باپ کی خوشبو تھی۔ اس کے باپ کی کتابیں تو تھیں لیکن اس کے باپ کا وجود نہیں تھا۔

فرخ ہاری ہوئی فوج کے علم کی طرح روندا جا چکا تھا۔ جوں جوں وہ محسوس کرتا کہ رشو اس کی نہیں ہے۔ جوں جوں اس پر یہ حقیقت کھلتی کہ رشو اس وقت اس کے باپ کے ساتھ کراچی کے کسی بڑے ہوٹل میں مقیم ہو گی تو اس کا عشق منہ زور گھوڑے کی طرح بے قابو ہو جاتا۔ پہلے کچھ دن تو اس نے جیسے کلورو فارم کے اثر تلے گذارے پھر رفتہ رفتہ جب اس کے ذہن نے یہ بات

قبول کر لی کہ رشیدہ میر اب رشیدہ ملک ہو چکی ہے تو زلزلے سے گرنے والی عمارت کے ملبے سے اس کا عشق متعفن لاش کی طرح نکلا . . . . مسخ شدہ متعفن اور مکروہ صورت! پہلے تو اس نے اِس عشق کو دبانے، اسے بھسم کرنے کی ترکیبیں سوچیں پھر اپنی زندگی ختم کرنے کے پلان بنائے۔ لیکن یہ عشق تو پرانی بنیادیں رکھتا تھا اتنی جلدی کیسے ختم ہو جاتا۔

وہ کئی راتیں جناح باغ کی روشوں پر ٹہلتا رہا۔ بہار کے دن تھے۔ فضا میں کھلتے کے پھولوں کی مہک تھی۔ تمباکو کے کیاروں کی خوشبو تھی۔ روشوں پر اسی کے پھول کھلے تھے۔ قطعہ در قطعہ گلاب اور تختہ در تختہ ان شعلہ رو پھولوں کی بہار تھی جو خوش رنگ بھی تھے اور معطر بھی . . . . اس باغ نے اس کے عشق کو چھپانے کی بجائے ان پھولوں کی طرح دہکا دیا جو سوکھے درختوں پر جاپانی پھل کی طرح چمکا کرتے ہیں۔ اور جنہیں مالی لوگ "جنگل کی آگ" کہتے ہیں۔

باغ جناح نے اس کے دل کو برف میں لگانے کے بجائے اس میں جنگل کی آگ دہکا دی تھی۔ اور اب صدیوں پرانے چیڑھ کے درخت دیودار کے درخت قرصوں سے لدے ہوئے گوند سے بھرے ہوئے تنے تیور اکر گر رہے تھے . . . . شعلہ ساں جل رہے تھے۔ جتنی دیر وہ دھوپ گھڑی کے پاس بیٹھا رہتا ہرائی برآمدوں والے ہوٹل سے گانوں کی آواز آتی رہتی . . . . لتا آہیں بھرتی۔ اس سے وہ وعدے کرتی جو ایفا کا نقاب الٹ کر جفا میں بدل چکے تھے . . . . اسے

اس دھوپ گھڑی سے بڑا گہرا لگاؤ ہو چکا تھا۔ وہ پہروں اسے دیکھتا۔ سامنے فوارے پر ٹہلتی عورتیں، ان کے تعاقب میں بھاگتے بچے ...... ان کے گرد منڈلاتے مرد بہاں سے نظر آتے تھے۔ وہ گھڑی کے لمحوں کو ان زندگیوں کی کڑی بنا لیتا۔ اور سوچتا رہتا بے ربط باتیں .... دکھ بھری باتیں .... بدھ کی طرح زندگی چھوڑنے کی باتیں ... راسپوٹین کی زندگی سے مستعار لی ہوئی باتیں ...

ایسے ہی ایک دن جب وہ گھڑی کے سفید تھم کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا تو کسی نے اسے آواز دی۔

"ظفر صاحب!"

مڑ کر دیکھا تو ڈمپل مسٹر اور مسز سید کے درمیان کھڑی تھی۔

بچھڑی ہوئی سینٹ، بڑھی ہوئی داڑھی میں وہ مارٹن پور کا پادری دکھائی دیتا تھا۔

"ہائے میں نے تو آپ کو پہچانا ہی نہیں مسٹر ظفر!"

"سلام علیکم"

"آپ کالج نہیں آرہے۔ پروفیسر اعجاز حسین روز پوچھتے ہیں آپ کا اور رشو کا۔"

رشو کا نام سنتے ہی ظفر کے کانوں کی لویں جلنے لگیں۔

گو ڈمپل اچھی طرح جانتی تھی کہ ابھی شہر میں رشو کی شادی کی خبر نہیں پھیلی لیکن ملک صاحب اسے بتا چکے تھے کہ انہوں نے کم از کم ظفر کو ضرور بتا دیا تھا۔

"بس جی ایسے ہی۔"

"یہ مسٹر اور مسز سیّد ہیں۔"

دونوں طرف سے تکلف بھرے سلام ہونے لگے۔

ہلکا سا تعارف ہو چکنے کے بعد چند رسمی جملے اور کہے گئے اور پھر ڈمپل اور مسٹر اور مسز سیّد سڑک کی طرف جانے لگے۔ تھوڑی دیر ظفر ڈمپل کو دیکھتا رہا۔ پھر یک دم پیچھے بھاگا۔ ڈمپل آخری سیڑھی پر مسٹر سیّد کے ساتھ تھی اور مسز سیّد پہلی سیڑھی چڑھ رہی تھیں جب ظفر نے انہیں جا لیا۔

"مس شکیلہ ... پلیز!"

ڈمپل نے مڑکر ظفر کی طرف دیکھا اور پھر مسٹر سیّد سے معذرت مانگتی نیچے اتر آئی ....

"مس شکیلہ !"

"کہیے ؟"

ظفر کے اندر الفاظ مجتمع ہو کر جملہ نہیں بن رہے تھے۔ سب کچھ گڈمڈ تھا۔ تمام سوال سارے جواب ...

"فرمایئے ..."

ظفر نے ایک نظر ڈمپل پر ڈالی اور پھر لب پہ زبان پھیرنے لگا۔

"دیکھئے مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مسٹر ظفر!"

"آپ .... آپ ...."

"آپ رشو کے متعلق پوچھنا چاہتے ہیں ناں؟"

"جی"

"وہ اب مجھے ... اب وہ ہمارے ہاں نہیں رہتیں۔ انہوں نے کوٹھی لے لی ہے گلبرگ میں"

"آپ مجھے ان کا ایڈریس دے سکتی ہیں ..."

ڈمپل یکدم گھبرا گئی۔ ملک صاحب نے تاکید کی تھی کہ کسی کو بھی ان کے گھر کا پتہ نہ دیا جائے۔

"دیکھئے ... میں ان کا پتہ آپ کو نہیں دے سکتی مسٹر ظفر ... ویری سوری ... آئی ایم سوری"

"کراچی سے آ گئی ہیں رشو؟"

"جی؟ ... جی ہاں۔ کبھی کی"

"تو ... تو ایکبار آپ مجھے ان کا پتہ دے دیجئے ... میں دوبارہ انکے پاس نہیں جاؤں گا۔ مجھے مبارکباد دینی ہے انہیں"

چھوٹے چھوٹے موتی ظفر کی آنکھوں میں جمع ہو گئے۔

"اب وہاں جانے کا کیا فائدہ مسٹر ... یو نو ... اب تو فضول ہے آپ کا جانا ... "

"آخری بار ... اور پہلی بار ..."

یک دم رشّو کو محسوس ہوا جیسے زندگی کا واحد سنہری موقع اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ وہ ظفر کے قدموں میں قالین پر بیٹھ کر جلدی جلدی بولنے لگی۔

"میں . . . . میں اپنی غلطی پر پشیمان ہوں . . . میں اپنی . . . . میں اگر تم سے معافی مانگوں تو بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا . . . میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ میرے لئے کوئی امّید نہیں پھر بھی . . . . میں تم سے معافی کی طلبگار ہوں۔"

"جو باب بند ہو چکا ہے اسے مت کھولیئے۔"

رشّو نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے کباب کی انگیٹھی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ظفر نے جلدی سے اپنا ہاتھ علیحدہ کر لیا۔

"خدا حافظ رشّو۔"

رشّو دونوں بانہیں ڈال کر ظفر کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"نہ جاؤ۔ خدا کے لئے نہ جاؤ . . . میں اس دنیا میں تنہا ہوں میرا کوئی نہیں۔ میں تم سے کبھی کچھ نہ چاہوں گی . . . سوائے محبّت کے . . . میں تم سے کچھ نہ مانگوں گی سوائے پیار کے . . . . ظفر . . . . سنو تو . . . . یوں بت بنے مجھے کیا دیکھ رہے ہو . . بولو . . . خدا کے لئے . . . میں تم سے اس محبّت کی بھیک مانگ رہی ہوں جو تم . . . . تم مجھے پہلے ہی دے چکے ہو . . . پہلے ہی . . . سنو . . . . بولو تو . . . کچھ تو کہو۔"

"خدا حافظ . . . ."

"میرے ساتھ ادھر چلو . . . . آؤ . . . ."

"میری ٹانگیں چھوڑ دو رشتو۔"

سسکیوں اور آنسوؤں سے پگھلی ہوئی موم کی تپلی نے اس کی پتلون کے پائنچے کو بوسہ دیا اور علیحدہ ہوگئی۔

چیڑ اور یخی کے بادل جنگل پر برس رہے تھے۔ اور رانگارے کی دہکتی ہوئی آگ بجھی ہوئی لکڑیوں میں بدل رہی تھی۔ سیاہ کوئلوں کی راکھ بن رہی تھی۔

"تم جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"ایک بار میرے شوہر سے نہیں ملو گے۔"

"نہیں۔"

"میں تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔"

"تم بعد میں میری شکایت ان سے کر دینا۔"

"پھر آؤ گے؟"

"نہیں۔"

"یاد رکھنا سنگدلی کا سبق میں نے تم سے سیکھا ہے۔"

"خدا حافظ!"

"ہیروشیما سے کم تباہ حال نہیں ہوں میں ... میرے لیے تمہارے پاس ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں؟"

"خدا حافظ!"

"ظفر! خدا کے لئے!"

"خدا حافظ ...."

"خدا حافظ ...."

دروازہ کھلا اور رات کی تاریکی اسے چاٹ گئی۔ کچھ لمحے رشّو نے اس آہٹ کے سہارے جینا چاہا جو اس کے دِل سے آ رہی تھی ... پھر وہ دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ ملک صاحب سلیپنگ پلز کی نیند سو رہے تھے۔ ان کے نرخرے سے شک شوں کی آواز آ رہی اور وہی نکال رہی تھی۔ چہرے پر ویزلین کی چمک اور سانس میں وٹامنز کی خوشبو .... شنگھائی کے ریشم کا گرے اور سبز لائنوں والا نائٹ سوٹ پہنے وہ بستر پر چاروں شانے چت لیٹے تھے۔ جیسے گندم کے کھیت میں پرندوں کو ڈرانے والا بوّا اوندھے منہ گرا ہو۔

رشّو نے ملک صاحب کے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔

"اٹھّو ..... ! ..... اٹھّو!"

شک شوں کی آواز بند ہو گئی۔

"اٹھّو ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔"

سہما سہما سانس آنے لگا۔

کالر کی پٹی پکڑ کر یکبارگی رشّو نے ملک صاحب کو اٹھانا چاہا تو گرے اور ریشمی

سبز لائنوں والی پٹی جھرجھر سے اس کے ہاتھ میں آ رہی... ریڈی میڈ سوٹ کے تمام بٹن چھناکے سے ٹوٹے اور رشوں کے آنسوؤں کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے....

شہر کی بتیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں...

اور ظفو چلا جا رہا تھا۔ کپل وستو کا کنور.. راجہ گوپی چند چلا جا رہا تھا۔ نالہ ہڈیارہ اور بڈھے دریا کی آبادی اس کے بہت پیچھے رہ گئی تھی... اتنے بڑے شہر میں اتنے گنجان آباد شہر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی.... وہ ہجرت کر رہا تھا۔ کفار کی بستی چھوڑ رہا تھا۔ جہاں کے مظالم سے اس کی چھاتی چھلنی ہو گئی تھی۔ شہر کی بتیاں دور تک اسے چھوڑنے آئیں۔ اور پھر سہیں لوٹ کر لوٹ گئیں۔ شہر کے شور نے دیر تک اس کا تعاقب کیا۔ اور پھر کنوئیں کے پانی کی طرح دور رہ گیا.... وہ اس شہر کی ایک ہی سوغات ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس کا اس شہر سے ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا تھا.... بے وفا محبوبہ اور سوتیلی ماں کا رشتہ....

بتیاں دور رہ گئی تھیں۔

آوازیں ڈوب گئی تھیں۔

اور وہ چلا جا رہا تھا..... آہستہ آہستہ.... خشک زمین میں بنجر آنسو بوتا...

دکھی مغل بچے نے کہا:

اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا

بے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اس پر راضی ہوں لیکن آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں۔۔ میری آرزو ہے کہ اب زندہ نہ رہوں اور اگر رہوں تو کم از کم اس ملک میں نہ رہوں۔۔۔

. . . .

روٹری آفسٹ مشین کا سلنڈر بڑی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اور اخبار کا پہلا اور آخری صفحہ چھاپ چھاپ کر سامنے سٹک کے جنگلے میں پھینک رہا تھا۔۔۔

(نمائندہ خصوصی)

گلبرگ کی پر رونق اور باوقار آبادی میں کل رات لاہور کے لکھ پتی تاجر ملک بختیار علی اپنے کرائے کی کوٹھی میں قتل کر دیئے گئے۔ یہ بنگلہ سفیدے والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ اس کے چاروں کونوں پر سفیدے کے فلک بوس درخت ایستادہ ہیں۔ مبیّنہ اطلاع کے مطابق ملک بختیار نے تقریباً ایک ماہ پیشتر بہاولپور کی طالبہ سے خفیہ طور پر شادی کی تھی اور اپنے گھر والوں سے چوری دونوں میاں بیوی اس کوٹھی میں بڑی پراسرار زندگی بسر کر رہے تھے۔۔۔ کل صبح جب ان کا خانساماں ناشتے کی ٹرالی دھکیل کر اندر لے گیا تو ملک صاحب خون میں لت پت اپنے بستر پر مردہ پڑے تھے اور ان کے پہلو میں ان کی نوجوان بیوی نیم برہنہ حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔۔۔

ان کی بیوی مسنز رشیدہ ملک کے کہنے پر ملازم نے پولیس چوکی میں اس
وقوعہ کی اطلاع کی اور مسنز رشیدہ ملک اس وقت تک اپنے مردہ خاوند کے
ساتھ بستر پر لیٹی رہیں جب تک پولیس جائے واردات پر پہنچ نہیں گئی
ملک صاحب کی نعش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی ہے ۔ اور پولیس
ملک صاحب کے نجی ملازموں ، ان کے گھر والوں اور ان کی نوبیاہتا
بیوی سے پوچھ گچھ کر رہی ہے ۔

تفصیلات کا انتظار ہے۔